

مجموعہ شریفیہ حضرت مولانا شریف علی تھانویؒ
کے جملہ خطبات و مخطوطات اور تقریریں جملہ تصانیف
سے منتخب ہو کر اردو الہامی تفسیری نکات

شرف المآثر

تقدیم و کاوش

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

نظر ثانی

جام ربانی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

ناشر

ادارہ تالیفات شریفیہ

چوک نوارہ ملتان پاکستان

519240-540513-061

حکیم الامت دارالملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کے جملہ خطبات ملفوظات اور تقریباً جملہ تصانیف

سے منتخب سٹینکٹروں الہامی تفسیری نکات

اشرف التفسیر (جلد ۲)

جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

سورۃ الزخرف - تا - سورۃ الناس

تقدیم و کاوش

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

نظر ثانی

علم ربانی حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مرتبین

صوفی محمد اقبال قریشی صاحب

ابو حذیفہ محمد اسحاق ملتانی

ادارۃ تالیفات اشرفیہ

بھگت فوارہ نمٹان پکڑتھان فون: 540513-519240

Email: Taleefat@mul.wol.net.pk

نام کتاب..... اشرف التفاسیر (جلد-۴)
تاریخ اشاعت..... صفر الفظفر ۱۴۲۵ھ
ناشر..... ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
طباعت..... سلامت اقبال پریس ملتان

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ
کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
دارالاشاعت اردو بازار کراچی
بک لینڈ اردو بازار لاہور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTRE)
119-121-HALLIWELL ROAD
BOLTON BL13NE. (U.K.)

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

اشرف التفاسیر

کا جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

الحمد للہ ”اشرف التفاسیر“ بہت مقبول ہوئی، اہل علم نے خاص طور پر اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جزا، ہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ حضرت صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ نے حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ملفوظات میں سے مزید بہت سارے تفسیری نکات جمع کر کے ہمیں ارسال فرمائے ہیں جو اس ایڈیشن میں شامل کتاب کر دیئے گئے۔

اس مبارک اضافہ کے علاوہ خود حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا عربی رسالہ ”سبق الغایات فی نسق الآیات“ بھی سورتوں کی ترتیب کے مطابق آخر میں لگایا گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ اضافہ جات تمام علم دوست حضرات کے لئے مزید علمی و عملی برکتوں کا باعث ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

مَنْ يَنْجُبْ عِلْمِي
يُنْجِبْ عَذَابِي
وَأَنْتَ يَا مَنْ
يُنْجِبُ عَذَابِي
يُنْجِبُ عِلْمِي

ع ١٣٧١ ع

اجمالي فهرست

٢٣٧	سورة نوح	٢٤	سورة الزخرف
٢٤٠	سورة المزمل	٢٨	سورة الدخان
٢٥٢	سورة القيامة	٣١	سورة الجاثية
٢٦٠	سورة المرسلات	٤٢	سورة الاحقاف
٢٦٢	سورة عبس	٤٦	سورة محمد
٢٦٧	سورة التكويد	٥١	سورة الفتح
٢٦٨	سورة الانفطار	٥٥	سورة المبررات
٢٧٢	سورة المطففين	٦٢	سورة ق
٢٧٥	سورة البروج	٨٦	سورة الذاريات
٢٧٧	سورة الاعلى	٩٠	سورة الطور
٢٩٠	سورة الفاتيه	٩٤	سورة النجم
٢٩٢	سورة الفجر	١٠٤	سورة القمر
٢٩٧	سورة البلد	١١١	سورة الرحمن
٣٠١	سورة الشمس	١٢٢	سورة الواقعة
٣١٠	سورة الليل	١٢٥	سورة الحديد
٣١٢	سورة الضحى	١٣٧	سورة المجادلة
٣٢٢	سورة الانشراح	١٥٢	سورة الحشر
٣٢٥	سورة العلق	١٥٧	سورة الممتحنة
٣٢٨	سورة القدر	١٦٢	سورة الصف
٣٣٠	سورة البينة	١٦٧	سورة الجمعة
٣٣٥	سورة الزلزال	١٧٦	سورة المنافقون
٣٣٩	سورة العصر	١٩٢	سورة التغابن
٣٥١	سورة الكافرون	٢٠٨	سورة الطلاق
٣٥٢	سورة النصر	٢١٤	سورة التمريم
٣٥٨	سورة الفلق	٢٢٢	سورة الملك
٣٦٥	سورة الناس	٢٣٤	سورة الحاقة

فہرست مضامین

۲۴	سُورَةُ الزُّخْرُفِ
۲۴	حق سبحانہ و تعالیٰ کی شفقت عنایت
۲۵	سواری پر مسنونہ دعاء پڑھنے کی حکمت
۲۶	حقانیت اسلام
۲۷	رحمت کا اطلاق نبوت پر بھی ہے
۲۸	سُورَةُ الدُّخَانِ
۲۸	لیلۃ مبارک سے مراد کون سی رات ہے
۲۸	لیلۃ المبارک و لیلۃ القدر
۳۰	علمی فائدہ
۳۱	سُورَةُ الْجَاثِيَةِ
۳۲	اتباع شریعت
۳۳	تفسیر قل هذا سبیلی
۳۴	سبیلی فرمانے کا مطلب
۳۴	معیار اتباع
۳۵	اتباع شریعت
۳۵	حق تعالیٰ کا اتباع

۳۶	اھواء کا مقابلہ دین ہے
۳۷	رضابالدنیا کب مذموم ہے
۳۸	علامات سفر
۳۹	لوازم سفر
۳۹	ضیاء طریق منزل
۴۰	کبریائی صرف حق سبحانہ و تعالیٰ کی شان کے لائق ہے
۴۱	تکبر کا علاج
۴۲	سُورَةُ الْأَحْقَافِ
۴۲	شان نزول
۴۳	تفسیر آیت کی
۴۳	ایمان کے لئے عمل صالح لازم ہے
۴۶	سُورَةُ مُحَمَّدٍ
۴۶	مانعة الخلو کی حقیقت
۴۷	چندہ لینے میں عدم احتیاط
۴۸	غنی کا ترجمہ بے پروا نہیں
۵۱	سُورَةُ الْفَتْحِ
۵۲	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا غلبہ خوف خداوندی
۵۲	آیت برائے تسلی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
۵۳	بشارت فتح
۵۳	عاشقانہ نکتہ
۵۴	طاعت بڑی چیز ہے
۵۴	خط کا جواب

سُورَةُ الْحُجُرَات	
۵۵	ایذا رسول کفر ہے
۵۵	عشاق کی قسمیں
۵۶	موصوف کے حکم کی علت صفت ہوتی ہے
۵۸	مطلق اتحاد محمود نہیں
۵۹	غیبت کی مثال
۶۰	غیبت کی سزا
۶۰	صرف حسنت میں مرتبہ خلق نظر ہونا چاہیے
۶۱	سُورَةُ وَت
۶۲	کمال علم حق سبحانہ و تعالیٰ
۶۲	وساوس غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں ہوگا
۶۳	وسوسہ گناہ نہیں
۶۳	غیر اختیاری وسوسوں سے ڈرنا چاہیے
۶۵	وسولہ کی مثال
۶۶	حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت حسین تھے
۶۶	قرب حق
۶۷	بعث و نشر
۶۹	قرب سے مراد قرب علمی ہے
۷۲	قرب خداوندی کا معنی
۷۲	قرآن پاک میں تدبر کی ضرورت
۷۶	قرآن سے نفع حاصل کرنے کی شرائط
۷۸	لغت اور محاورہ میں فرق
۷۸	

۷۹	لسن کان لہ قلب کا مفہوم
۸۰	قرآن پاک سے مستفیع ہونے کا ایک گر
۸۱	معلومات کی دو قسمیں
۸۱	قلب سلیم
۸۳	الحاصل
۸۳	شان نزول
۸۳	صلوٰۃ معین صبر ہے
۸۶	سُورَةُ الدَّارِيَاتِ
۸۶	رابط
۸۷	جن و انسان کا مقصد تخلیق
۸۸	عبادت و طاعت کا فرق
۸۹	غایت آفرینش
۹۰	سُورَةُ الطُّورِ
۹۰	شرف نسب میں راہ اعتدال
۹۱	نجات کے لئے نسب کافی نہیں
۹۲	حکایت حضرت سید صاحبؑ
۹۲	دولت مقصودہ
۹۳	سُورَةُ التَّجْوِمِ
۹۵	ثبوت معراج جسمانی
۹۵	حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کی معراج عروجی و نزولی
۹۷	شان نزول
۹۸	آیات منجملہ و مشککہ

۹۹	جنین پر اثر
۱۰۰	دینی ضرر ایک خسارہ عظیم ہے
۱۰۰	تقویٰ باطنی عمل ہے
۱۰۰	تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے
۱۰۳	ایصال ثواب کا ثبوت
۱۰۴	سُورَةُ الْقَمَرِ
۱۰۴	علامات قرب قیامت
۱۰۵	استنباط احکام محققین کا کام ہے
۱۰۷	تذکر کے لئے قرآن آسان ہے
۱۰۷	دقائق قرآن و حدیث بلا علوم درسیہ سمجھ نہیں آسکتے
۱۱۰	آیت ولقد یسرنا القرآن پرا یک شبہ اور جواب
۱۱۱	سُورَةُ الرَّحْمٰنِ
۱۱۱	افعال خاص حق سبحانہ و تعالیٰ
۱۱۳	بیان نعم و قہم
۱۱۷	عورتوں کے فضائل
۱۱۸	جنت کی نعمتوں کے مستحق
۱۲۰	تجلیات اسماء الہیہ کا مراقبہ
۱۲۰	کرامت استدراج میں فرق
۱۲۱	حقیقت گناہ
۱۲۲	دو جنتیں
۱۲۳	سُورَةُ الْوَاقِعَةِ
۱۲۳	اصحاب الجنتہ کی دو قسمیں
۱۲۴	السابقون مکرر فرمانے کا سبب

سُورَةُ الْحَدِيدِ

۱۲۵

۱۲۵

قرب حق سبحانہ و تعالیٰ

۱۲۵

مسابقت الی الجنت کا حکم

۱۲۶

شان نزول

۱۲۷

نزول حق کا مفہوم

۱۲۷

ظاہر کا اثر باطن میں پہنچتا ہے

۱۲۷

بکا مامور بہ سے مراد دل کا بکا ہے

۱۲۷

تخویف و انذار

۱۲۸

افعال و احوال قلب پر جوارح کا اثر

۱۲۸

مسئلہ تقدیر کا ثمرہ

۱۳۰

مسئلہ توحید کی تعلیم سے مقصود

۱۳۱

مسئلہ تقدیر کی حکمت

۱۳۱

مصائب میں حکمت خداوندی

۱۳۲

اصلاح اعمال میں تقدیر کا دخل

۱۳۲

حق تعالیٰ میں خفا نہیں

۱۳۲

عقیدہ تقدیر کی حکمت

۱۳۶

نعدار جوتا

۱۳۶

سار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک

سُورَةُ الْمَجَادِلَةِ

۱۳۷

شان نزول

۱۳۱

اصلاح معاشرہ کا ایک ثمرہ

۱۳۱

ہر مطیع مسلمان مقبول ہے

۱۳۳

آنے والوں کی دل جوئی

۱۳۴	احکام مجلس عام
۱۳۶	تکبر کا علاج
۱۳۷	اعمال عوام اور علماء کا فرق
۱۳۸	شریعت اور سائنس
۱۳۹	حال و حال
۱۵۰	اعمال صالحہ کی توفیق پر صدقہ کا حکم
۱۵۱	موذن کی فضیلت
۱۵۱	ایمان کا تقاضا
۱۵۲	سُورَةُ الْحَشْرِ
۱۵۲	اللہ تعالیٰ کو بالکل فراموش کرنے والا کون ہے؟
۱۵۳	حضرت صدیق اکبرؓ کا رتبہ
۱۵۳	ہماری بد حالی کا سبب
۱۵۵	ذکر اللہ مرض نسیان کا علاج ہے
۱۵۶	مقصود نزول آیت
۱۵۷	سُورَةُ الْمُمتَحِنَةِ
۱۵۷	حدود اتفاق
۱۶۰	تبیحات سیدنا قاطمہؓ کا شان وارد
۱۶۲	سُورَةُ الصَّافِّ
۱۶۲	شان نزول
۱۶۲	یہ آیت دعوت و تبلیغ سے متعلق نہیں
۱۶۳	اپنی اصلاح ضرورت میں مقدم ہے

۱۶۳	یہ آیت دعوت کے بارے میں ہے
۱۶۳	شان نزول
۱۶۵	تقریر ثانی
۱۶۷	سُورَةُ الْجُمُعَةِ
۱۶۷	یہود کے دعویٰ حقانیت کا امتحان
۱۶۷	نصاری سے احتجاج
۱۶۹	حرمت بیع جمعہ کی اذان اول سے ہو جاتی ہے
۱۷۰	فضل سے رزق مراد ہے
۱۷۰	اجتماع صالحین کی دو صورتیں
۱۷۱	اردو میں خطبہ پڑھنا جائز نہیں
۱۷۲	عجیب بلاغت
۱۷۳	تمدن اور قیام سلطنت کا بڑا مسئلہ
۱۷۳	انسانی طبیعت
۱۷۴	خطبہ جمعہ ذکر ہے تذکیر نہیں
۱۷۴	اذان اول سے حرمت بیع پر ایک اشکال اور اس کا جواب
۱۷۶	سُورَةُ الْمُنَافِقُونَ
۱۷۶	منافقین کی تشبیہ
۱۷۷	شان نزول
۱۷۸	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری کی پیشکش
۱۷۹	آیت کریمہ کا شان نزول
۱۸۰	منافقین کے دعویٰ مال و عزت کی تردید
۱۸۱	محبوب ترین چیزیں

۱۸۲	حقیقت حب
۱۸۵	مال و جاہ سے متعلق عجیب تفسیری نکتہ
۱۸۶	مال و جاہ کا حکم
۱۸۷	مناط عزت صرف مسلمان کو حاصل ہے
۱۸۷	معصیت کا سبب اکثر مال و اولاد کا تعلق ہوتا ہے
۱۸۸	مال و اولاد کے درجے
۱۸۹	اہل خسارہ
۱۹۰	حب دنیا کا علاج
۱۹۲	سُورَةُ التَّغَابُنِ
۱۹۲	دو چیزیں حضرت حق سے مانع ہیں
۱۹۳	اصلاح کے لئے علاج ضروری ہے توجہ شیخ کافی نہیں
۱۹۵	شان نزول
۱۹۸	ازالہ غم کی ہدایت
۱۹۸	محل مصائب
۱۹۹	آلہ امتحان
۱۹۹	مال و اولاد کے فتنہ کا مفہوم
۲۰۰	اجر عظیم
۲۰۱	تقویٰ کی حقیقت
۲۰۱	اطاعت کی اقسام
۲۰۳	ایضا عفو کا مفہوم
۲۰۴	شکور حلیم کا مفہوم
۲۰۵	طاعات کے دو پہلو
۲۰۵	اولاد کا فتنہ مال سے سخت ہے

۲۰۵	تقویٰ
۲۰۶	تزکیہٴ نفس
۲۰۷	حرص کی قسمیں
۲۰۸	سُورَةُ الطَّلَاقِ
۲۰۸	حق سبحانہ و تعالیٰ کی غایت رحمت
۲۰۸	طلاق کی ایک حد
۲۰۹	حقیقت اسباب رزق
۲۱۰	ذکر کی توجیہ
۲۱۱	الحاصل
۲۱۳	سُورَةُ التَّحْرِيمِ
۲۱۵	إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ كَمَا تَعْلَقُ
۲۱۵	توبہ باقی اعمال پر مقدم ہے
۲۱۶	ازواج مطہرات کی حضورؐ سے از حد محبت تھی
۲۱۷	آیت تخییر
۲۱۸	ازواج مطہرات باقی عورتوں سے افضل ہیں
۲۲۱	ملائکہ کی اطاعت
۲۲۱	حقیقی توبہ
۲۲۳	سُورَةُ الْمُلْكِ
۲۲۳	ستارے آسمان پر مزین ہیں
۲۲۳	عمل علی الحق کے دو طریقے
۲۲۷	خوف میں اعتدال
۲۲۸	تخویف کی دو قسمیں

۲۲۹	بخشون رہم فرمانے میں حکمت
۲۳۰	عجیب ربط آیت
۲۳۰	طریق تحصیل خشیت
۲۳۱	سمع کو مفرد لانے میں نکتہ
۲۳۲	مدرکات قلب کا بیان
۲۳۲	سُورَةُ الْحَاقَّةِ
۲۳۲	ایام خالیہ کی تفسیر
۲۳۵	کھانے پینے کی رعایت
۲۳۷	سُورَةُ نُوحٍ
۲۳۷	حضرت نوح علیہ السلام کی غایت شفقت
۲۳۸	حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا بے رحمی نہیں
۲۴۰	سُورَةُ الْمَزْمَلِ
۲۴۰	تہجد کی مشروعیت قرآن سے اور تراویح کی سنت حدیث سے ثابت ہے
۲۴۱	اہل اللہ کی گستاخی کا انجام
۲۴۱	گلیم پچیدہ کا ثبوت
۲۴۱	انداز مخاطب میں حکمت
۲۴۳	اہمیت تلاوت و نماز
۲۴۵	معمول اہل تصوف
۲۴۶	انقطاع غیر اللہ
۲۴۷	طریق توجہ
۲۴۸	ضرورت وصل و فصل
۲۴۹	ذات حق کی طرف توجہ کا طریقہ

۲۴۹	کامل ذکر کیلئے خلوت ضروری ہے
۲۵۰	اقسام ذکر
۲۵۱	قبض میں حال سلب نہیں ہوتا
۲۵۱	تہجد کیلئے وقت متعین کرنا ضروری نہیں
۲۵۲	تخلیہ مقدم ہے یا تخلیہ
۲۵۳	سُورَةُ الْقِيَامَةِ
۲۵۳	قیامت میں ہر شخص اپنے اعمال پر مطلع ہو جائے گا
۲۵۵	کلام اللہ میں طرز نصیحت ہے طرز تصنیف نہیں
۲۵۵	قرآن کا طرز کلام
۲۵۶	حدیث وحی غیر مکتوب ہے
۲۵۷	کسب دنیا اور حب دنیا
۲۵۷	حب دنیا کا مغموم
۲۶۰	سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ
۲۶۰	کلام پاک میں مکرر آیات کے اعتراض کا عجیب جواب
۲۶۲	سُورَةُ عَبَسَ
۲۶۲	تعلیم اکمل
۲۶۳	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اجتہادی غلطی پر تنبیہ
۲۶۳	عظمت سرکارِ دو عالم ﷺ
۲۶۳	شان نزول
۲۶۵	ضرورت آزادی و اعتدال
۲۶۷	سُورَةُ التَّكْوِيْنِ
۲۶۷	مشیت کی دو قسمیں

۲۶۸	سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ
۲۶۸	کرانا کاتبین کے مقرر ہونے میں حکمت
۲۶۸	علت سے متعلق ہمارا مذہب
۲۶۹	بندوں کے ناز کا سبب
۲۶۹	محبت کا مدار دیکھنے پر نہیں
۲۶۹	کرانا کاتبین صفت ہے
۲۷۱	شرم کا مبنی
۲۷۱	حق تعالیٰ شانہ کا غایت قرب
۲۷۱	اعمال لکھنے کیلئے فرشتوں کے مقرر کرنے کا سبب
۲۷۱	علماء محققین ہی نے مقاصد قرآن کو سمجھا ہے
۲۷۲	آخرت کے دو درجے
۲۷۳	سُورَةُ الْمُطَفِّفِينَ
۲۷۳	دنیا کا کوئی انسان محبت خداوندی سے خالی نہیں
۲۷۳	ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے
۲۷۵	سُورَةُ الْبُرُوجِ
۲۷۵	بروج کی تفسیر
۲۷۵	اختلاف قراءت
۲۷۷	سُورَةُ الْاَعْلَىٰ
۲۷۷	تین اعمال کا بیان
۲۷۸	وسوسہ شیطان کا جواب
۲۷۸	ذکر نماز کا مقدمہ ہے

۲۷۹	برائیوں سے بچنے کا طریق
۲۸۰	اہل علم کی نازک حالت
۲۸۱	فلاح کا طریقہ
۲۸۳	ذکر اللہ اور دنیا
۲۸۳	ایک شبہ کا جواب
۲۸۵	طلب دنیا مذموم نہیں
۲۸۵	حیات آخرت
۲۸۶	دنیوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا
۲۸۸	طالب جاہل اور قانع جاہل
۲۸۹	تخلیہ اور تخلیہ
۲۹۰	سورة الغاشية
۲۹۰	دلائل قدرت
۲۹۲	سورة الفجر
۲۹۲	نیک و بد کی تمیز کا طریقہ
۲۹۳	دو شکایات کا ذکر
۲۹۳	جوارج اور دل کے گناہ
۲۹۳	بلاغت کلام باری تعالیٰ
۲۹۳	گناہوں کی قسمیں
۲۹۵	دوستوں کی ملاقات میں عجیب لذت
۲۹۶	دنیا سے حصہ آخرت لے آنے کی عجیب مثال
۲۹۶	اہل اللہ سے تعلق کی ضرورت

۲۹۷	سُورَةُ الْبَلَدِ
۲۹۷	اہل ذوق کے لئے ایک علمی نکتہ
۲۹۸	علمی اور تاریخی توجیہ
۲۹۹	شرکاتلانا بھی نعمت ہے
۳۰۱	سُورَةُ الشَّمْسِ
۳۰۱	تفسیری نکتہ
۳۰۲	ترکیہ کی فضیلت
۳۰۳	فلاح کا مدار ترکیہ ہے
۳۰۴	دینی ضرر ایک خسارہ عظیم ہے
۳۰۴	تقویٰ باطنی عمل ہے
۳۰۴	تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے
۳۰۵	تقویٰ فعل اختیاری ہے
۳۰۵	اپنے نفس کو پاک کہنے کی ممانعت
۳۰۶	فہم قرآن کے لئے عربیت سے واقفیت ضروری ہے
۳۰۷	بے خبری کوئی عیب نہیں
۳۰۷	انا مومن ان شاء اللہ کہنے میں اختلاف
۳۰۸	اپنے کو دعوے کے طور پر موحد نہ کہو
۳۱۰	سُورَةُ الدَّلِيِّ
۳۱۰	علم اعتبار
۳۱۱	شان صدیق اکبر
۳۱۲	سُورَةُ الضُّحٰی

۳۱۳	ایک شبہ کا جواب
۳۱۴	رسول اکرم ﷺ پر تین خصوصی احسانات کا ذکر
۳۱۵	انقطاع وحی میں حکمت
۳۱۶	غنائے قلب کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے
۳۱۸	انقطاع وحی میں حکمت
۳۱۹	لفظ ضلالت کا مفہوم
۳۲۰	لفظ ضلالت کا استعمال
۳۲۱	سورۃ الضحیٰ کا لفظی ترجمہ
۳۲۲	سُورَةُ الْاِنشِرَاحِ
۳۲۲	مع العسر یسرا کی تفسیر
۳۲۵	سُورَةُ الْعَلَقِ
۳۲۵	کسی نے منیٰ میں کیڑوں کا ثبوت قرآن سے دیا
۳۲۶	نماز کا اصلی مقصود
۳۲۸	سُورَةُ الْقَدْرِ
۳۲۸	شب قدر کا ثواب
۳۲۹	عبادات شب قدر کا ثواب لامحدود ہے
۳۳۰	سُورَةُ الْبَيِّنَةِ
۳۳۱	کفار اور مشرکین کو خلود فی النار کا ثبوت
۳۳۳	کفر سے بڑا جرم
۳۳۳	محدود کفر پر غیر محدود عذاب شبہ کا جواب
۳۳۴	جواب جزا و سزا میں نیت کا دخل

اتلاف حقوق الہی کی سزاجواب

۳۳۵

سُورَةُ الزَّلْزَالِ

۳۳۵

اہل غفلت کی غلطیاں

۳۳۵

اہل غفلت کا حال

۳۳۶

عذاب تطہیر

۳۳۶

خروج آدم کی حکمت

۳۳۷

مفہوم آیت

۳۳۸

نور قلب اور معاصی یکجا جمع نہیں ہوتے

۳۳۸

سُورَةُ الْعَصْرِ

۳۳۹

توضیح قسم

۳۳۹

مخلوق کی قسم قبیح لغیرہ ہے

۳۴۱

وقت کی قدر کرنا چاہیے

۳۴۲

کمال دین دو باتوں پر موقوف ہے

۳۴۸

حق اور صبر کی مراد

۳۴۹

قبروں کی پختگی پر قابل افسوس ہے

۳۵۰

سُورَةُ الْكَافِرُونَ

۳۵۱

آج کل کی ایک بے ہودہ رسم

۳۵۱

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

۳۵۲

احتیاط خطاب

۳۵۲

سُورَةُ النَّصْرِ

۳۵۳

رسول اکرم ﷺ کے قرب وصال کی خبر

۳۵۳

۳۵۵	بشارت تکمیل دین
۳۵۸	سُورَةُ الْقَلَقِ
۳۵۸	حضور ﷺ پر سحر کئے جانے کا واقعہ
۳۵۹	جادو کی دو قسمیں اور ان کا شرعی حکم
۳۵۹	قرآنی سورتوں کے موکلوں کا کوئی ثبوت نہیں
۳۵۹	سحر جادو وغیرہ سے حفاظت کی اہم دعاء
۳۶۰	آسیب لپٹ جانا
۳۶۰	آسیب اور جادو
۳۶۲	حرز ابی دجانہ
۳۶۲	برائے دفع سحر
۳۶۳	سحر کے لئے
۳۶۳	وسوسہ شیطانی
۳۶۵	سُورَةُ النَّاسِ
۳۶۵	جادو کی کاٹ کے لئے معوذتین کا عمل

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَفَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اِنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِیْنَ ۝

ترجمہ: کیا ہم تم سے اس نصیحت (نامہ) کو ہٹالینگے اس بات پر کہ تم حد (طاعت) سے گزرنے والے ہو۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ و تعالیٰ کی شفقت عنایت

جن پر حق تعالیٰ کی صفات کمال کا ظل سایہ ہے ان کو بھی مخلوق سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ وہ کوئی سنے یا نہ سنے برابر نصیحت کرتے رہتے ہیں اور ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

کس بشنود یا نہ شنود من گفتگوئے میکنم
(یعنی کوئی شخص سنے یا نہ سنے میں برابر نصیحت کئے چلا جاؤں گا)

اور یہ خیال ہوتا ہے کہ

حافظ و وظیفہ تو دعا گفتن است و بس در بند آن مباحث کہ شنید یا نشنید

(اے حافظ تیرا کام فقط دعا کرنا ہے اور بس اس بات کی فکر میں مت رہ کہ اس نے سنایا نہ سنا

فلاسفہ اس کی قدر کیا جائیں یہ تو اہل محبت ہی خوب سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو ہم سے اس درجہ شفقت ہے کہ ایک بات کو دس مرتبہ کہہ کر نہیں چھوڑتے۔ پھر کہتے ہیں پھر کہتے ہیں۔ قرآن میں حکم ہے کہ جب گھوڑے پر سوار ہو تو یہ آیت پڑھو سبحن الذی سخر لنا هذا وما كنا له مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون۔ (اس کی ذات پاک ہے جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم تو ایسے نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے)

سواری پر مسنونہ دعاء پڑھنے کی حکمت

کہ خدا کا فضل ہے کہ اس نے ہمارے لئے اس کو مسخر کر دیا۔ ورنہ اگر بگڑ جاتا تو ہم کیا کر لیتے یہ تو خاص رکوب کے سامنے ہوا آگے فرماتے ہیں۔ وانا الی ربنا لمنقلبون اس کو بظاہر پہلے مضمون سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر اہل لطائف نے سمجھا کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بندو اس جانور پر سوار ہونے سے دوسری سواری کو بھی یاد کرو اور سمجھ لو کہ تم کو کسی تختہ پر اور چار پائی پر بھی سوار ہونا ہے۔ جس میں تم کو رکھ کر چار آدمی لے جائیں گے۔ اصل سواری وہی ہے جس پر سوار ہو کر کے تم خدا کے یہاں پہنچا دیں گے تو جب جانور پر سواری لیتے وقت اس کے یاد کرنے کا حکم ہے تو مردے کو دیکھ کر تو یاد کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا۔ اس وقت بھی یاد نہ کرنا سخت قساوت ہے۔

اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ قبر پر بیٹھے ہیں اور مقدمے کی باتوں میں مشغول ہیں اسی طرح اگر مصیبت میں کسی کو گرفتار دیکھتے ہیں اس کو اسی شخص تک محدود سمجھتے ہیں حالانکہ سمجھنا چاہیے کہ اس پر مصیبت کیوں مسلط ہوئی۔ ظاہر ہے کہ گناہوں کی وجہ سے تو ہم کو بھی گناہوں سے بچنا چاہیے اسی لئے حدیث میں ہے کہ جب کسی کو بتلائے مصیبت دیکھو تو کہو الحمد لله الذی عافانی مما ابتلاک به و فضلنی علی کثیرا ممن خلق تفضیلاً اس میں بھی تذکیر ہے احتمال ابتلا کی اور اسی میں تنبیہ اجمالی ہے۔ اسباب ابتلا کی کہ معصیت ہے اسی پر یہ شکر سکھایا کہ احتمال تھا کہ اسی معصیت کے سبب شاید ہم بھی بتلا نہ ہو جائیں۔ لیکن یہ دعا آہستہ پڑھے کہ مصیبت زدہ کی دل شکنی نہ ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں لا تظہر الشماتۃ لا خیک بعض دوسرے مصائب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو ڈرنا چاہیے کیونکہ مقتضی تو ہم میں بھی موجود ہیں۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: اور کہنے لگے کہ اگر یہ قرآن (اگر کلام الہی ہے تو) ان دونوں بستیوں (مکہ اور طائف کے رہنے والوں میں) کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔

تفسیری نکات

حقانیت اسلام

کفار نے حضور ﷺ کی شان میں کہا تھا لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم یعنی یہ قرآن شریف طائف اور مکہ کے کسی بڑے آدمی (یعنی دولت مند) پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ حالانکہ نبی اگر ہمیشہ صاحب سلطنت اور صاحب مال ہوا کرتے تو ان کا اتباع سلطنت اور مال کی وجہ سے ہوتا اور اس سے حق ظاہر نہ ہوتا۔ حق کا ظہور اسلام کا دین الہی ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ حضورؐ نہ صاحب سلطنت و حکومت تھے نہ پڑھے لکھے تھے نہ کوئی اور کمال عرفی رکھتے تھے۔ پھر دفعۃً بڑے بڑے سلاطین بڑے بڑے اہل کمال کی آپ کے سامنے گردنیں جھک گئیں۔ جس طرح خانہ کعبہ اگر وادی غیر ذی ذرع میں نہ ہوتا اور کسی شاداب اور ترو تازہ مقام پر ہوتا تو اس کی حقانیت ایسی ظاہر نہ ہوتی یہی وسوسہ ہوتا کہ ظاہری شادابی کے سبب لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ بخلاف اس وقت کے کہ سنکستان خشک میں ہے پھر اس کی طرف لوگ مشتقتیں اٹھا اٹھا کر جاتے ہیں اور جو ایک مرتبہ ہو آیا اس کو پھر ہوس ہے۔ یہ کیا بات ہے جس سے یہ کھلی دلیل ہے اس کی کہ اس میں غیبی کشش ہے۔

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

ترجمہ: کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں دنیوی زندگی میں تو ان کو روزی ہم ہی نے تقسیم کر رکھی ہے۔

تفسیری نکات

رحمت کا اطلاق نبوت پر بھی ہے

تفصیل اس مضمون کی یہ ہے کہ جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تو علاوہ اور اعتراضوں کے کفار نے یہ بھی کہا تھا کہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے شخص پر کیوں نہ نازل کیا گیا اور اس کو کیوں نہ نبی بنایا گیا حق سبحانہ ان کے اس قول کو نقل فرما کر اس کا جواب دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خدا کی رحمت یعنی نبوت کو کیا یہ لوگ اپنی تجویز سے تقسیم کرتے ہیں حالانکہ ان کو یہ حق نہیں ہے کیونکہ سامان معیشت سے ادنیٰ چیز کو تو ہم تقسیم کرتے ہیں اور اس کے تقسیم کا ان کو اختیار نہیں دیا ہے نبوت جیسی عظیم الشان شے کو یہ خود کیوں کر تقسیم کریں گے اور ان کو اس کے تقسیم کا کیا حق ہوگا۔ جب یہ معلوم ہوگا کہ رحمت کا اطلاق نبوت پر بھی ہوا ہے تو اس سے ایک دوسری آیت کی تفسیر بھی ہوگی اور ایک بڑا معرکہ الارامقام حل ہو گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق سبحانہ نے فرمایا ہے قُلْ لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُونَ خِزْيَانِ رَحْمَةِ رَبِّي اِذْ لَا مَسْكُتٍ خَشِيَةَ الْاِنْفَاقِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُورًا۔ اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس آیت سے پہلے بھی رسالت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی یہ بیچ میں انسان کے بخل کا ذکر کیسے آ گیا۔ مفسرین نے اس کے متعلق کوئی تسکین بخش بات نہیں لکھی۔ امام رازی نے گو اس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے مگر انہوں نے بھی کوئی شافی بات نہیں لکھی لیکن جب کہ رحمت سے نبوت مراد لی جاوے اس وقت آیت مذکورہ بے تکلف اپنے ماقبل و مابعد سے مرتبط ہو جاوے گی۔

سُورَةُ الدُّخَانِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ

ترجمہ: ہم نے اس کو (لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر) برکت والی رات (یعنی شب قدر) میں اتارا ہے

تفسیری نکات

لیلۃ مبارک سے مراد کون سی رات ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کتاب کو برکت والی رات میں نازل کیا ہے ایک قول پر اس کی تفسیر شعبان کی پندرہویں شب ہے لیکن اگر یہ تفسیر ثابت بھی نہ ہو تب بھی اس رات کی فضیلت کچھ اس آیت پر موقوف نہیں احادیث سے اس کی فضیلت ثابت ہے۔ مگر یہ بات طالب علمانہ باقی رہی کہ اگر یہ تفسیر ثابت نہ ہو تو پھر لیلۃ مبارک سے کیا مراد ہوگا سو دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے لیلۃ القدر مراد ہے اسی کو لیلۃ مبارک بھی فرما دیا گیا۔

لیلۃ المبارک و لیلۃ القدر

سو اس تفسیر محتمل پر حق تعالیٰ نے قسم کھا کر ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے کتاب مبین (قرآن) کو اس برکت والی رات میں نازل کیا اس واسطے کہ ہم منذر یعنی ڈرانے والے تھے۔ اسی انداز کے لئے قرآن نازل فرمایا۔ آگے اس رات کے بابرکت ہونے کی علت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس رات کی شان یہ ہے کہ اس میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ہر امر حکمت والے کا کہ وہ ہمارے پاس سے ہوتا ہے اور حکیم کی قید واقعی ہے۔ احترازی نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے تمام امور با حکمت ہی ہیں ان میں کوئی بے حکمت نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تمام امور کا فیصلہ اس رات میں ہوتا ہے یا یوں کہو کہ کل امر حکیم سے مراد امور عظیم الشان

ہیں یعنی بڑے بڑے کاموں کا فیصلہ اس رات میں ہوتا ہے باقی چھوٹے امور تو عرفاً بڑے امور کے ذکر سے وہ خود مفہوم ہو گئے۔ پس بڑے امور اصالۃً اور چھوٹے امور تبعاً۔ غرض سب امور آیت میں داخل ہو گئے۔ اب یہ شبہ رفع ہو گیا کہ روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جملہ امور کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ معظم امور فیصلہ ہوتے ہیں۔ وجہ رفع یہ ہے کہ چھوٹے امور بڑے کے تابع ہو کر فہم میں آتی جاتے ہیں۔

مشہور تفسیر اس آیت کی اکثر کے نزدیک یہ ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے شب براءت مراد نہیں کیونکہ دوسرے موقع پر ارشاد ہے اَنَا انزلناہ فی لیلۃ القدر کہ ہم نے قرآن لیلۃ القدر میں نازل کیا اور یہاں فرما رہے ہیں کہ ہم نے لیلۃ مبارکہ میں نازل کیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نزول سے مراد دونوں جگہ نزول واقعی ہے تدریجی نہیں کیونکہ وہ تو ۲۳ سال میں ہوا اور نزول واقعی ایک ہی مرتبہ ہوا ہے اس لئے لیلۃ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہوگی۔ یہ قرینہ قویہ ہے اس بات کا کہ یہاں بھی لیلۃ القدر ہی مراد ہے۔ لیکن ایک قول بعض کا یہ بھی ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد شب براءت ہے۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ اس سے لازم آتا ہے کہ نزول واقعی دو مرتبہ ہو تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ نزول واقعی دو مرتبہ بھی اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک رات میں حکم نزول ہو اور دوسری میں اس کا وقوع ہو۔ یعنی شب براءت میں حکم ہوا کہ اس دفعہ رمضان جو لیلۃ القدر میں آئے گی اس میں قرآن نازل کیا جائے گا۔ پھر لیلۃ القدر میں اس کا وقوع ہو گیا اور یہ بات کلام میں شائع ذائع ہے کہ قرب کو وقوع کے حکم میں کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ انزلناہ فی لیلۃ القدر میں مراد حقیقی نزول ہے کہ وہ لیلۃ القدر میں ہوا ہے اَنَا انزلناہ فی لیلۃ مبارکہ میں حکمی نزول ہے کہ شب براءت میں حکم ہوا ہے اور دونوں راتیں ہیں۔ قریب قریب اس لئے قرب نزول کو نزول کے حکم میں کر دیا ہو۔ بہر حال ظاہر تو یہی ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد شب قدر ہے مگر احتمال اس کا بھی ہے کہ شب براءت مراد ہو مگر جہاں تک اتفاق ہو اور جو کتابیں نظر سے گزریں ان میں کوئی حدیث مرفوعہ اس بارہ میں نظر سے نہیں گزری اور درمنثور میں بروایت ابن جریر ابن المنذر روایت ابن ابی حاتم عکرمہ سے یہ تفسیر منقول ہے البتہ شب براءت کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ اس میں تمام امور جیسے موالیہ و وفیات و رفع اعمال و نزول ارزاق فیصلہ ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض سلف نے یہ سمجھ لیا ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد یہی رات مراد ہے۔ لیلۃ القدر مراد نہیں ورنہ اس رات کے برابر اس میں بھی واقعات کا فیصلہ ہونا لازم آئے گا تو دو راتوں میں فیصلہ ہونے کے کیا معنی۔

دوسرے یہ کہ واقعات کا تو شب براءت میں فیصلہ ہونا احادیث سے ثابت ہے۔ وہ کون سے واقعات ہیں جن کا فیصلہ ہونا شب قدر میں باقی رہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد شب براءت ہی ہے پھر یہ کہ شب براءت میں ایک سال کے واقعات کا فیصلہ ہونا حدیثوں میں آیا ہے اور شب قدر سال گزرنے

سے پہلے رمضان میں آ جاتی ہے تو اس میں کیا مکرر فیصلہ ہوتا ہے۔
جواب یہ ہے کہ یہاں دو صورتیں نکلتی ہیں کیونکہ عا دةً ہر فیصلہ کے دو مرتبے ہوتے ہیں ایک تجویز اور
ایک نفاذ پس یہاں بھی یہی دو مرتبے ہو سکتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تجویز تو شب براءت میں ہو جاتی ہے اور نفاذ
لیلۃ القدر میں ہوتا ہے اور ان میں کسی قدر فیصلہ ہونا بعید نہیں تجویز کو قدر کہتے ہیں اور حکم کے نافذ کر دینے کو قضا
کہتے ہیں کہ شب براءت میں تجویز ہوتی ہو اور لیلۃ القدر میں اسی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس تقریر سے سارے
اشکالات کا جواب ہو گیا۔ غرض آیت میں لیلۃ مبارکہ سے مراد جو بھی ہو لیکن احادیث سے تو اس رات
کا بابرکت ہونا معلوم ہوتا ہی ہے۔

احادیث میں مذکور ہے کہ جب شعبان کی پندرہویں رات ہوتی ہے تو حق تعالیٰ اول شب سے آسمان
دنیا پر نزول فرماتے ہیں۔ یہ خصوصیت اس رات میں بڑھی ہوئی ہے۔ یعنی اور راتوں میں تو پچھلے اوقات میں
نزول ہوتا ہے اور اس شب میں شروع ہی سے نزول فرماتے ہیں یہ بھی وجوہ برکت میں سے ایک وجہ ہے
برکت کی۔ اس کی قدر وہ کرے گا جس میں مادہ محبت کا ہو۔

علمی فائدہ

آیت محتمل تھی دو معنی کو۔ یا تو اس سے شب قدر مراد ہو یا شب براءت۔ سوا گر شب براءت مراد ہو تو انا
انزلنہ فی لیلۃ مبارکۃ یعنی بے شک ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل کیا۔ کے معنی کیا ہوں گے جب
نزول قرآن کا لیلۃ القدر میں ثابت ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس رات میں سال بھر کے واقعات لکھے جاتے ہیں جو کچھ ہونے والے ہوتے ہیں تکتب
(لکھے جاتے ہیں) کا لفظ حدیث میں آیا ہے۔ منجملہ ان واقعات کے ایک واقعہ ہے نزول قرآن کا بھی۔ پس
مطلب یہ ہوا کہ اس رات میں یہ مقرر کر دیا گیا کہ شب قدر میں قرآن مجید نازل ہوگا۔ پس انا انزلنا (نازل کیا
ہم نے) کے معنی ہوں گے قدر نازل ہو (یعنی مقدر کیا ہم نے اس کا نزول) سو اس تقریر پر اشکال رفع ہو گیا۔

سُورَةُ الْجَاثِيَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ

الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٨﴾

ترجمہ: پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا ہے سو آپ اسی طریقہ پر چلے جائیے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلیے۔

تفسیری نکات

ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها - ثم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فرماتے ہیں۔
ولقد اتينا بنى اسرائيل الكتب والحكم والنبوة وورزقناهم من الطيبات وفضلناهم على
العلمين واتينهم بينت من الامر فما اختلفوا الا من بعد ما جاءهم العلم بغيا بينهم ان
ربك يقضى بينهم يوم القيمة فيما كانوا فيه يختلفون.

فرماتے ہیں یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں
کھانے کو دی تھیں اور ہم نے ان کو دنیا جہاں والوں پر فوقیت دی اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی
دلیلیں دیں۔ سو انہوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلافات کیا بوجہ آپس کی ضد اضدی کے۔ آپ کا
رب ان کا آپس میں قیامت کے روز ان امور میں فیصلہ کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں ثم جعلناك الخ یعنی آپ سے پہلے بنی اسرائیل کو کتاب وغیرہ عنایت کی
تھی۔ اس کے بعد ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔

اتباع شریعت

من الامر میں من بیان یہ ہے کہ وہ شریعت اور طریقہ خاص کیا ہے وہ امر دین ہے پس اس کا اتباع کیجئے کتنا لطیف ہے شریعت! یعنی جس عنوان سے علماء اتباع دین کا امر کرتے ہیں وہی عنوان آیت میں وارد ہوگا۔ جس سے صریحاً علماء کا ثابت ہو گیا۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے۔

ولا تتبع اہواء الذین لا یعلمون اور ان جاہلوں کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجئے۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ طرز بیان ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ولا تتبع غیرہا کہ غیر شریعت کا اتباع نہ کیجئے بلکہ یوں فرمایا کہ جہلا کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجئے اس میں یہ بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں وہ خواہش نہیں وہ ہوائے نفسانی ہیں اس لئے وہ عمل کے قابل نہیں۔ الذین لا یعلمون سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ قید احترازی ہے۔ یعنی الذین یعلمون کی اہوا کا اتباع جائز ہے بلکہ یہ قید واقعی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ واقع میں علماء ہی نہیں ہیں جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہشیں پیش کرتے ہیں بلکہ وہ تو جہلا ہیں۔

جیسے یوں کہتے ہیں کہ مفسدوں کے بہکانے میں نہ آنا۔ تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ غیر مفسدین کے بہکانے میں آجانا۔ نہیں مطلب یہی ہے کہ بہکانے والے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں ان سے بچتے رہنا۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لو۔

اور الذین لا یعلمون کا مفعول جو ذکر نہیں فرمایا سبحان اللہ! اس میں عجیب رعایت ہے۔ اگر مفعول ذکر فرماتے تو وہ امر الدین ہوتا تو ایک گونہ مصادرہ ہو جاتا کیونکہ امر دین ہی میں تو کلام ہو رہا ہے تو اس صورت میں یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اس لئے مذموم ہے کہ وہ اہواء ہے۔ اور اہواء اس لئے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا فعل ہے۔ اس لئے یہاں مطلق علم کی نفی کر دی کہ اہواء اس لئے مذموم ہے کہ وہ ایسوں کا فعل ہے جو بالکل ہی جاہل ہیں۔

یہاں اتباع شریعت کے متعلق ایک نکتہ ہے جسے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے اور اطلاق مضر ہے کیونکہ اطمینان اور چین بدوں تقلید کے نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہوں گے تو فلانے طبیب کا علاج کریں گے۔ تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے۔ بیماری کا خوف نہیں ہوگا اور نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا کہ کس کا علاج کریں اور اگر تقلید نہیں ہے تو پھر ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں۔ اگر آج ذرا سا تغیر پیش آیا ایک طبیب سے رجوع کیا۔ دوسرا تغیر پیش آیا دوسرے سے

رجوع کر لیا۔ تیسرا پیش آیا تیسرے سے رجوع کر لیا۔ تو اس میں دل کو چین نہیں ہوگا اور ہر وقت یہ فکر رہے گی کہ اب کے تغیر میں کس سے رجوع کریں۔ غرض تقلید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے چاہے وہ طبیب دانشمند بھی نہ ہو۔ مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہو جائے گا اور اگر وہ تقلید حقائق کو موافق ہو تو سبحان اللہ کیا کہتا ہے۔

اگر شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونے کا بھی دعویٰ نہ ہوتا جیسا کہ مدلول ہے ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون کاتب بھی شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا اور اب تو جب کہ شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونا ثابت کر دیا گیا تو اس اتباع کا ضروری مصلحت و موجب طمانیت ہونا اور بھی ثابت ہو گیا۔ آگے وعید ہے انھم لسن یغنوا عنک من اللہ شیناً یہ لوگ خدا کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے۔

یعنی گویا آج مددگار بننے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر خدا کے یہاں ذرا کام نہیں آسکتے۔ اس پر اہل حق کو تردد ہو سکتا تھا کہ اتباع کے بعد ہم تو اکیلے رہ گئے اس لئے فرماتے ہیں وان الظالمین بعضهم اولیاء بعض اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا جو احکام کا اتباع کرتے ہیں۔

تفسیر قل ہذہ سبیلی

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ہم کو ان کے متعلق اجمالاً یہ بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے اس وجہ سے ہم ان کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں ورنہ بحیثیت مستقل متبوع ہونے کے ان کا اتباع نہیں کرتے۔ تو جیسی نسبت ہم ابوحنیفہ کی طرف کرتے ہیں۔ ایسی سبیل من اناب الی۔ (جو لوگ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں ان کے راستہ کا اتباع کرو) قل ہذہ سبیلی ادعوا الی اللہ (آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے بلانا ہوں) سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسول اور ان لوگوں کی طرف کی جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یصدون عن سبیل اللہ (وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں) میں سبیل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو یہ ایسا ہے کہ

عبارت ناشتی و حسنک و احد (عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدت رامی شناسم

یعنی جو لباس چاہے پہن لے میں تو قد سے ہی پہچان لیتا ہوں یعنی جو قرآن کا عاشق ہے اس کو حدیث و فقہ میں بھی قرآن نظر آتا ہے۔

اسی طرح قرآن و حدیث اور فقہ گو فرعیات کے اندر مختلف ہیں مگر ہیں سب دین الہی

اگر فرعیات میں تھوڑا سا اختلاف ہو گیا تو کیا وہ دین الہی نہیں رہا جیسے طب یونانی اصول کا نام ہے۔ تو

کیا لکھو؟ کامطب اور دہلی کامطب فرعیات کے اندر مختلف ہونے سے طب یونانی نہیں رہا۔

سبیلی فرمانے کا مطلب

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس کو سبیلی (میرا راستہ) فرمایا تھا۔ اس کو یہاں سبیل من اناب الی (ان لوگوں کا راستہ جو میرے طرف متوجہ ہوئے) فرما رہے ہیں۔ پس سبیلی اور سبیل من اناب الی مصداق کے اعتبار سے ایک ہوئے اسی طرح ایک جگہ فرمایا۔

ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها دينك من اناب الی مصداق کے اعتبار سے ایک ہوئے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں اتبع ملة ابراهيم حنيفا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے۔ اب اس کے کیا معنی ہیں ظاہر ہے کہ اسی شریعت محمدیہ کا ایک لقب یہ ہے ملت ابراہیم۔ یہ ہے عنوان کا اختلاف باقی اصل اتباع احکام الہیہ کا ہے پھر اتباع علماء کے عنوان سے کیوں متوحش ہوتے ہو۔

کہ و اتبع ملة ابراهيم حنيفا (ملت ابراہیمی کا اتباع کرو) باوجودیکہ حضور ﷺ مستقل ہیں مگر پھر بھی کہا جاتا ہے کہ و اتبع ملة ابراهيم (آپ دین ابراہیم کا اتباع کیجئے) اگر اس کے دو معنی یہ ہوں کہ جو ان کا طریقہ ہے اس کا اتباع کیجئے تب تو یہ بڑا سخت مضمون ہے کیونکہ یہ تو امتی کا کام ہے کہ دوسروں کے طریقہ کا اتباع کرے نہ کہ نبی کا۔ تو بے تکلف توجیہ اس کی اس تقریر سے سمجھ میں آجائے گی کہ ملت ابراہیم اس ملت الہیہ کا نام ہے۔ اس کے بہت سے لقب ہیں۔ اس میں سے ایک لقب ملت ابراہیم بھی ہے۔ چونکہ یہ دونوں شریعتیں فروع میں بھی بکثرت متفق ہیں۔ اس مناسبت سے اس ملت کا نام ملت ابراہیم رکھا گیا ہے۔ تو واقع میں ملت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع نہیں ہے بلکہ ملت الہیہ کا اتباع ہے جو کہ ایک مناسبت سے ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کر دی گئی تو جیسے یہاں پر ملت الہیہ کو ملت ابراہیم کہہ دیا گیا ہے اسی طرح اگر اس دین کو مذہب شافعی یا مذہب ابوحنیفہ یا قول قاضی خاں کہہ دیا جاوے تو کیا مضائقہ ہے۔

معیار اتباع

اب رہ گئے وہ لوگ جو اتباع تو کرتے ہیں مگر کوئی معیار صحیح نہیں مقرر کرتے بلکہ ہر کس و ناکس کا اتباع کرنے لگتے ہیں سو آگے ان کی اصلاح کرتے ہیں کہ سبیل من اناب (ان لوگوں کے راستہ کا جو نسیب ہیں) کا اتباع کرو اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھئے کہ و اتبع من اناب الی (ان لوگوں کا اتباع جو میری

طرف متوجہ ہوئے) نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ایہام ہے اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں۔ اس لئے سبیل کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا واتبع سبیل من اتاب الی (ان لوگوں کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) کہ وہ خود متبوع نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس ایک سبیل ہے وہ ہے متبوع۔ یہ ہے اتباع کا معیار کہ جس شخص کا اتباع کرو اس کو دیکھ لو وہ صاحب انابت ہے یا نہیں۔ جو صاحب انابت ہو اس کا اتباع کرو سبحان اللہ! کیا عجیب معیار ہے پس اتباع اسی معیار کے موافق کرنا چاہیے اور سب معیار چھوڑ دینے چاہئیں۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے توجہ الی اللہ (اللہ کی طرف توجہ کرنے) کو معیار بنایا۔ اور توجہ الی اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو ماننے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ویہدی الیہ من ینیب (یعنی جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت کرتے ہیں) کہ توجہ الی اللہ کو ہدایت لازم ہے اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ توجہ الی اللہ کے لئے لازم ہے اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ توجہ الی اللہ کے لئے لازم ہے کہ اس کے افعال درست ہوں۔ پس اب اتاب الی سے مراد وہ شخص ہوا جو کہ باعمل ہو اور عمل بدوں علم کے ہو نہیں سکتا تو حاصل یہ ہوا کہ اس کا اتباع کرو جو احکام خداوندی کے علم و عمل دونوں کا جامع ہو پس دو چیزیں اصل ٹھہریں۔ ایک علم دین اور ایک عمل دین۔

اتباع شریعت

ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها.

دیکھئے یہاں شریعت کا لفظ صاف موجود ہے کہ شریعت کا اتباع کیجئے اس سے کس قدر جی خوش ہوتا ہے کہ مولوی شریعت کے اتباع کو کیسے نہ کہیں خدا تعالیٰ شریعت کے اتباع کا حضور ﷺ کو حکم فرما رہے ہیں۔ اور من الامر میں الف لام عہد کا ہے اس سے مراد دین ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ دین کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کر دیا ہے آپ اس کا اتباع کئے جائیے۔

حق تعالیٰ کا اتباع

پس جب اتنے بڑے صاحب علم کو ضرورت ہے اتباع شریعت کی تو ہم کو کیوں نہ ضرورت ہوگی۔ تو ہر ایک کو اپنے بڑے کے اتباع کا حکم ہوا۔ حضور سے بڑھ کر تو کوئی نہیں تھا۔ تو آپ کو حکم ہوا اتباع وحی کا۔ اور صحابہ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لئے انہیں حکم ہوا کہ حضور کا اتباع کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا فاتبعونی یحببکم اللہ سومیر اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھیں گے (اور علیکم بسنتی میری سنت کو اپنے اوپر لازم پکڑو)

پس حضور کو حکم ہے وحی کے اتباع کا اور صحابہ کو حکم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا۔ پھر علماء کو حکم ہے صحابہ کے اتباع کا اور نیچے آ کر عوام کو حکم ہے علماء کے اتباع کا۔ چنانچہ ارشاد ہے واتبع سبیل من اناب الی اور متبوع مستقل سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں پھر حضور کا اتباع کرنے کو جو کہا گیا ہے سو وہ اس لئے کہ حق تعالیٰ کا اتباع حضور ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید سمجھانے کا وعدہ حضور ہی سے کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم ان علینا بیانہ (یعنی پھر اس کا بیان کرادینا ہمارا ذمہ ہے) اور حضور فرماتے ہیں علمنی ربی فاحسن تعلیمی (میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی۔ پس اچھی ہوئی میری تعلیم) تو آپ کے اتباع کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے ارشاد کے موافق خدا کے احکام کا اتباع کیا جائے۔ یہی معنی خلفائے راشدین کے اتباع کے ہیں۔ نہ یہ کہ خلفائے راشدین مستقل متبوع ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے راشدین کو دین خوب سمجھایا۔ اس وجہ سے دین کا اتباع صحابہ کے فرمانے کے مطابق کرنا چاہیے اور چونکہ خدا تعالیٰ کے احکام کا اتباع صحابہ کے ارشاد کے موافق کیا جاتا ہے۔ اسی لئے اس کو صحابہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے کہ سنة الخلفاء الراشدين (خلفاء راشدین کی سنت) علی ہذا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے دین کو حضرات ائمہ مجتہدین نے لیا اور سمجھا اور ایسا سمجھا کہ ان کی تحقیقات کے موافق اتباع کرنا چاہیے مگر نہ اس وجہ سے کہ وہ متبوع مستقل ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اگر ہم خود اتباع کرتے تو بہت جگہ احکام الہی کے سمجھنے میں غلطی کرتے اور چونکہ ہم سے زائد سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ ان کی تحقیق کے موافق اتباع کرنا چاہیے۔

اهواء کا مقابل دین ہے

ثم جعلناک علی شریعة من الامر فاتبعها ولا تتبع احواء الذین لا یعلمون .

(پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔ سو آپ اسی طریقہ پر چلے جائیے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلئے)

اس مقام پر شریعت کو اہواء (خواہشات) کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہواء کا مقابل مطلق دین ہے خواہ احکام ظاہری ہوں یا احکام باطنی۔ باقی اس کے یہ معنی نہیں کہ بعض چیزیں احکام ظاہری کی رو سے حرام ہیں اور احکام باطنی کی رو سے حلال ہیں۔

اور باطن سے وہ مراد نہیں جس کو عوام باطن کہتے ہیں میری مراد باطن سے وہ ہے جس کی خبر نہ مدعیان باطن کو ہے نہ مدعیان ظاہر کو۔

هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: یہ قرآن عام لوگوں کے لئے دانش مندیوں کا سبق اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین یعنی ایمان لانے والوں کے لئے رحمت کا سبب ہے۔

تفسیری نکات

رضا بالدنیا کب مذموم ہے

حق تعالیٰ ایک مقام پر کفار کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں ورضاوا بالحویة الدنیا واطمءنوا بها کہ وہ دنیا سے خوش اور مطمئن ہو گئے اس سے معلوم ہوا کہ رضا بالدنیا مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اس وقت مذموم ہے جبکہ اس کے ساتھ اطمینان اور بے فکری بھی ہو ورنہ واطمءنوا بها (اور اس سے مطمئن ہو گئے) نہ بڑھایا جاتا پس معلوم ہوا کہ مذمت میں اس اطمینان کو بھی دخل ہے گو یہ اطمینان بالدنیا کفر سے کم ہی ہے مگر ایسا کم ہے جیسا آسمان عرش سے کم ہے مگر فی نفسہ تو بہت بڑا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

آسمان نسبت بعرض آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تود

(آسمان عرش کے مقابلہ میں بیشک نیچا ہے لیکن مٹی کے ٹیلے سے تو کہیں اونچا ہے)

اسی طرح اطمینان بالدنیا بہت سخت چیز ہے جہی تو اس کو کفار کی مذمت میں بیان کیا گیا۔ گو کفر سے کم ہوا اس جگہ جملہ معترضہ کے طور پر ایک تحقیق لغت کی بھی بیان کر دوں کہ آسمان لفظ مفرد نہیں ہے بلکہ مرکب ہے آس اور مان سے آس بمعنی آس یا چکی کو کہتے ہیں اور مان بمعنی مانند ہے تو یہ لفظ اصل میں آس یا مان تھا کثرت استعمال سے تخفیف کر کے آس یا کو آس بنا لیا گیا آسمان ہو گیا گو ہمیں فارسی دانی کا دعویٰ نہیں مگر جو لوگ اس کے مدعی ہیں وہ اس نئی تحقیق کو سن لیں غالباً ان کے بھی خیال میں یہ بات نہ آئی ہوگی۔ پس آسمان کو آس مان اس لئے کہتے ہیں کہ ان اہل لغت کے نزدیک چکی کی طرح اس میں بھی حرکت دوریہ ہے غرض رضا بالدنیا و اطمینان بہا (دنیا سے خوش ہونا اور اس سے مطمئن ہونا) گو بمقابلہ کفر کے کم ہے مگر فی نفسہ بہت بڑا مرض ہے۔ اس کا علاج کرنا چاہیے جس کی ایک صورت یہ ہے جو میں اس وقت بیان کر رہا ہوں کہ انسان یہ تصور پیش نظر رکھے کہ میں ہر وقت سفر میں ہوں چنانچہ قرآن کی اس آیت سے بطور دلالت التزام کے یہ بات ثابت ہے کہ انسان سفر میں ہے اور اس کے لوازم سے بے چینی اور عدم اطمینان کیونکہ مسافر کو منزل پر پہنچنے سے پہلے اطمینان

نہیں ہوا کرتا بلکہ مسافر کے لئے غیر منزل کے ساتھ اطمینان اور رضا خود موانع سفر سے ہے جو مسافر غیر منزل سے دل لگالے گا اور اسی میں قیام کر کے بے فکر ہو جائے گا۔ یقیناً منزل پر نہ پہنچ سکے گا۔ ان سب باتوں کو بھی قرآن نے بتلا دیا ہے کہ دنیا سے رضا اور اطمینان نہ ہونا چاہیے پس قرآن سے بدلائی مطابقتی ہمارا مسافر ہونا بھی ثابت ہے اور بدلائی التزامی سفر کے لوازم بھی ثابت ہیں اور اس کے موانع بھی بتلا دیئے گئے ہیں اب اس مضمون میں کیا شبہ ہے اور سنئے لوازم سفر سے طریق کا مبداء و منہجا بھی ہے۔ سو مبداء کے بیان کی تو اس لئے ضرورت نہیں کہ وہ تو چلنے والے کے سامنے ہے اور منہجا کا ذکر قرآن میں جا بجا آیا ہے چنانچہ بار بار فرماتے ہیں والی اللہ ترجع الامور (اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں) وان الی ربک الرجعی (تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے) والی اللہ المصیر (اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے) اور ایک مقام پر صاف ارشاد ہے و علی اللہ قصد السبیل و منها جائز کہ سیدھا راستہ ہی خدا تک پہنچتا ہے اور بعضے ٹیڑھے راستے بھی ہیں (اور سیدھے راستے کی توفیق تو اس کو ہوتی ہے جو طالب حق ہو) ولو شاء لهدکم اجمعین (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تم سب کو (سیدھے راستے کی طرف جبراً) ہدایت کر دیتے) مگر چونکہ یہ دارالابتلاء ہے اس لئے نہیں کیا جاتا لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشید من الغی۔ (دین میں جبر نہیں ہے تحقیق ظاہر ہو گئی رشد گمراہی سے) مشہور تفسیر تو یہ ہے و علی اللہ بیان قصد السبیل و منها جائز۔ (سیدھا راستہ ان میں بعض ٹیڑھے بھی ہیں) مگر اس میں مضاف کا حذف ہے جو بلا ضرورت خلاف اصل ہے اس لئے میرے نزدیک یہاں علی بمعنی الی ہے جو قرآن میں جا بجا آیا ہے۔ چنانچہ بما انزل علینا بمعنی بما انزل الینا۔ (اور اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے) آیا ہے اور بھی اس کی نظائر تلاش سے ملیں گی اس صورت میں حذف کی ضرورت نہ ہوگی تو منہجائے سفر بھی قرآن میں مذکور ہے۔

علامات سفر

پھر لوازم سفر سے علامات بھی ہیں ہر راستہ کی کچھ علامات ہوتی ہیں تو یہاں بھی کچھ علامات ہونا چاہئیں بلکہ یہاں ضرورت زیادہ ہے کیونکہ یہ سبیل محسوس نہیں بلکہ معنوی ہے سو قرآن میں اس راستہ کی علامات بھی مذکور ہیں فرماتے ہیں۔ ومن بعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب۔ (اور جو شخص دین خداوندی کے ان یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے) شعائر اللہ وہی علامات ہیں جو خدا کی طرف چلنے کی دلیل ہیں یعنی نماز و روزہ اور حج۔

لوازم سفر

پھر لوازم سفر سے ضیاء (روشنی) بھی ہے کیونکہ راستہ میں تاریکی ہو تو چلنا دشوار ہے۔ سیر فی الطریق (راستہ میں چلنا) رویت طریق (راستہ دیکھنے) پر موقوف ہے اور رویت بدوں ضیاء کے نہیں ہو سکتی تو قرآن میں اس راستہ کے لئے ضیاء بھی ثابت ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (یعنی یہ قرآن عام لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت ہے) اس میں لفظ بصائر سے ضیاء پر دلالت ہے ایک دفعہ مجھے اس آیت میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ اس جگہ تین چیزیں کیوں بیان کی گئیں۔ بصائر و ہدی و رحمة۔ پھر سمجھ میں آیا کہ راستہ چلنے میں ایک تو رہبر کی ضرورت ہے وہ تو ہدی ہے۔ پھر رہبر کی عنایت و شفقت کی ضرورت ہے کہ مختصر اور سہل راستہ سے لے جائے وہ رحمت ہے پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ چلنے والا سوا نکہا ہوا اگر راستہ حسی ہے تو بصر کی ضرورت ہے اور معنوی ہے تو بصیرت کی ضرورت ہے اس کا ذکر بصائر میں ہے۔ مگر بصائر سے مراد اسباب بصیرت ہیں یعنی ضیاء کیونکہ قرآن کو جو بصیرت فرمایا ہے ظاہر ہے کہ وہ اسباب بصیرت میں سے ہے پس قرآن میں ضیاء معنوی موجود ہے جس میں تامل کرنے سے بصیرت کام کرنے لگتی ہے اور اس کو راستہ نظر آنے لگتا ہے پس اس آیت سے ضیاء بھی ثابت ہوئی اور دوسری آیات میں تو صاف طور پر لفظ نور وارد ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ۔ (یعنی تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں) غرض قرآن سے سفر اور لوازم سفر سب ثابت ہیں۔

ضیاء طریق منزل

۱۶ صفر ۱۳۲۹ھ کو فرمایا کہ آج رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک طالب علم میرے پاس یہ آیت پڑھ رہا ہے۔ هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (آیت آخر سورہ اعراف) میں نے خواب ہی میں اس سے پوچھا کہ بصائر کون جمع کیوں لائے ہیں۔ اور ہدی و رحمة کو مفرد کیوں لائے ہیں۔ اس نے جواب دیا تاکہ راستہ چلنے والے پریشان نہ ہوں میں نے کہا کہ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہوا اس کے بعد میں

نے خود کہا کہ راستہ چلنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے ایک ضیاء کی دوسرے طریق کی۔ تیسرے منزل کی لیکن ضیاء سے کام لینے کے لئے آنکھیں شرط ہیں اور آنکھیں ہر شخص کے لئے علیحدہ ہونی چاہئیں۔ اس لئے بصائر کو جمع لایا گیا اور ہدی مثل طریق کے واحد ہے اس لئے وہ مفرد لایا گیا اور رحمت مثل ثمرہ طریق یعنی منزل کے ہے وہ بھی متعین اور واحد ہے اس واسطے اس کو بھی واحد لایا گیا۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

ترجمہ: اور اسی کو بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی زبردست حکمت والا ہے۔

تفسیری نکات

کبریائی صرف حق سبحانہ و تعالیٰ کی شان کے لائق ہے

حق تعالیٰ نے آیت میں بلفظ حصر عظمت کو اپنے واسطے ثابت کیا ہے ولہ الکبریاء یعنی اسی کے واسطے ہے عظمت بلاغت کے قاعدہ سے کہ کو مقدم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ عظمت مخصوص ہے ذات باری تعالیٰ کے ساتھ یہ صفت دوسرے میں بالکل نہیں ہو سکتی نیز یہ نہیں فرمایا ولہ الکبریاء العظمیٰ کہ بڑی عظمت تو حق تعالیٰ کے لئے ہے اور چھوٹا موٹا کوئی حصہ اس کا دوسرے کے لئے بھی ثابت ہے بلکہ مطلق کبریاء کو دوسرے سے نفی کر دیا اسی کو حدیث میں اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ العظمة ازاری والکبریاء ردانی فمن نازعنی فیہما قصمتہ یعنی عظمت میرا تہبند ہے اور کبریاء میری چادر جو کوئی ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ چادر اور تہبند فرمانا کنایہ ہے خصوصیت سے معنی یہ ہوئے کہ یہ دونوں صفتیں خاص ہیں میرے ساتھ دوسرا کوئی مدعی ہوگا تو میں اس کو سزا دوں گا جب کبریاء حق ہو باری تعالیٰ کا تو اپنے نفس میں اس کا رکھنا مساواة ہوئی۔ باری تعالیٰ کے ساتھ اور دیگر معاصی کے لئے تو حدود ہیں کہ جب تک ان تک نہ پہنچے معصیت نہیں ہوتی۔ مثلاً کھانا کہ اتنا زیادہ نہ ہو کہ موجب ہو جائے مرض کا اس وقت تک مباح ہے یا بھوکا رہنا کہ جب تک سبب نہ ہو جائے ہلاکت کا جائز ہے مگر کبروہ معصیت ہے کہ اس کے لئے کوئی حد نہیں بلکہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا۔ بلکہ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ تشدد ہے۔ اخرجوا من النار من کان فی قلبه مثقال ذرة من ایمان یعنی قیامت کے دن حکم ہوگا کہ جس کے دل میں ایک ذرہ بھر بھی ایمان ہے اسے دوزخ سے نکالو۔ اس کو پہلی حدیث سے ملائے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے

وہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر کبر جس کے دل میں ہے جنت میں نہ جائے گا۔ یہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر بھی ایمان جس کے دل میں ہے جنت میں جائے گا اس سے صاف یہ بات نکلتی ہے کہ ذرہ بھر کبر بھی کسی دل میں ہے اس میں ذرہ بھر ایمان نہیں ہو سکتا اور ذرہ بھر ایمان جس دل میں ہے اس میں ذرہ بھر کبر نہیں ہو سکتا دونوں میں بالکل تقیہیں ہیں۔ گو اس کی توجیہ یہ ہے کہ جنت میں جانے کے وقت ذرہ بھر کبر نہ ہوگا لیکن آخر اس سے بھی تو اس صفت کا مفاد ایمان کسی درجے میں ہونا ثابت ہوا سمجھ لو کہ کبر کس قدر سخت معصیت ہے اور ہونا ہی چاہیے کیونکہ سب سے بڑا گناہ کفر ہے اور کبر خود اس کی بھی اصل ہے اور کفر اس کی فرع تو مسلمان کو چاہیے غور کیا کرے کہ اس کے دل میں کبر ہے یا نہیں۔

تکبر کا علاج

حق تعالیٰ نے ایک ایسا علاج اس کا بتایا کہ جب اس کو متحضر رکھا جائے تو نہ چھوٹا گناہ ہو نہ بڑا۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کی ایک صفت ولہ الکبریاء فی السموات والارض (اور اسی کو آسمانوں اور زمین میں بڑائی حاصل ہے) کو یاد رکھو گے تو گناہ خود بخود تم سے چھوٹ جائیں گے۔ یہ اصل کل ہے تمام گناہوں سے حفاظت کی اور جب صفات کبر یا مختص ہوئی ذات باری کے ساتھ تو نفس کے واسطے کیا رہ گیا تذلل جو اصل ہے تمام عبادات کی جس شخص نے صفت کبر یا کو مختص مان لیا حق تعالیٰ کے ساتھ اس نے حق تعالیٰ کو بھی پہچان لیا اور نفس کا بھی اس سے بڑھ کر کوئی عالم یا محقق نہیں ہو سکتا عقل مند لوگ یہی ہیں۔

وهو العزيز الحكيم. (یعنی وہ غالب اور صاحب حکمت ہے) سے موکد کیا ان کو چونکانے کے لئے جو اس مفسدے سے کسی طرح بچتے ہی نہیں اور اپنے طبیب پر ان کی نظر ہی نہیں جب ان کو سمجھانے اور بھلائی سوجھانے سے اثر نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں عزیز یعنی غالب بھی ہوں اگر تم کہنا نہ مانو گے تو میرے ہاتھ سے کہیں جا نہیں سکتے۔ جیسی چاہے سزا دوں گا۔

اور اگر کسی برے عمل پر فوراً سزا نہ ملے تو مطمئن مت ہو جاؤ میں حکیم بھی ہوں کسی مصلحت سے مہلت دیتا ہوں اول تو دنیا ہی میں سزا ملے گی اور اگر دنیا میں کسی مصلحت اور حکمت سے ٹل ہی گئی تو آخرت تو درالجزاء ہے ہی۔ وہاں کی سزا اور زیادہ سخت ہے۔

سُورَةُ الْاِحْقَافِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يَقَوْمَنَا اَجِبُوا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ

وَيُجْرِكُمْ مِّنْ عَذَابِ الْاَلِيْمِ ۝

ترجمہ: اے قوم اللہ کی طرف بلائے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دیں گے اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھیں گے۔

تفسیری نکات

شان نزول

یہ ایک آیت ہے سورہ احقاف کی اور یہ قول نقل کیا گیا ہے بعض جنوں سے جس کا قصہ شان نزول سے معلوم ہوتا ہے اور یہ آیت مکی ہے ہجرت سے قبل یہ واقعہ ہوا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے جو قرآن شروع کیا تو ادھر سے جن گزر رہے تھے۔ انہوں نے اس کو سنا اور چلے گئے۔ مگر اس دفعہ مکالمت (بات چیت کرنے) سے مشرف نہیں ہوئے۔ ہاں دوسری بار مکالمت سے بھی مشرف ہوئے ہیں۔ اس دفعہ صرف قرآن سن کر لوٹ گئے اور اپنی قوم کے پاس جا کر قرآن کی تعریف کی اور اس پر ایمان لانے کی رغبت دلائی۔ سو اس موقع کی یہ ایک آیت ہے اور ان جنوں کا مقولہ ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے جا کر کہا ہے گویا میں یہ جنوں کا مقولہ ہے۔ لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ جس بات کو نقل کر کے اس پر حق تعالیٰ انکار نہ فرمائیں تو وہ درحقیقت انہیں کا فرمان ہوتا ہے کیونکہ جب نقل کر کے انکار نہیں کیا تو اس کو صحیح سمجھا تو ایسا ہوا جیسے مفتی فتویٰ لکھے اور کوئی دوسرا لکھ دے الجواب صحیح (جواب درست ہے) تو وہ اس فتویٰ کا مصدق بھی ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ فتویٰ لکھنے والا

ایک نوآ موز شاگرد ہو اور اصل میں یہاں یہی مثال ہے کہ فتویٰ لکھنے والا ہو ایک نوآ موز شاگرد اور مصدق (تصدیق کرنے والا) ہو استاد کیونکہ پہلی صورت میں جہاں مفتی شاگرد مصدق (تصدیق کرنے والا) استاد نہیں ہے وہاں تو بعض دفعہ اصل مجیب (جواب لکھنے والا) زیادہ ہوتا ہے مصدق سے مگر اس صورت میں کہ مفتی نوآ موز شاگرد ہے جواب دینے والا اصل میں کچھ نہیں کیونکہ وہ خود اس میں متردد ہے۔ استاد کو اس لئے دکھلاتا ہے تاکہ اس کی صحت پر اطمینان ہو جائے تو جب اس نے استاد کو دکھلایا اور استاد نے اس پر صاد بنا دیا تو اب اس کو اطمینان ہو گیا تو وہ حقیقت میں استاد کا مضمون ہے کیونکہ جس شان کا یہ مضمون اب استاد کے صاد بنانے پر ہو گیا ہے پہلے اس شان کا نہ تھا کیونکہ اب یہ حجت ہے اور اس سے پہلے حجت نہ تھا تو جب حجت کی حیثیت سے دیکھا جاوے گا تو وہ فتویٰ استاد کا کہا جاوے گا نہ کہ شاگرد کا تو اسی طرح جب حق سبحانہ و تعالیٰ کسی کا کلام نقل فرمادیں خاص کر ایسے کلام جو کہ فی نفسہ حجت نہ ہو جیسے کسی غیر کا کلام اور نقل کر کے پھر اس کی تصدیق فرمادیں تو وہ کلام حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کا کہا جاوے گا اور کسی کلام کو نقل فرما کر سکوت کرنا یہ اس کی تصدیق ہی کرنا ہے۔

تفسیر آیت کی

غرض وہ جن قرآن سن کر اپنی قوم کے پاس گئے اور جا کر وہ مقولہ کہا جو یہاں مذکور ہے۔ اور اب وہ ارشاد ہو گیا خدا تعالیٰ کا تو فرماتے ہیں کہ کہنا منو خدا کی طرف سے پکارنے والے کا آگے اجیبوا (کہنا مانو) کی تفسیر ہے۔ کہ امنوا بہ تصدیق کرو آپ کی یہ نہیں کہ زبان سے کہہ لیا کہ ہاں صاحب اور آگے کچھ بھی نہیں بہت سے لوگوں کی اجابت اسی قسم کی ہوتی ہے کہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن جب احکام سنے تو ہٹنے لگے اس لئے کہتے ہیں کہ آمنوا بہ کہ دل سے مانو اگر ایسا کرو گے تو کیا شمرہ ملے گا۔ یہ ملے گا کہ یغفر لکم من ذنوبکم۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دیں گے۔ ویجرکم من عذاب الیم۔ اور تم کو دردناک عذاب سے پناہ دیں گے۔

ارشاد ہے۔ اجیبوا داعی اللہ و امنوا بہ۔ (یعنی کہنا مانو اللہ کے منادی کا اور اللہ کے ساتھ ایمان لاؤ تو امنوا یہ تفسیر ہے کہ اللہ کے ساتھ ایمان لاؤ اور امنوا بہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ داعی پر ایمان لاؤ اور یہ معنی زیادہ چسپاں ہیں کیونکہ وہ جن یہودی تھے حق تعالیٰ کے ساتھ پہلے ہی سے ایمان رکھتے تھے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تھے۔ اس لئے ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو کہا گیا۔

ایمان کے لئے عمل صالح لازم ہے

اور ایک بات یہ بھی سمجھ لینے کی ہے کہ امنوبہ کے ساتھ و اعملوا صالحاً (اور نیک کام کرو) کیوں نہیں فرمایا یہاں سے تو گویا سہارا ملے بعض کو کہ ایمان کافی ہے اعمال صالحہ کی کوئی ضرورت نہیں تو سمجھو کہ اس کے ذکر نہ کرنے سے یہ بتلانا ہے کہ عمل صالح تو ایمان کے لئے لازم غیر منفک (جدا نہیں) ہے کہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں دیکھو اگر حاکم کہے کہ رعیت نامہ داخل کر دو تو اس کہنے کی ضرورت نہیں کہ قانون پر عمل بھی کرنا میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی شخص نے قاضی کے کہنے سے کہا کہ میں نے اس عورت کو قبول کیا کچھ دنوں تک تو دعوتیں ہوتی رہیں اس لئے کسی چیز کی ضرورت نہ ہوئی لیکن دو چار روز کے بعد نمک لکڑی کی ضرورت ہوئی تو بیوی نے فرمائش کرنی شروع کیں۔ اب وہ گھبرایا اور پہلو تہی کرنی شروع کی جب بیوی نے بہت دق کیا تو کہنے لگا سنو بیوی میں نے صرف تمہیں قبول کیا تھا نمک لکڑی کو قبول نہیں کیا تھا۔ تو اگر آپ کے سامنے اس کا فیصلہ آوے تو آپ فیصلہ میں کیا کہیں گے ظاہر ہے کہ بیوی کا قبول کرنا ان سب چیزوں کا قبول کرنا ہے تو اسی طرح ایمان لانا سب چیزوں کا قبول کرنا ہے اس لئے امنوا بہ (اس پر ایمان لاؤ) کہنا کافی ہو گیا اور و اعملوا صالحاً۔ (اور نیک کام کرو) کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ جو خدا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مانے گا اس کو سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ آگے اس کا ثمرہ مرتب کرتے ہیں کہ یغفر لکم من ذنوبکم۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے اس آیت میں من یا تو ابتداء یہ ہے کہ گناہوں سے مغفرت شروع ہوگی اور اس میں اشارہ ہے کہ اتصال ہوگا یعنی ایک سرے سے گناہ معاف ہوتے چلے جائیں گے یا من تبعیضیہ ہو کہ جن گناہوں کا اب تدارک نہیں ہو سکتا مثلاً شراب خواری وغیرہ وہ معاف ہو جائیں گے۔ باقی جن کا تدارک ہو سکتا ہے وہ معاف نہیں ہوں گے جیسے کہ مثلاً ایک شخص نے کسی سے ہزار روپے چھین لئے اور اگلے دن ہو گئے مسلمان تو وہ روپیہ ادا کرنا پڑے گا۔ معاف نہیں ہوگا۔ اب میری تقریر سے یہ اشکال جاتا رہا کہ کیا نرے ایمان پر گناہ معاف ہو جائیں گے کیونکہ معلوم ہو گیا کہ ایمان کے لئے عمل لازم ہے اور یہ بھی ایک جواب ہے کہ صرف ایمان پر بھی کبھی نہ کبھی تو مغفرت ہوگی۔ گو دخول نار کے بعد ہی سہی مگر یہ طالب علمانہ جواب ہے آگے فرماتے ہیں۔ ویجرکم من عذاب الیم۔ (اور دردناک عذاب سے تم کو محفوظ رکھیں گے) اگر ایمان کیساتھ عمل صالح بھی کیا جاوے تو عذاب الیم سے عذاب مطلق مراد ہوگا کہ ہر طرح کے عذاب سے پناہ دیں گے اور اگر نرا ایمان لیا جاوے اور اس کے ساتھ عمل صالح نہ ہو تو عذاب سے مراد عذاب مٹلہ ہوگا کہ ہمیشہ عذاب نہیں ہوگا۔ یہ تو آیت کی تفسیر ہو گئی اب اس آیت کے متعلق ایک مسئلہ بھی بیان کرتا ہوں وہ یہ

کہ یہاں جنوں کا مکالمہ ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جنوں کا وجود ہے آج کل اس میں بھی اختلاف ہے اور اختلاف ایسا عام ہو گیا ہے کہ ہر چیز میں اختلاف ہے جیسے ایک مولوی صاحب کے شاگرد بد استعداد تھے۔ جب وہ کتابیں ختم کر کے جانے لگے تو استاد سے کہنے لگے کہ مجھے کچھ آتا جاتا تو ہے نہیں لوگ۔ مجھ سے مسئلہ پوچھیں گے تو میں کیا بتلاؤں گا۔ استاد نے کہا کہ تم یہ کہہ دیا کرنا کہ اس میں اختلاف ہے غرض یہ کہ جب وہ وطن پہنچے تو انہوں نے یہی طرز اختیار کیا کہ جو شخص ان سے کوئی مسئلہ پوچھتا وہ یہی کہہ دیتے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے لوگ ان کے بڑے معتقد ہوئے کہ یہ بہت وسیع النظر ہیں۔ آخر ایک شخص یہ راز سمجھ گیا اس نے کہا کہ لا الہ الا اللہ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ انہیں تو وہی ایک جواب یاد تھا کہنے لگے اس میں اختلاف ہے۔ بس لوگ سمجھ گئے کہ انہیں کچھ نہیں آتا۔ سو اس وقت تو یہ بات ہنسی کی تھی مگر آج سچی ہو گئی۔ لا الہ الا اللہ میں بھی اختلاف ہے خدا تعالیٰ تو کہیں کہ جن ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں اور بناء انکار کی کیا ہے محض یہ کہ ہم نے نہیں دیکھے۔ میں کہتا ہوں کہ جب تک ہم نے امریکہ نہ دیکھا تھا کیا اس وقت امریکہ معدوم تھا یا غیر معلوم تھا سو معدوم تو نہ تھا تو اگر آدمی کسی چیز کو نہ دیکھے تو اس کا نہ دیکھنا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ موجود نہیں تو اگر حق تعالیٰ جنوں کی خبر نہ دیتے تو بھی محض غیر مرئی ہونے پر انکار کی گنجائش نہ تھی۔ دیکھئے مادہ کو کسی نے دیکھا نہیں اور پھر مانتے ہیں اور لطف یہ کہ مادہ کو خالی عن الصورة مان کر قدیم مانا ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اس کو دیکھا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ محض دلیل سے قائل ہوئے ہیں۔ گو وہ دلیل بھی لچر ہے تو اگر ہم خدا کے فرمانے سے کسی چیز کے قائل ہوں تو کیا حرج ہے ایک اور بات کہتا چلوں کہ جنوں کے ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ہر بیماری بھی جن ہیں آج کل جہاں کوئی بیماری ہوتی ہے بس لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جن کا اثر ہے۔ اگر یہ خیال ہو کہ جن انسان کے دشمن ہیں۔ اس کے اثر سے کیا تعجب ہے تو سمجھ کہ اگر دشمن ہیں تو ہوا کریں۔ خدا تعالیٰ حافظ ہیں فرماتے ہیں۔

لہ معقبات من بین یدیه ومن خلفہ یحفظونہ من امر اللہ۔ (واسطے ان کے فرشتے ہیں یکے بعد دیگرے حفاظت کرنے والے بندہ کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے حفاظت کرتے ہیں اس کی اللہ تعالیٰ کے حکم سے) پس اگر وہ ضرر پہنچانا بھی چاہیں تو خدا تعالیٰ حفاظت کرتے ہیں ان کی حفاظت عبث نہیں۔

سُورَةُ مُحَمَّدٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَشِدُّ الْوَثَاقِ فَاِمَّا مَنَابِعِدُ وَاِمَّا فِدَاءٌ

ترجمہ: تو خوب مضبوط باندھ لو پھر اسکے بعد یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا۔

تفسیری نکات

مانعة الخلو کی حقیقت

چنانچہ ایک نیچری مفسر نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن میں غلامی کے مسئلہ کا ثبوت نہیں ہے بلکہ ایک آیت سے تو اس کی نفی ہوتی ہے اور وہ آیت ہے۔ فشدوا الوثاق فاما منا بعد و اما فداء اس سے پہلے جہاد کا ذکر ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

فاذالقيتم الذين كفروا فاضرب الرقاب

پس جب تم کفار کے مقابل ہو تو ان کی گردنیں مارو (یعنی قتل کرو) یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خونریزی کر چکو تو (تم کو دو اختیار ہیں) یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا جو کہ احسان ہے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا اس سے اس نئے مفسر نے یہ استدلال کیا کہ اس آیت میں بطور حصر کے دو باتیں مذکور ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ تیسری صورت (یعنی غلام بنانا) جائز نہیں۔

اس تقریر سے ایک عالم کوشبہ پڑ گیا۔ اس کا جواب ایک دوسرے عالم نے ان کو یہ دیا کہ پہلے آپ یہ بتلائیں کہ یہ قضیہ کون سا ہے حملیہ یا شرطیہ اور شرطیہ ہے تو متصلہ یا منفصلہ اور منفصلہ ہے تو حقیقیہ یا مانعہ الجمع یا مانعہ الخلو۔ بس اتنی بات میں سارے اشکال کو درہم برہم کر دیا۔ کیونکہ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ یہ قضیہ ممکن ہے کہ مانعہ الجمع ہو۔ یعنی ان دونوں کا جمع کرنا ممنوع ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں صورتیں مرتفع ہوں اور تیسری

کوئی اور صورت ہو کیونکہ مانعہ الجمع کا حکم یہی ہے کہ ان کا اجتماع جائز نہیں ہوتا۔ اور دونوں کا ارتقا ممکن ہے۔ مثلاً دور سے کسی چیز کو دیکھ کر ہم یہ کہیں کہ یہ چیز یا تو درخت ہے یا آدمی ہے اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان دونوں کا اجتماع تو ناممکن ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ نہ درخت ہو نہ آدمی ہو بلکہ کوئی تیسری چیز ہو گھوڑا بیل وغیرہ۔ اسی طرح اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے کہ من و فداء دونوں کا جمع کر ممتنع ہے۔ البتہ دونوں سے خلو ممکن ہے۔ تو اب اس سے غلامی کی نفی کیوں کر ہوئی۔ سو دیکھئے جو شخص مانعہ الجمع و مانعہ الخلو کی حقیقت نہ جانتا ہو وہ نہ اس اشکال کو دور کر سکتا ہے اور نہ جواب کو سمجھ سکتا ہے۔

إِنْ يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا

ترجمہ: اگر تم سے تمہارے مال طلب کرے پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو۔

تفسیری نکات

چندہ لینے میں عدم احتیاط

آج کل چندہ کے بارے میں بہت ہی کم احتیاط ہے حتیٰ کہ قریب قریب تمام مدارس میں بھی اس باب میں احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا ہے میں اس معاملہ میں سخت ہوں اور زیادہ بے احتیاطی یہ ہے کہ جو فرداً فرداً چندہ کی تحریک کی جاتی ہے اس سے دوسرے پر بار ہوتا ہے۔ گرانی ہوتی ہے نیز نہ دینے پر بخل بھی ثابت ہوتا ہے جس کا حاصل ایک مسلمان کو مہتمم کرنا ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں ہیں جو تحریک عام اور تحریک خاص میں امتیاز کرتا ہوں اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک مسلمان پر بار نہ ہو گرانی نہ ہو اور وہ بدنام نہ ہو دعوت عام اور چیز ہے اور انفرادی صورت میں کسی سے سوال کرنا اور چیز ہے مجھ کو تجربہ ہے کہ لوگوں کی حالت معلوم ہے اس تحریک خاص کا اثر ظہور بخل قرآن مجید میں بھی مذکور ہے۔ ان یسئلکم وہا فیحفکم تبخلوا کیونکہ احناف والحناف خطاب خاص ہی میں ہو سکتا ہے اور اس کے بعد خطاب عام کا اس عنوان سے ذکر ہے۔ ہانتہم ہولاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ یہ دعوت خطاب عام ہے اور اسی فرق کی وجہ سے احناف پر جو بخل ہو اس میں نکیر نہیں فرمایا گیا کہ معذور ہے اور دعوت پر جو بخل ہو اس پر نکیر فرمایا گیا۔ فمنکم من یبخل و من یبخل فانما یبخل عن نفسه الایۃ میں نے میرٹھ کے ایک وعظ میں اس فرق کو بیان کیا تھا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی اس بیان میں شریک تھے۔ وعظ کے بعد خوش ہو کر فرمایا کہ آج آیت کے معنی معلوم ہوئے یہ ان کی تواضع و محبت تھی مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ میں اس کو اس وقت سے جانتا ہوں کہ یہ مجھ کو نہ جانتا تھا مجھ سے بڑی محبت فرماتے تھے اور حضرت صاحب میرے پاس ہے ہی کیا بس یہ ہی ایک چیز ہے یعنی اللہ والوں کی محبت مولانا نہایت سادہ تھے کوئی بناوٹ نہ تھی۔

وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ تو کسی کا محتاج نہیں اور تم سب محتاج ہو۔

تفسیری نکات

غنی کا ترجمہ بے پروا نہیں

فرمایا کہ مجالس تعزیت میں یہ بات دیکھی ہوگی کہ بعض لوگ جو جوان مر جاتے ہیں اس کی تعزیت میں عام طور پر اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہائے جوان مر گیا چھوٹے چھوٹے بچے رہ گئے۔ ابھی عمر ہی کیا تھی۔ ہاں جی اللہ کی ذات بڑی بے پروا ہے۔ سو یہ لفظ بے پروا کا نہایت ثقیل ہے۔ یہاں غنی کا ترجمہ نہیں کہ یہ صفت تو منصوص ہے بلکہ یہ بے انتظام کے معنی میں ہے۔ یہ جملہ بڑے بڑے ثقہ لوگوں کی زبان پر ہے واللہ الغنی و انتم الفقراء کے معنی تو یہ ہے کہ ان کو کسی کی طرف احتیاج نہیں اور ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم ولا یرضی لعبادہ الکفر اور من جاہد فانما یجاہد لنفسہ ان اللہ لغنی عن العالمین میں یہ معنی ہیں کہ کسی کو کفر و طاعت سے نہ ان کا کوئی ضرر ہے نہ نفع مگر ان اہل تعزیت کی یہ مراد ہرگز نہیں ان کلمات سے سخت احتیاط چاہیے۔ ممکن بلکہ امید ہے کہ جہل کے سبب معافی ہو جاوے لیکن اگر مواخذہ ہونے لگے تو استحقاق ہے۔ عارفین پر تو بعید دالتوں پر مواخذہ ہو گیا ہے۔ ایک بزرگ نے یاس کے بعد بارش ہونے پر یہ کہہ دیا تھا کہ آج کیا اچھے موقع پر بارش ہوئی فوراً مواخذہ ہوا کہ بے ادب یہ بتلا کہ بے موقع کب ہوئی تھی۔ یہ ایسا ہے کہ کسی ماہر استاد سے کہو کہ آج کھانا بہت اچھا پکا ہے کیا یہ مطلب نہیں سمجھا جائے گا کہ پہلے اچھا نہ پکا تھا اور میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ان اقوال میں تو کچھ قریب یا بعید سوء ادب بھی ہے بندہ کا حق یہ ہے کہ جو خالص طاعت بھی ہو اس میں بھی لرزان ترسان رہے ناز نہ کرے کیونکہ وہ بھی ان کے شانِ عظیم کے لائق تو نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اپنے کسی عمل یا اپنی کسی حالت پر ناز نہ کرو۔ نیاز پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ اسی میں خیر ہے اور ایسے ہی ناز کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

چون نداری گرد بدخویٰ مگرد

ناز را روئے بباید ہچو ورد

ایک عورت بد شکل مگر اس بد شکل میں ایک ایسی ادا ہے کہ خاوند کو وہ محبوب ہے تو اس کی وجہ سے اس عورت کا حسن اس کی نظر میں خاک اور گرد ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بعض بندوں میں کوئی ایسی خداداد صفت ہوتی

ہے جس کی وجہ سے اس کے سامنے دوسروں کے کمالات گرد ہوتے ہیں اس لئے کسی کی کسی کی کو دیکھ کر اس کو ناقص اور اپنے کو کامل سمجھنا غلطی ہے ممکن ہے اس کا نقص عارضی ہو اسی طرح تمہارا کمال اس عارض کے ارتفاع کے بعد عکس کا ظہور ہو جاوے گا تو حتمی فیصلہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔

اور کیا کوئی ناز کر سکتا ہے ہمارے اعمال کی حقیقت ہی کیا ہے کہ جس پر ناز کرے اور غور کیا جاوے تو ہم ہر وقت ہی خطاوار ہیں مگر ان کا عفو غالب ہے اس لئے محفوظ ہیں بعض دفعہ تنبیہ بھی فرمادیتے ہیں۔ اور یہ بھی رحمت ہے چنانچہ ایک عارف کی زبان سے کوئی کلمہ نامناسب نکل گیا اس وقت تو مواخذہ نہ ہوا مگر کچھ روز کے بعد اس مواخذہ کا اس طرح ظہور ہوا کہ کلمہ طیبہ کا ذکر کرنا چاہا مگر زبان سے نہ نکلتا تھا۔ بہت پریشان ہوئے دعا کی ارشاد ہوا کہ فلاں وقت فلاں کلمہ تمہاری زبان سے نکلا تھا تم نے اب تک تو یہ نہیں کی بہت ڈھیل دی آج پکڑ ہے ہمارا ذکر زبان سے نہیں کر سکتے تب تو یہ کی تب معافی ظاہر ہوئی۔ (الاقاضات الیومیہ ج ۷ ص ۲۰۲-۲۰۳)

وَإِنْ تَوَلَّوْا يَسْتَبَدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۝۴

ترجمہ: اور اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا جو تم جیسے نہ ہونگے۔

تفسیری نکات

ان یسئلکونہا فی حفاکم تبخلوا ویخرج اضغانکم۔ اگر تم سے تمہارے مال طلب کریں۔ پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اور اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری ظاہر کر دے۔ یہ سوال کرنے کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر خدا تعالیٰ تم سے مانگنے لگے اور مبالغہ سے مانگے تو تم بخل کرنے لگو اور وہ تمہارے کہنے کو ظاہر کر دے آگے فرماتے ہیں۔

هانتم هؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ فممنکم من یبخل ومن یبخل فانما یبخل عن نفسه واللہ الغنی وانتم الفقراء وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یكونوا امثالکم دیکھے سوال کی توفی کرتے ہیں اور دعوت الی الانفاق کا اثبات فرماتے ہیں اور سوال کرنے پر بخل کرنے میں زیادہ مذمت نہیں کرتے ہیں بلکہ ایک گونہ اس میں معذور رکھتے ہیں۔ چنانچہ فی حفاکم تبخلوا میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور دعوت الی الانفاق میں بخل کرنے کی مذمت فرماتے ہیں کہ۔
من یبخل فانما یبخل عن نفسه۔ جو شخص بخل کرتا ہے وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ

ان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یكونوا امثالکم۔ اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ

تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

کہ اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری بجائے دوسری کسی قوم کو پیدا کر دے گا۔ جو کہ تمہاری طرح بخیل اور جان چرانے والے نہ ہوں گے اور تم سے ہر طرح افضل ہوں گے۔ دیکھئے ترغیب پر بخل کرنے سے کس قدر دھمکایا ہے کہ تمہاری تان گاڑی نہیں چلتی دوسرے بھی ہزاروں خدمت گزار موجود ہیں۔

منت منہ کی خدمت سلطان ہی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت
بادشاہ کی خدمت کر کے احسان نہ جتلاؤ کہ ہم نے خدمت کر دی اس کے احسان مند ہو کہ اس نے تم سے خدمت لے لی۔

خدا تعالیٰ ہی کا ہم پر احسان ہے کہ ہم سے یہ کام لے لیا۔ تو اس آیت میں خدا تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ سوال اور چیز ہے اور وہ کیا ہے کہ جس میں اخفاء ہو اور اخفاء دو قسم کا ہے ایک صورتی دوسرا معنوی جیسے وجاہت سے وصول کرنا کہ یہ بھی اخفاء کی ایک فرد ہے۔ غرض جس میں ایلام قلب ہو وہ اخفاء ہے اور اس پر تبخلوا کا ترتب کچھ بعید نہیں ایک ہے ترغیب اس میں بخل کرنا مذموم ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو صورتیں تفسیر شروع ہیں وہ تو سوال میں داخل ہیں اور جو شروع ہیں وہ ترغیب ہیں غرض میں آپ لوگوں کو ترغیب دیتا ہوں۔

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل چندہ کے بارے میں بہت ہی کم احتیاط ہے حتیٰ کہ قریب قریب تمام مدارس میں بھی اس باب میں احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا میں اس معاملہ میں سخت ہوں اور زیادہ بے احتیاطی یہ ہے کہ جو فرد افراد چندہ کی تحریک کی جاتی ہے اس سے دوسرے پر بار ہوتا ہے گرانی ہوتی ہے نیز نہ دینے پر بخل بھی ثابت ہوتا ہے جس کا حاصل ایک مسلمان کو ہتم کرنا ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں میں جو تحریک عام اور تحریک خاص میں امتیاز کرتا ہوں اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک مسلمان پر بار نہ ہو گرانی نہ ہو اور وہ بدنام نہ ہو۔ دعوت عام اور چیز ہے اور انفرادی صورت میں کسی سے سوال کرنا اور چیز ہے مجھ کو تجربہ ہے لوگوں کی حالت معلوم ہے اس تحریک خاص کا اثر ظہور بخل قرآن مجید میں بھی مذکور ہے۔ ان یسئلکم وہا فی حکم تبخلوا الایۃ کیونکہ اخفاء والحقاف خطاب خاص ہی میں ہو سکتا ہے اور اس کے بعد خطاب عام کا اس عنوان سے ذکر ہے ہانتہم ہولاء تدعون لتفقوا فی سبیل اللہ یہ دعوت خطاب عام کا اس عنوان سے ذکر ہے ہانتہم ہولاء تدعون لتفقوا فی سبیل اللہ۔ یہ دعوت خطاب عام ہے اور اسی فرق کی وجہ سے اخفاء پر جو بخل ہو اس میں نکیر نہیں فرمایا گیا کہ معذور ہے اور دعوت پر جو بخل ہو اس پر نکیر فرمایا گیا۔ فمنکم من یبخل ومن یبخل فانما یبخل عن نفسه الایۃ۔ میں نے میرٹھ کے ایک وعظ میں اس فرق کو بیان کیا تھا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی اس بیان میں شریک تھے وعظ کے بعد خوش ہو کر فرمایا کہ آج آیت کے معنی معلوم ہوئے یہ ان کی تواضع و محبت تھی۔

سُورَةُ الْفَتْحِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ

عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝

ترجمہ: تاکہ اللہ تعالیٰ آپ (ﷺ) کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف فرمادے اور آپ (ﷺ) پر اپنے احسانات مکمل کر دے اور آپ کو سیدھے راستے پر لے چلے۔

تفسیری نکات

یہاں پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوا کرتا ہے اس کا حل کر دینا بھی جملہ معترضہ کے طور پر ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ انا فتحنا پر لیغفر لک اللہ الخ۔ کیسے مرتب ہوا۔ کہاں فتح مکہ اور کہاں مغفرت وغیرہ۔ فتح کو مغفرت وغیرہ میں کیا دخل؟ مفسرین نے مختلف اور بعید از بعید تو جہیں اس مقام کی لکھی ہیں مگر الحمد للہ میری سمجھ میں جو آیا ہے وہ بے تکلف اور دل پذیر بات ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام عرب کے لوگ اس کے منتظر تھے کہ فتح مکہ ہو تو ہم مسلمان ہوں چنانچہ فتح مکہ پر جوق در جوق اسلام لانے لگے اور لوگوں کے اسلام لانے سے حضور کے مراتب قرب بڑھتے ہیں۔ نفس تبلیغ سے تو اور طرح کا ثواب ہوتا ہے اور اس تبلیغ سے اسلام لانے کا ثواب اور نوع کا ہے۔ ورنہ تبلیغ تو تمام انبیاء نے کی ہے۔ نفس تبلیغ میں سب انبیاء برابر ہیں۔ حضور جو فخر فرمادیں گے وہ کثرت امت پر ہوگا۔ فتح مکہ سبب ہے اسلام لانے کا اور اسلام لانا لوگوں کا سبب ہے آپ کی زیارت قرب کا اور زیارت قرب سبب ہے لیغفر لک اللہ (الی) ینصرک اللہ کا اور سبب کا سبب یا سبب اسبب کا سبب اس سبب کا بھی سبب ہوتا ہے پس فتح مکہ کو مغفرت وغیرہ میں اس طرح دخل ہوا اور ترتیب بے تکلف درست ہو گیا۔ دیکھئے یہاں بھی قرآن کے فہم کے لئے علوم عقلیہ کی ضرورت ثابت ہوتی ہے خلاصہ یہ ہوا کہ جن علوم

کے قفل بے کھلے رہ گئے تھے اگر آپ کا اتباع کرو گے تو وہ علوم کے قفل تم پر کھل جائیں گے۔

بنی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا
اوشفیع ایں جہاں و آن جہاں ایں جہاد در دین آنجا در جنا

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا غلبہ خوف خداوندی

فرمایا کہ کسی نے دریافت کیا کہ لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ سے گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ فرمایا معاً قلب میں جواب میں یہ بات آئی کہ جب کوئی شخص نہایت خائف ہوتا ہے۔ تو وہ ڈر کر کہا کرتا ہے کہ مجھ سے جو قصور ہو گیا ہو معاف کر دیجئے حالانکہ اس سے کوئی گناہ نہیں ہوا ہوتا۔ اس طرح دوسرا اس کی تسلی کے لئے کہہ دیتا ہے۔ کہ اچھا ہم نے تمہارا قصور سب معاف کیا اسی طرح چونکہ اس خیال سے آپ کو غم رہا کرتا تھا۔ حق تعالیٰ نے تسلی فرمادی۔

آیت برائے تسلی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک و ما تاخر اس میں ایک تو یہ بحث ہے کہ ذنب کا اطلاق کیا گیا۔ صاحب نبوت کے حق میں جو کہ معصوم ہے یہ بحث جدا گانہ ہے اس کو مسئلہ مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پر مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ پہلے گناہوں کی معافی تو سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن پچھلے گناہوں کی معافی جو ابھی تک ہوئے ہی نہیں۔ کیا معنی۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ خوف و خشیت کا غلبہ تھا اگر آپ کو آئندہ گناہوں کی معافی دے کر تسلی نہ دی جاتی تو اندیشہ تھا کہ غلبہ خوف سے اسی فکر میں آپ پریشان رہتے کہ کہیں آئندہ امر خلاف مرضی نہ ہو جائے۔ اس لئے آپ کو آئندہ کے لئے بھی مطمئن کر دیا گیا۔ دوسری آیت اس کی موید یہ ہے کہ حق جل و علی سلیمان علیہ السلام کو فرماتے ہیں کہ ہذا عطاء نافع من او امسک بغیر حساب۔ اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ بغیر حساب کو عطاء نا کے متعلق کیا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ عطا بے حساب ہے یعنی کثرت سے ہے اور دوسرا احتمال اور وہ بہت مرجع معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ بغیر حساب کو فائز اور امسک دونوں کے متعلق کیا جائے اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ آپ پر دینے اور روک دینے میں کوئی حساب متعلق کیا جائے اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ آپ پر دینے اور روک رکھنے میں کوئی حساب اور مواخذہ نہیں۔ چونکہ سلیمان علیہ السلام کو بوجہ غلبہ خوف کے ہر اعطاء و امساک میں یہ خیال رہتا کہ شاید یہ اعطاء یا امساک بر محل ہوا ہے یا نہیں۔ کہیں دینے میں اسراف یا امساک میں بخل نہ ہو گیا ہو اور یہ خلیجان مانع حضور خاص تھا تو اس لئے سلیمان علیہ السلام کو مطمئن کر دیا کہ اعطاء

اساک میں مطلقاً آپ سے کچھ مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ آپ اس کی فکر نہ کریں اور اصل کام میں لگے رہیں۔ مگر ایسے ارشادات اہل خوف کیلئے ہیں کیونکہ ان سے خلاف امر اور عصیان کا صدور ہی مستبعد ہے۔ اب اس سے زیادہ خوف ان کے حق میں مضر ہے۔ اس لئے ان کو اطمینان دلایا جاتا ہے۔

بشارت فتح

اسی لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اول یہ فرمایا گیا کہ لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تاخر اہل ظاہر کو ما قبل سے اس کا ربط سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اوپر فرمایا ہے انا فتحنا لک فتحا مبینا۔ ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی ہے اور نمایاں کامیابی دی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیں تو اہل ظاہر یہاں چکرا جاتے ہیں کہ بشارت فتح سے مغفرت کا کیا جوڑ ہے مگر عشاق نے اس کا ربط سمجھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اصل میں تو فتح کے مضمون پر اتمام نعمت اور ہدایت و استقامت و نصرت و غلبہ کو متفرع کرنا مقصود تھا مگر چونکہ ان چیزوں کا مزہ حضور ﷺ کو اسی وقت آسکتا تھا جبکہ پہلے یہ تسلی کر دی جائے کہ حق تعالیٰ آپ سے راضی بھی ہیں اسی لئے ان بشارات کی لذت کامل کرنے کے لئے پہلے لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک و ماتاخر۔ فرمایا گیا اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مذاق عشق غالب تھا آپ کو سب سے پہلے اس کی فکر رہتی تھی کہ محبوب راضی بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے اول اس کا اطمینان دلا کر پھر دوسری بشارتوں کو بیان کیا گیا۔ ویتم نعمتہ علیک و یهدیک صراطاً مستقیماً و ینصرک اللہ نصراً عزیزاً۔ کہ اس فتح سے آپ پر نعمت کا کام تمام کرنا مقصود ہے اور آپ کو صراط مستقیم پر پہنچانا اور نصرت الہی کے ساتھ (مخالفین پر) پورا غلبہ دینا منظور ہے۔

لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک و ماتاخر تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیں۔

عاشقانہ نکتہ

یہاں ایک عاشقانہ نکتہ ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا اطلاق کیا گیا۔ حالانکہ واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ذنب سے پاک ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مجھ سے کچھ گناہ ہو گیا ہو۔ تو اس شبہ کو بھی رفع فرما دیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے عاشق اپنے محبوب سے رخصت ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میری خطا معاف کر دیجئے گا۔ حالانکہ عاشق سے خطا کا احتمال کہاں۔ خصوصاً ایسا عاشق جو عشق کے ساتھ عقل بھی کامل رکھتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے۔

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ

ترجمہ: ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔

طاعت بڑی چیز ہے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ طاعت بڑی چیز ہے اس کے آثار چہرہ تک پر ظاہر ہونے لگتے ہیں اس سے ایک قسم کی ملاحظہ اور نور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی نیک بین باشی اگر اہل دلی
خوب ترجمہ کیا ہے

مرد حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور
سیمامہم فی وجوہہم من اثر السجود کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ بخلاف نافرمانی کے کہ اس سے چہرہ
پر ظلمت اور وحشت برسنے لگتی ہے۔ ظاہری حسن اور جمال کو بھی خاک میں ملا دیتی ہے اور باطن کو اس قدر خراب
اور برباد کرتی ہے کہ قریب قریب باطن تو مردہ ہی ہو جاتا ہے حدیث میں ہے کہ معصیت سے دل پر ایک سیاہ دھبہ
پیدا ہوتا ہے اگر توبہ نہ کی تو وہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ سارے قلب کو گھیر لیتا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

ہر گناہ زنگے است بر مراۃ دل دل شود زیں زنگ ہا خوار و خجل
چون زیادت گشت دل را تیرگی نفس دون را پیش گرد و خیرگی

خط کا جواب

قال اللہ تعالیٰ فاؤلئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء
والصالحین یہ آیت نص ہے ان سب طبقات کی تعداد و تکرار میں۔ مگر دوسری نص قطعی سے نبوت کا ختم ثابت
ہے اور دوسرے طبقات کا ختم ثابت نہیں پس وہ عام ہوگا اس امت اور امم سابقہ کو۔ پس اس امت میں بھی
صدیقین متعدد ہیں جیسے شہداء متعدد ہیں صالحین متعدد ہیں اس سے زیادہ سورہ حدید کی آیت اس میں نص ہے۔
والذین امنوا باللہ ورسولہ اولئک ہم الصدیقون والشہداء الخ۔ اس سے واضح ہے کہ جب تک
سلسلہ ایمان کا جاری ہے صدیقیت کا بھی جاری ہے۔ پس الصدیقین کا اس امت میں بھی کثیر ہونا ثابت ہوا۔
البتہ درجات میں تفاوت ہونا اور بات ہے۔ حضرت خلیفہ اول اعظم الصدیقین ہیں۔ حضرت امام مہدیؑ کی نسبت
تصریح تو نہیں دیکھی باقی ظاہر اوہ ضرور اس رتبہ سے مشرف ہیں اور حضرت عائشہؓ کا صدیقہ ہونا اسی اعتبار سے
ہے جس اعتبار سے اور صدیقین کا صدیق ہونا۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۹ ص ۴۱)

سُورَةُ الْحُجُرَاتِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا

تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ

لَا تَشْعُرُونَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور تم کو خبر بھی نہیں ہوگی۔

تفسیری نکات

ایذا رسول کفر ہے

لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجهروا له بالقول عرب میں بے تکلفی بہت زیادہ تھی بڑے بڑے لوگوں کے نام مینتے تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی بعض نے لیا خدا تعالیٰ نے اس تعلیم میں اس کی ممانعت فرمائی اور یہ فرمایا کہ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ تمہارے اعمال جبط نہ ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو انتم لا تشعرون۔ کے معنی میں یہ سمجھا ہوں کہ جبط ہوتا ہے ایذا سے اور ایذا ہوتی ہے ایسے شخص کی بے ادبی سے جو مؤدب سمجھا جاتا ہو اور یہ فطری قاعدہ ہے چنانچہ حکام کو دیکھو کہ دیہاتیوں سے بہت سی باتیں گوارا کر لیتے ہیں جو کہ شہریوں سے ہرگز گوارا نہیں ہو سکتیں۔ ایک دیہاتی کی حکایت ہے کہ اس نے ایک درخواست پیش کی تو کاغذ پر ٹکٹ نہیں لگایا اور جب حاکم نے اس سے کہا کہ اس پر ٹکٹ لگاؤ تو روپیہ جیب سے

نکال کر کہتا ہے لے رو پیہ بس تیری صاحبی معلوم ہوگئی اس میں سے ٹکٹ لگا لیجو جو بچے رکھ لیجو جو حاکم ہنس کر خاموش ہو گیا اور درخواست مفت لے لی بھلا کوئی شہری تو ایسا کر کے دیکھے کہ اس کی کیا گت بنتی ہے اسی کو کہتے ہیں۔

ملت عاشق زملعتہا جداست عاشقان را مذہب و ملت جداست

(عاشق کا مذہب سارے مذہبوں سے جدا ہے اور ان کا ملک سب سے الگ ہے)

گر خطا گوید در اخطایے بگو در رشود پرخوں شہیداں را مشو

(اگر وہ غلط ہے تو ان سے غلط گو مت کہو اور اگر وہ شہید ہو جائے تو اس کا خون مت دھو)

موسیا آداب دانا دیگر اند سوختہ جاں در وانا دیگر اند

(کالے بال والے اور آداب سے واقف دوسرے ہیں اور سوختہ جان اور روح والے دوسرے ہیں)

تو دیکھئے خود فرماتے ہیں کہ موسیا آداب دانا دیگر اند۔ اس لئے مولانا فرماتے ہیں کہ

با ادب تر نیست زو کس در جہاں بے ادب تر نیست زو کس در جہاں

عشاق کی قسمیں

اس کی کئی تو جیہیں ہو سکتی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض عشاق بہت با ادب ہوتے ہیں اور بعض مغلوب الحال ہوتے ہیں اور پہلوں کو فوراً تنبیہ ہوتی ہے چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ بارش پر یہ فرمایا کہ آج کیسے موقع سے بارش ہوئی ہے فوراً تنبیہ کی گئی کہ ادبے ادب! اور بے موقع کس روز ہوئی تھی سن کر ہوش اڑ گئے اور مواخذہ بالکل سچا ہے کیونکہ بے موقع کبھی بھی نہیں ہوتی تو با ادب جب بے تمیزی کرتا ہے تو بہت ناگواری ہوتی ہے اس کی اصلاح اس آیت میں فرماتے ہیں اور اس کی متعدد جگہ اصلاح فرمائی ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے۔ یایہا الذین امنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان یؤذن لکم الی طعام غیر نظیرین انہ ولكن اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا ولا مستانسیں لحدیث ان ذلکم کان یؤذی النبی فیستحی منکم واللہ لا یستحی من الحق۔ ترجمہ کا حاصل یہ ہے کہ اے مومنو تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں بجز دعوت کے ویسے مت جاؤ اور اس میں بھی پہلے سے جا کر انتظار تیاری میں مت بیٹھو بلکہ جب بلایا جاوے جاؤ اور کھاتے ہی منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں مشغول ہو کر مت بیٹھ جاؤ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا ہوتی ہے اور وہ لحاظ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کیوں شرمائے وہ تو خدا تعالیٰ ہیں۔ دیکھئے اس انداز سے کیا صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے کیسا بیدھڑک فرما دیا کہ واللہ لا یستحی من الحق ایک جگہ ارشاد ہے لا تکونوا کالذین اذوا موسیٰ فبراہ اللہ مما

قالوا۔ (ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی تھی۔ بس اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قول سے بری کر دیا) غرض اس کا بہت اہتمام فرمایا گیا ہے کہ ایذا نہ ہو۔ تو ایذا رسول حرام ہے اور اس کا وہ اثر ہے جو کہ کفر کا ہے اور بعض اوقات یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ ایذا ہوئی ہے یا نہیں اور اعمال حبط ہو جاتے ہیں اس لئے ارشاد ہوا کہ وہ کام بھی نہ کرو جس میں ایذا کا احتمال بھی ہو اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حبط کے کچھ اور معنی ہیں تو خیر لیکن اس وقت تک مجھے یہی معلوم ہے کہ حبط کے یہی معنی ہیں تو معاصی میں صرف یہ معصیت ایسی ہے البتہ کفر تو ایسی چیز ہے کہ طاعت کی بقا اور صحت دونوں اس کے ترک پر موقوف ہیں۔ اور بعض معاصی ایسے ہیں کہ ان کا ترک ہی شرط بقاء عمل ہے یعنی عمل تو صحیح ہو گیا تھا لیکن وہ معلق رہا کہ اگر وہ عمل نہ ہوتا تو باقی رہتا ہے ورنہ باطل ہو جاتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں ہے۔ **يا ايها الذين امنوا لا تبطلوا صدقاتكم** **بالمن والاذى**۔ (اے مومنو اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل مت کرو) لا تبطلوا کے معنی یہ ہیں کہ قبل من واذی ثواب تو ہوا تھا لیکن وہ من واذی سے پھر جاتا رہا غرض بعض معاصی کو یہ دخل ہوا پس ہمارے اس دعوے میں کہ معاصی سے طاعات کا ثواب زائل نہیں ہوتا معاصی سے مراد ایسے معاصی مذکور نہیں ہیں بلکہ وہ معاصی مراد ہیں جن کے وجود کو طاعت کے وجود یا بقا میں دخل نہ ہو ایسے گناہوں میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ان سے نیکیاں ضائع نہیں ہوتیں اور اس کی ایک اور بھی دلیل ہے فرماتے ہیں۔ **ان الحسنات يذهبن السيئات**۔ (درحقیقت نیکیاں برائیوں کو ختم کرتی ہیں) تو گناہ کرنے سے اگر نیکیوں کا ثواب نہ ملے تو نیکیوں میں یہ اثر جو مصرح ہے کہاں سے آئے گا اور اس سے ایک بڑی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ گناہوں سے تو نیکیاں نہیں مٹتیں۔ لیکن نیکیوں سے گناہ دھل جاتے ہیں تو یہ نہایت قوی دلیل ہے۔ البتہ اس کے متعلق یہ مستقل تحقیق ہے کہ سیئات سے مراد یہاں صفائر ہیں یعنی نیکیوں سے جو گناہ معاف ہوتے ہیں وہ صغیرہ ہیں اور کبائر صرف توبہ سے یا فضل بلا وعدہ سے معاف ہوتے ہیں۔ البتہ ایک روایت سے شبہ ہوتا ہے کہ صغیرہ بھی جب معاف ہوتا ہے کہ جب کبیرہ سے بچا رہے کیونکہ حدیث میں **ما اجتنب الكبائر** نیز ایک آیت سے بھی یہ شبہ ہوتا ہے۔ آیت یہ ہے **ان تجتنبوا كبائر ما تنهون عنه نكفر عنكم سيئاتكم**۔ (اگر تم کبیرہ گناہوں سے جس سے کہ تمہیں روکا جاتا ہے بچتے رہو ہم اسے تمہارے صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنا دیں گے۔ اب ضرورت ہے اس حدیث اور آیت کے معنی سمجھنے کی تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کفارات لما بينهن ما اجتنب الكبائر اور ما عام ہے تو ترجمہ یہ ہوا کہ سارے گناہوں کا کفارہ تو جب ہی ہے کہ کبائر سے بچے ورنہ سب کا نہیں بلکہ صرف صفائر کا ہوگا یہ لازم نہیں آتا کہ صغیرہ بھی معاف نہ ہو اور آیت کے معنی اس سے بھی زیادہ

صاف ہیں۔ یعنی ان تجتنبوا میں ایک شرط کی دو جزائیں ہیں۔ نکفرہ اور ندخلکم مدخلا کریمما (ہم تمہیں بہترین جگہ داخل کریں گے) پس اس مجموعہ کیلئے جزائیں بیشک یہی شرط ہے کہ کبائر سے بھی بچے اور اگر کبائر صادر ہوئے تو مجموعہ مرتب نہ ہوگا۔ یعنی مدخلا کریمما بمعنی دخول جنت بلا عقاب و عتاب تو بہ یا فضل پر موقوف ہوگا پس اب وہ شبہ نہ رہا اور یہ ثابت رہا کہ گناہ معاف ہوتے ہیں حسنات سے تو اگر نیکیاں قبول نہ ہوتیں تو اس میں یہ اثر کہاں سے ہوا پس معلوم ہوا کہ قبول تو ہوئیں لیکن ان میں برکت نہیں ہوئی اور یہ برکت نہ ہونا اس حدیث سے ثابت ہے۔

فرماتے ہیں کہ اگر گناہوں سے نہ بچے تو کھانا پینا چھوڑنے سے کیا فائدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فائدہ کی نفی فرما رہے ہی اور یہ میں پہلے بدلیل کہہ چکا ہوں کہ روزہ ہو جاتا ہے باوجود گناہوں کے بھی تو جو فائدہ منفی رہا وہ روزے کی برکت ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوِيكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ

لَعَلَّكُمْ تَرْحَمُونَ ۝۴

ترجمہ: مسلمان تو سب بھائی ہیں سوائے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔

تفسیری نکات

موصوف کے حکم کی علت صفت ہوتی ہے

انما المؤمنون اخوة۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس میں حق تعالیٰ نے حکم اخوت کو صفت مؤمن پر مرتب فرمایا ہے اور اصول کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی صفت پر حکم مرتب ہوتا ہے وہاں وہ وصف حکم کی علت ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ ہم میں جو اخوت کا تعلق ہے اس کی علت ایمان ہے اور وہی اخوت مطلوب ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہو صاحبو آج کل جو اتحاد و اتفاق کو بقائیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی بلکہ ہوائے نفس یا معاصی پر ہوتی ہے اس لئے وہ بہت جلد ہوا ہو جاتا ہے یعنی فنا اس لئے اگر اتفاق کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کی بنیاد ایمان پر قائم کرو۔ مگر آج کل تو ایمان کو ایسی بے قدر چیز سمجھ رکھا ہے کہ اس کی کچھ وقعت ہی نہیں جس کام کی بنیاد ایمان پر رکھی جاتی ہے اس کے متعلق لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ملانوں کا

کام ہے چنانچہ آج کل زبانوں پر یہ بات بہت کثرت سے ہے کہ یہ وقت نماز روزہ کا نہیں اتحاد کا وقت ہے اور جب کوئی اللہ کا بندہ اعتراض کرتا ہے کہ اتحاد کی وجہ سے احکام شرعیہ کا فوت کرنا جائز نہیں تو نہایت بے باکی سے جواب دیا جاتا ہے کہ یہ وقت جائز و ناجائز کا نہیں۔ کام کا وقت ہے اور غضب یہ کہ اس متن پر بعض اہل علم نے یہ حاشیہ چڑھا دیا کہ اتفاق و اتحاد وہ چیز ہے کہ اس کے قائم کرنے کے لئے غزہ احزاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں قضا کر دی تھیں بتلائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کس سے اتحاد کر رہے تھے جو اتحاد کی وجہ سے نمازیں قضا ہوئیں بلکہ وہاں تو عدم اتحاد اس کا سبب ہوا تھا کفار سے مقابلہ اور لڑائی تھی نہ کہ اتحاد کی گفتگو۔

مطلق اتحاد محمود نہیں

پس اتحاد کی بھی ہر فرد مستحسن نہیں اس کو علی الاطلاق محمود کہنا اتحاد کا ہیضہ ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل اتحاد کے فضائل تو بہت بیان کئے جاتے ہیں مگر اس کے اصول حدود بیان نہیں کئے جاتے پس خوب سمجھ لو کہ خدا سے نا اتفاقی کرنے پر اتفاق کرنا مذموم اور نہایت مذموم ہے پس اس سے اس اتحاد کا حکم سمجھ لیا جاوے جس میں اتحاد کے لئے شریعت کے احکام کو چھوڑا جاتا ہے صاحبو جیسے اتفاق مستحسن ہے ایسے ہی کبھی نا اتفاقی بھی مستحسن ہے پس جو لوگ خدا تعالیٰ کے احکام چھوڑنے پر اتفاق کریں ان کے ساتھ نا اتفاقی کرنا اور مقابلہ کرنا محمود ہے دیکھو جیسے عمارت بنانا محمود ہے ایسے ہی بعض عمارت کا گرانا بھی محمود ہے اگر آپ اپنی رعایا سے کوئی مکان خریدیں اور اس میں بجائے کچھ کوٹھڑیوں کے عمدہ کٹھی بنانا چاہیں تو پہلی عمارت کو گرائیں گے یا نہیں یقیناً گرائیں گے۔ اب بتلائے یہ افساد محمود ہے یا مذموم۔ اس کے محمود ہونے میں کسی عاقل کو کلام نہیں ہوتا پھر کسی موقع پر نا اتفاقی کے محمود ہونے میں کیوں شبہ ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس طرح بھی صلح کرادو بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ صحیح بنیاد پر صلح کرادو اور اگر لوگ اس پر راضی نہ ہوں تو سب مل کر غلط بنیاد کو ڈھا دو پھر قتال کے بعد اگر طائفہ باغیہ حق کی طرف رجوع ہو جائے تو حکم یہ ہے کہ فان فاءت فاصلحوا بینہما بالعدل و اقسطوا۔ یعنی اب پھر ان کے معاملہ کی انصاف کے ساتھ اصلاح کرو۔ یہ نہیں کہ بس لڑائی موقوف ہوتے ہی ان کا مصافحہ کرادو۔ اس میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں بعض لوگ صلح کرانا اس کو سمجھتے ہیں کہ جہاں دو آدمیوں میں نزاع ہو فوراً دونوں کا مصافحہ کرادیا چاہے فریقین کے دل میں کچھ ہی بھرا ہو میں کبھی ایسا نہیں کرتا بلکہ میں کہتا ہوں کہ پہلے معاملہ کی اصلاح کرو پھر مصافحہ کرو ورنہ بدوں اصلاح معاملہ کے نرا مصافحہ محض بیکار ہے اس سے فریقین کے دل کا غبار نہیں نکلتا تو مصافحہ کے بعد پھر مکافحہ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی مقاتلہ تو حق تعالیٰ نے فاءت کے بعد یہ نہیں فرمایا فکفوا یدیکم۔ کہ زیادتی کرنے والا حق کی طرف رجوع ہو تو بس تم ہاتھ روک لینے پر اکتفا کرو بلکہ فرماتے

ہیں کہ جب دوسرا فریق زیادتی چھوڑ دے تو اب پھر اصلاح کی عدل کے ساتھ کوشش کرو یہ قید یہاں ایسی بڑھائی گئی ہے جس پر ساری عقول قربان ہیں کیونکہ نزاع بدوں اس کے ختم ہو ہی نہیں سکتا مگر اس نکتہ پر کسی کی عقل نہیں پہنچتی۔ بہر حال اصلاح کے نہ یہ معنی ہیں کہ صاحب حق کو دبا یا جائے نہ یہ معنی ہیں کہ محض مصافحہ کرادیا جائے بلکہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کیا جائے اس پر فریقین اتفاق کر لیں تو خیر ورنہ اس اتفاق کی طرف لانے کے لئے فریق مبطل سے نا اتفاقی اور قتال کا حکم ہے۔

وَلَا يَغْتَابَ بَعْضُكُمُ بَعْضًا

ترجمہ: کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے

غیبت کی مثال

یہ حکم بھی منع کے لئے کافی تھا مگر اس کو ایک گندی مثال سے موکد فرمادیا جو ناگوار طبعی ہے تاکہ غیبت سے ایسی نفرت ہو جائے جیسی اس مثال میں ہے مثال یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ پسند ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے۔ اول تو مردار ہی سے نفرت ہوتی ہے پھر اپنے بھائی کا گوشت یہ کیسی گندی مثال ہے اس کا تصور کرنے کے بعد تو غیبت سے ضرور ہی نفرت ہو جائے گی۔ جس شخص کی غیبت کی جاتی ہے وہ چونکہ موجود نہیں ہوتا اور اس وجہ سے وہ اس غیبت کا جواب کچھ نہیں دے سکتا ہے۔ جیسے مردہ کہ وہ بھی مدافعت نہیں کر سکتا اور اس بناء پر اس کا گوشت کھانا عقلاً و طبعاً مکروہ ہے لہذا مثال میں غیبت کو مردہ کا گوشت کھانا بتلایا گیا کہ وہ بھی عقلاً و طبعاً مکروہ ہے۔

غیبت کی سزا

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے شب معراج میں کچھ آدمی دیکھے کہ وہ اپنے مونہوں کو اپنے ہاتھوں سے نوج رہے تھے۔ اور ناخن ان کے تانے کے تھے اور وہ غیبت کرنے والے تھے۔ دیکھے غیبت کس قدر بری چیز ہے۔ آخر ہم جب ایمان رکھتے ہیں تو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کا کچھ تو اثر ہونا چاہیے۔ کبھی تو یہ خیال آنا چاہیے کہ گناہ کا انجام یہ ہوگا دنیا کی ذرا سی بھی تکلیف نہیں جھیلی جاتی تو یہ عذاب کیسے اٹھائیں گے۔

قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلٰی اِسْلَامِكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ

لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۱﴾

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھوں بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی بشرطیکہ تم سچے ہو۔

صرف حسنت میں مرتبہ خلق نظر ہونا چاہیے

فرمایا کہ جن لوگوں کی نسبت مع اللہ راسخ ہو چکتی ہے اگر وہ مائل الی المعصیت نہ ہوں اور جن پر خوف خداوندی کی براں تیغ ہر دم کشیدہ رہتی ہے اگر وہ پاک باز ہوں تو کوئی عجیب بات نہیں البتہ ان پر خدا کا یہ بڑا احسان ہے کہ ان کیفیات کی طریاں ہو کر ان کے لئے حال بن گئیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلٰی اِسْلَامِكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اِنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ البتہ جن لوگوں کو ہنوز نسبت مع اللہ نہیں ہوئی اور پھر بھی وہ معاصی کے چھوڑ دینے کی ہمت کرتے ہیں اور اپنے اوپر جبر کر کے اپنے کو صالح بناتے ہیں ان کا بڑا اکمال ہے اگرچہ اصل توفیق ان کو بھی خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے ان کے اختیار میں کچھ نہیں لیکن تاہم یہ مجاہدہ میں قابل مدح ہیں اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب اہل نسبت کی اطاعت کوئی زیادہ قابل مدح نہیں ہے تو غیر اہل نسبت کی معصیت بھی قابل ملامت نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ قیاس صحیح نہیں ہے کیونکہ مطیع کا اپنے کو ممدوح نہ سمجھنا تو اس بناء پر تھا کہ جو امر داعی الی الطاعة ہے وہ خدا کی جانب سے ہے پس عاشق کا اپنے کو قابل ملازمت نہ سمجھنا بھی اسی بناء پر ہوگا تو یہ امر بالکل خلاف ادب ہے حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

گنہ اگرچہ نہ بود اختیار ما حافظ تو در طریق ادب کوش کیں گناہ منست

لوگوں میں مشہور ہے کہ اس کے معنی بہت مشکل ہیں بوجہ اس قول کے ”نہود اختیار ما“ اور بظاہر معلوم بھی ایسا ہی ہوتا ہے لیکن غور کرنے سے یہ شعر بالکل صاف ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ بروئے عقل و نقل ثابت ہے کہ ہر عمل میں ایک مرتبہ خلق کا ہے اور ایک مرتبہ کسب کا ہے اور مرتبہ خلق صرف خدا تعالیٰ کیلئے ہے اور مرتبہ کسب بندہ کے لئے۔ سو یوں تو ہر فعل میں یہ دونوں ہی مرتبے ہیں لیکن ادب یہ ہے کہ ہم کو حسنت میں تو صرف مرتبہ خلق پر التفات چاہیے اور مرتبہ کسب پر نظر نہ چاہیے اور معاصی میں مرتبہ خلق پر نظر نہ کی جائے بلکہ ہر دم اپنے کسب پر التفات چاہیے پس نہود اختیار مرتبہ خلق کے اعتبار سے ہے اور کیں گناہ مرتبہ کسب میں پس اس سے کسب کا غیر اختیاری ہونا لازم نہیں آتا ہے۔

سُورَةُ وَتٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۙ

ترجمہ: اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں

تفسیری نکات

کمال علم حق سبحانہ و تعالیٰ

یعنی ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (جو عاقبت درجہ علم و حکمت اور قدرت کی دلیل ہے کیونکہ انسان تمام مخلوق میں سب سے زیادہ عاقل اور ہوشیار اور ذی علم ہے تو سمجھ لو کہ اس کا پیدا کرنے والا کیسا ذی علم ہوگا) اور ہم ان باتوں کو بھی جانتے ہیں جو اس کے نفس میں بطور وسوسہ کے گذرتی ہیں (کیونکہ اس کا منشاء حرکت قلب ہے اور اس حرکت کو بھی ہم ہی پیدا کرتے ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ انسان کے قبضہ میں یہ وسوسے نہیں ہیں تو جو وسوسے کو بھی جانتا ہے جن کا قیام بھی قلب میں نہیں ہوتا وہ انسان کے ارادہ اور عزم کو کیوں نہ جانے گا جس کا قلب میں قیام ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر اعمال جو ارجح و اقوال لسان کو کیوں نہ جانے گا جو سب کو محسوس ہوتے ہیں گو بوجہ عرض ہونے کے ان کو خود قیام نہیں مگر پھر بھی سبحان اللذات (ذات کے تابع ہو کر) ان کا ادراک مخلوق کو بھی ہوتا ہے تو خالق کو کیوں نہ ہوگا اور جب وہ وسوسے قلب اور ارادہ و عزم اور افعال و اقوال کو جانتا ہے تو اجزاء مستحیلہ متفرقہ کو جو جو اہر و اعیان ہیں کیونکہ نہ جانے گا) یہ تو سابق کی دلالت تھی اس استدلال پر آگے سیاق تو بہت ہی صریح ہے فرماتے ہیں و نحن اقرب الیہ من جبل الوردید۔ کہ ہم اعتبار علم کے اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں (رگ سے مراد یہاں پر وہ رگ ہے جس کا اتصال شرط حیوۃ ہے اور

حیوۃ کا مدار نفس وروح ہے مقصود یہ ہے کہ ہم انسان کے نفس وروح سے بھی زیادہ اس کے احوال کو جانتے ہیں کیونکہ ہمارا علم قدیم ہے اور حضوری اور انسان کے نفس وروح کا علم حادث ہے خواہ حضوری ہو یا حصولی اور حصولی تو فی نفسہ بھی ناقص ہے (۱۲) علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں اقربیت سے اقربیت بالعلم مراد ہے۔ پس ونحن اقرب الیہ من جبل الوردیہ۔ (ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں) یہاں ایسا ہے جیسا الایعلم من خلق کے بعد وهو اللطیف الخبیر۔ (حالانکہ وہ باریک بین اور صاحب علم ہے) تھا حاصل دونوں کا ایک ہے کہ خالقیت سے عالیت پر استدلال کیا گیا ہے اور علم الہی کا کمال ثابت کیا گیا ہے جس سے امکان معاذ کو ثابت کر کے استبعاد کو رفع کرنا مقصود ہے یہاں اس سے بحث نہیں کہ ان وساوس پر مواخذہ ہوگا یا نہیں بلکہ صرف علم و سادس سے کمال علم کو ثابت کرنا مقصود ہے خوب سمجھ لو پس اس آیت سے وساوس پر مواخذہ کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔

وساوس غیر اختیار یہ پر مواخذہ نہیں ہوگا

اور جس آیت سے اول نظر میں وساوس پر مواخذہ کا شبہ ہو سکتا تھا حق تعالیٰ نے اس کو بہت صاف اور صریح طور پر دفع فرمادیا ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوه یحاسبکم بہ اللہ فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء واللہ علی کل شیء قدیدر۔ (اور اگر تم ظاہر کرو ان باتوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں یا چھپاؤ بہر حال اللہ تعالیٰ تم سے ان کا محاسبہ فرمائیں گے پھر جس کو چاہیں گے معاف کر دیں گے اور جس کو چاہیں گے عذاب دیں اور اللہ تعالیٰ کو ہر بات پر قدرت ہے) یہاں بظاہر لفظ ما عام ہے وساوس غیر اختیار یہ اور خیالات اختیار یہ سب کو اور عموم ہی کی وجہ سے صحابہ کو اشکال ہوا تھا مگر اس کا منشاء عدم علم نہ تھا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ امور غیر اختیار پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے کیونکہ یہ مسئلہ عقلیہ بھی ہے بلکہ غلبہ خشیت سے ان کو عموم کا شبہ ہوا کیونکہ لفظ بظاہر عام تھا اور خشیت وہ چیز ہے کہ جب اس کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت علم پر نظر نہیں رہتی۔ صحابہ نے اس شبہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کیونکہ آپ پر غلبہ ادب تھا ادھر وحی قطعی سے رفع اشتباہ کی امید تھی اس لئے آپ نے خود تفسیر کی اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ مدح میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون۔ (اعتقاد رکھتے ہیں رسول اس چیز کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ احکام منزلہ من اللہ پر بڑا کامل ایمان ہے کہ ہر حکم پر دل سے راضی ہو جاتے ہیں اور سمعنا و اطعنا (ہم نے سنا اور خوشی سے مانا) کہتے ہیں اس کے بعد آیت سابقہ کی تفسیر فرمائی۔ لایکلف

اللہ نفساً الاوسعها لها ما كسبت و عليها ما اكتسبت. (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو اس کو اس کا ثواب ملے گا جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے) یعنی حق تعالیٰ وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتے اور وساوس غیر اختیاری ہیں تو ان پر مواخذہ نہ ہوگا اس آیت سے پہلی آیت کی تفسیر ہوگئی کہ اس میں ما فی انفسکم. (جو تمہارے دلوں میں ہے) سے عزم و ارادہ مراد ہے۔ جو ما کسبت و اكتسبت۔ (جو ارادہ سے کرے) میں داخل ہے نہ کہ وسوسہ رہا یہ کہ احادیث میں تو یہ آتا ہے کہ دوسری آیت نے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا اور تمہاری تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان تبدیل نہیں بیان تفسیر ہے اس کا جواب قاضی ثناء اللہ صاحب نے خوب دیا ہے کہ سلف کی اصطلاح میں نسخ عام ہے وہ بیان تفسیر کو بھی نسخ ہی سے تعبیر کر دیتے ہیں واقعی یہ بہت قیمتی تحقیق ہے اور جو شخص احادیث میں غور کرے گا اس کو اس کی قدر معلوم ہوگی اور تتبع سے اس تحقیق کی صحت معلوم ہو جائے گی اب بحمد اللہ سب اشکالات رفع ہو گئے اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ ممکن ہے آیت و نعلم ما تو سوس به نفسه. (ہم ان باتوں کو خوب جانتے ہیں جو اس کے دل میں بطور وسوسہ کے گزرتی ہیں) نزولاً موخر ہو اور لا یكلف اللہ نفساً الاوسعها (حق تعالیٰ شانہ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) مقدم ہو تو موخر مقدم کے لئے ناسخ ہو جائے گا اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ تاریخ دیکھو علماء مفسرین نے تصریح کی ہے کہ سورہ ق پوری مکی ہے اور سورہ بقرہ مدنی ہے دوسرے سورہ ق کی یہ آیت مواخذہ علی الوسوس (وسوسوں کے مواخذہ پر) اور سورہ بقرہ کی آیت عدم مواخذہ میں صریح ہے اور غیر صریح صریح کے لئے ناسخ نہیں ہو سکتا۔ کلام بہت بڑھ گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ نماز میں اگر خود بخود وساوس آویں تو وہ ذرا مضرت نہیں ہاں ارادہ سے لانا برا ہے اور بلا ارادہ کے آئیں تو آئیں تم پرواہ نہ کرو اب جس شخص کو یہ مطلوب حاصل ہو اس کا پھر یہ شکایت کرنا کہ ہائے مجھے وساوس بہت آتے ہیں اس کی دلیل ہے کہ وہ مقصود کا طالب نہیں کسی اور چیز کا طالب ہے اور وہ وہی ہے حظ نفس کیونکہ اگر وساوس بالکل نہ آئیں اور محویت کی ہی حالت ہو جائے تو اس میں لذت خوب آتی ہے اور نفس کو کشاکشی سے نجات رہتی ہے۔ اس حظ نفس کی وجہ سے یہ شخص لذت و محویت کا طالب ہے گو اس کو نہ دنیا مقصود ہے نہ جاہ وغیرہ لیکن ایک غیر مقصود کا تو طالب ہے اور اب تک حظوظ میں پڑا ہوا ہے۔

وسوسہ گناہ نہیں

مثلاً ایک آیت میں ہے ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما تو سوس به نفسه. اس سے ظاہر متبادر ہو سکتا ہے کہ وسوسہ بھی گناہ ہے حالانکہ حدیث میں صراحتاً موجود ہے تجاوز اللہ عن امتی ما وسوست

بہ صدورھا۔ یعنی حق تعالیٰ نے میری امت کے قلبی وسوسوں کو معاف فرمادیا ہے۔ سو دونوں نصوص میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن اس تقریر سے یہ تعارض رفع ہو گیا کیونکہ میں نے بیان کیا ہے کہ وسوسہ گونا گونا نہیں مگر منع اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ کبھی ذریعہ گناہ کا بن جاتا ہے اور یہ شریعت کا انتظام ہے کہ منہیات کے ذرائع سے بھی نہی فرمائی ہے سو حدیث ظاہر حقیقت پر محمول ہے اور آیت میں جو کچھ وسوسہ کی برائی ظاہر معلوم ہوتی ہے وہ بطور پیش بندی کے ہے اور میں نے ظاہر اس لئے کہا کہ اگر غور کیا جائے تو واقع میں آیت میں وسوسہ پر وعید ہی نہیں ہے بلکہ صرف اپنے احاطہ علمی کا بیان فرمایا ہے جیسے دوسری آیت میں ہے انہ علیم بذات الصدور الا یعلم من خلق فرماتے ہیں انہ علیم بذات الصدور آگے اس کی دلیل ہے الا یعلم من خلق سبحان اللہ قرآن کی کیا بلاغت ہے یعنی یہ بات تو پہلے سے معلوم ہے کہ سب چیزیں پیدا کی ہوئی خدا تعالیٰ کی ہیں اور خلق مسبوق بالعلم ہوتا ہے تو اپنی پیدا کردہ چیز کا علم دلیل عقلی سے ثابت ہو اس واسطے بطور انکار اور تعجب کے فرمایا الا یعلم من خلق کیا خدا تعالیٰ اپنی پیدا کی ہوئی چیز کو نہ جانے گا ضرور جانے گا اور دل کی باتیں بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں تو ان کو بھی ضرور جانے گا اس سے ظاہری محسوسات کا علم بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا جس کا اوپر ذکر ہے واسر و اقولکم او اجہرو ابہ تو اس سے احاطہ علم کا بیان کرنا منظور ہے نہ یہ کہ جس چیز کے متعلق علم ہو وہ بری اور گناہ ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ تمام ذات الصدور اور قول سر اور قول جہر سب گناہ ہی ہوں حالانکہ یہ بدہمت صحیح نہیں تو اسی طرح اس آیت میں سمجھ لیجئے ونعلم ما تو سوس بہ نفسہ کہ اس میں احاطہ علم کا بیان فرمانا مقصود ہے۔ چنانچہ یہاں بھی پہلے ولقد خلقنا الانسان موجود ہے تو اس آیت میں ما تو سوس پر وعید نہیں اور اس سے پیچھے ونحن اقرب الیہ میں تاکید ہے اسی احاطہ علم کی اور توضیح ہے اس دعویٰ کی یعنی ہمارے علم میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ہم تو اس کی جان کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ تو آیت ما تو سوس بہ نفسہ سے شبہ وسوسہ کے گناہ ہونے کا کیا جائے جیسا نعلم کے افتران سے متوہم اس بناء پر ہو گیا تھا کہ بعض آیات میں اثبات وعید بھی مقصود ہے۔

غیر اختیاری وسوسوں سے ڈرنا چاہیے

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وسوسوں کے متعلق بعض اغلاط کا ذکر کر دیا جائے وہ یہ ہے کہ آج کل ایک جماعت ذاکرین کی اس غلطی میں مبتلا ہو گئی ہے کہ غیر اختیاری وسوسوں سے بہت ڈرتے ہیں حتیٰ کہ بعض کو جان دینے تک کی نوبت آگئی ہے اور اس کی وجہ ان کا ذکاؤ حس اور خوف خدا ہے اور یہ حالت بھی فی نفسہ کوئی بری نہیں ان کو احساس تو ہے باقی عوام تو ہاتھی کے ہاتھی نکل جائیں اور ان کو احساس نہ ہو اور ذاکرین

کی یہ حالت ہوتی ہے کہ مکھی بھی آبیٹھے تو ناگوار ہوتی ہے اس ہاتھی اور مکھی پر لطیفہ یاد آ گیا۔

وسولہ کی مثال

دہلی میں ایک دیہاتی شخص نان بائی کی دوکان پر گوشت کا سالن خریدنے گیا دوکاندار نے پیالہ میں گوشت دیا دیکھا تو اس میں ایک مکھی بھی تھی۔ دوکاندار سے کہا میاں اس میں تو مکھی ہے تو بیباک دوکاندار کیا کہتا ہے کہ کیا چار پیسہ میں ہاتھی نکلتا خیر یہ تو لطیفہ تھا مقصود یہ ہے کہ جیسا فرق ہاتھی اور مکھی میں ہے۔ بعض لوگوں کو ایک آیت سے دھوکا ہوا ہے۔

واحلل عقدۃ من لسانی بفقہوا قولی (طہ آیت ۲۷، ۲۸) اور میری زبان سے بنگلی ہٹا دیجئے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت حسین تھے

فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں گرہ تھی۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ باقی رہی یا بعد دعا کے زائل ہو گئی۔ دعایہ ہے و احلل عقدۃ من لسانی بفقہوا قولی۔ بعض کا قول ہے کہ دعا کے بعد زائل ہو گئی تھی بعض کہتے ہیں عقدہ زائل نہیں ہوا بلکہ ہو گیا وہ بھی قرآن ہی سے تمسک کرتے ہیں کہ فرعون نے کہا ام انا خیر من هذا الذی ہو مہین ولا بکادیین دوسری آیت ہے ویضیق صدری ولا یطلق لسانی الخ اور آیت عقدہ کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دعا میں عقدہ نکرہ ہے خیر اثبات میں جس سے عموم نہیں ہوتا۔ تو سب نہیں زائل ہوا کچھ باقی رہا۔ صرف اتنا زائل ہوا کہ مخاطب بات سمجھ سکتا تھا اور اس دعا پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ عام اولیاء حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے نبی ہو کر رضا کیوں نہ اختیار کی۔ جواب یہ ہے کہ چونکہ نبی تھے اور جانتے تھے کہ مجھے تبلیغ کا کام کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے کہ کچھ عقدہ زائل ہو جاوے۔ اس واسطے دعا میں بفقہوا قولی بڑھایا یعنی اتنا عقدہ زائل ہو کہ مخاطب بات سمجھ سکے۔ کس قدر ادب کا لحاظ رکھا کہ جتنی مقدار ضروری تھی اس سے زیادہ کا سوال نہیں فرمایا۔ پھر اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ مخاطب جب بات سمجھ سکتے تھے تو حضرت ہارون علیہ السلام کے رسول ہونے کی دعا کیوں کی؟ جواب یہ ہے کہ دعا کی وجہ بھی قرآن سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ یہ بھی میری تصدیق کریں۔ فارسلہ معی رداً یصدقنی تو اپنی تصدیق کرانی مقصود تھی۔ اس تصدیق سے طبعاً ہمت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ مدرس دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ کہ تقریر کر دی طلبہ سمجھیں یا نہ سمجھیں ان کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی روانی تقریر میں فرق آتا ہی نہیں اور ایک وہ کہ اگر طلبہ نہ سمجھیں تو ان کی تقریر میں روانی نہیں ہوتی طبیعت میں تنگی آتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ طبیعت کے تیز

تھے اور فرعون کا انکار دیکھ کر یہ خطرہ تھا کہ طبیعت میں روانی نہ آئے گی اور یہ مقصد تبلیغ کے منافی ہے۔ اس واسطے فرمایا کہ ہارون علیہ السلام رسول ہو کر تصدیق کریں گے تو طبیعت بڑھ جائے گی اور حق تبلیغ خود ادا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے شاہزادوں کی طرح پرورش پائی ہے۔ فرعون کے گھوڑے پر سوار ہوتے اسی کی طرح کپڑے پہنتے اور بہت خوبصورت تھے اسی واسطے حضرت آسیہ اور خود فرعون دیکھ کر فریفتہ ہو گئے۔

القیبت علیک محبة منی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے (ملفوظات حکیم الامت ص ۱۰۲ تا ۱۰۹)

ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توسوس به نفسه و نحن اقرب الیہ من جبل الوریث

کہ اس سے بظاہر وسوسہ پر مواخذہ ہونا مفہوم ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو انسان کے دل میں کھٹکتی رہتی ہیں اور محاورہ قرآنیہ میں یہ لفظ نعلم مواخذہ اور وعید پر دلالت کرتا ہے۔ کثرت سے ایسی آیتیں وارد ہیں اور عام محاورہ بھی اس کے موافق ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ مجھے تمہاری حالت خوب معلوم ہے۔ یعنی ٹھہرے رہو تم کو سمجھوں گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ذرا اس آیت کے اوپر نظر کرو اور سیاق و سباق کو ملا کر دیکھو اور یہ قاعدہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھو کہ کسی آیت کی تفسیر محض اس آیت کے الفاظ کو دیکھ کر نہ کرو بلکہ سیاق و سباق کو ملا کر تفسیر کیا کرو بغیر اس کے تفسیر معتبر نہیں۔ اسی سے بہت جگہ غلطی واقع ہوتی ہے ایسے ہی یہاں بھی سیاق و سباق کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس مقام پر حق تعالیٰ کا مقصود معاد کو ثابت کرنا ہے جس کے لئے شرط ہے کمال قدرت اور کمال علم۔

قرب حق

تو اوپر کمال قدرت کا ذکر تھا کہ ہم نے آسمان کو اس طرح پیدا کیا زمین کو اس طرح بنایا اور اس میں درخت و نباتات پیدا کئے اب کمال علم کو ثابت کرتے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم کو ان وساوس پر بھی اطلاع ہے جو قلب انسان پر گزرتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وساوس نہایت خفی چیز ہیں۔ جب ہم کو ان کا بھی علم ہے تو ہمارا علم نہایت کامل ہے تو اس سے وعید و مواخذہ پر دلالت کہاں ہوئی؟ بلکہ محض کمال علم پر دلالت ہوئی اس لئے آگے بھی سزا کا ذکر نہیں بلکہ قرب کا ذکر ہے۔ و نحن اقرب الیہ من جبل الوریث کہ ہم انسان کے رگ گردن سے زیادہ اس کے قریب ہیں یہ دلیل ہے علم کامل کی۔

رہا یہ سوال کہ اقرب من جبل الوریث کیسے ہیں۔ یہ ایک مستقل سوال ہے سو اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کو کوئی حل نہیں کر سکتا چنانچہ بعض نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ یہاں قرب علمی مراد ہے مگر من جبل الوریث کا لفظ بتلا رہا ہے کہ یہاں قرب علمی سے زیادہ کوئی دوسرا قرب بتلانا مقصود ہے کیونکہ جبل الوریث ذی علم نہیں ہے جس سے اقرب ہونا اقربیت فی العلم پر دلالت ہے بلکہ یہاں قرب ذات پر دلالت مفہوم ہوتی ہے مگر اس کی

کیفیت کو ہم بیان نہیں کر سکتے کیونکہ حق تعالیٰ جو بندہ کے قریب ہیں۔ اس قرب سے قرب علم یا رضا مراد ہے قرب حسی مراد نہیں اس لئے کہ قرب حسی جانین سے ہوتا ہے کیونکہ ایک شے جب کسی شے سے حتماً قریب ہوگی تو لامحالہ وہ شے بھی اس سے قریب ہوگی اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرب جانین سے نہیں ہے چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

نحن اقرب الیہ من جبل الورد

یہاں اتم اقرب الیہ نہیں فرمایا۔ نحن اقرب الیہ فرمایا یعنی ہم بہت قریب ہیں تو معلوم ہوا کہ قرب خدا کی طرف سے ہے ہماری طرف سے نہیں پس یہاں اس قرب سے قرب علمی مراد ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توسوس به نفسه و نحن اقرب الیہ من جبل الورد

اس آیت میں نعلم پر قرب کو مرتب فرمایا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس قرب سے مراد قرب علمی ہے یعنی جیسا خدا کو علم ہے بندہ کا بندہ کو اس کا ذرہ بھر بھی نہیں باقی حقیقت کے اعتبار سے حق تعالیٰ کو بندہ سے بہت بعد ہے وہ وراء الوراہ ثم وراء الوراہ ہے۔ بندہ کو اس سے کیا نسبت یہ تو اس کا تصور صحیح بھی نہیں کر سکتا۔

کیفیت سے منزہ ہیں۔ ان کا قرب بھی کیفیت سے منزہ ہے۔ مگر تقریب فہم کے لئے اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ہم کو جو اپنی ذات سے قرب ہے یہ قرب وجود کی فرع ہے۔ اگر وجود نہ ہوتا تو نہ ہم ہوتے نہ ہم کو اپنی ذات سے قرب ہوتا اور ظاہر ہے کہ وجود میں حق تعالیٰ واسطہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہمارے اور اس تعلق کے درمیان میں واسطہ ہیں جو ہم کو اپنی جان کے ساتھ ہے تو ہم کو اول حق تعالیٰ سے تعلق ہے پھر اپنی جان کے ساتھ تعلق ہے۔ اس تقریر کے استحضار سے قرب حق کا مشاہدہ گو بہت کچھ ہو جائے گا مگر کیفیت اب بھی واضح نہ ہوگی البتہ عقلاً یہ معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ہماری جان سے بھی زیادہ قرب و تعلق ہے اور یہی مقصود ہے۔

و نحن اقرب الیہ من جبل الورد کے معنی کہ علماً و معترفیۃً بندہ سے ہم قریب ہیں بدلیل و نعلم ماتوسوس بہ نفسہ اسی وجہ سے نحن اقرب فرمایا کہ ہم قریب ہیں۔ اتم اقرب الینا نہیں فرمایا۔ کہ تم ہم سے قریب ہو۔ سو اگر اس سے قرب حقیقی مراد ہوتا تو دونوں طرف سے قرب ہوتا کیونکہ یہ قرب و نسبت متکررہ سے ہے۔ اگر ایک طرف سے قرب ہوگا تو دوسری طرف سے بھی ضرور ہوگا۔ رہا قرب علمی سو اس میں یہ ضرور نہیں کہ اگر ایک طرف سے قرب ہو تو دوسری طرف سے بھی ہو تو قرب علمی خدا کی طرف سے تو ہے اس لئے کہ ان کا علم کامل ہے اور بندہ کی طرف سے نہیں۔ کیونکہ بندہ ہے غافل پس بندہ تو خدا سے دور ہوا اور اللہ تعالیٰ بندہ سے قریب غرض حق تعالیٰ کو پوری معرفت ہے۔

بعث و نشر

اذیتلقی الی آخر السورہ اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے بعث و نشر کا ذکر فرمایا ہے ان مواقع پر استدلال میں اپنی تین صفات کا بھی ذکر فرمایا ہے جن کی بعث و نشر کے لئے ضرورت ہے۔ یعنی قدرت ارادہ اور علم چنانچہ یہاں بھی اپنی قدرت اور ارادہ کا ذکر تو اس آیت میں فرمایا ہے۔ افعینا بالخلق الاول بل ہم فی لبس من خلق جدید۔ اس کے بعد اپنے علم کا ذکر فرماتے ہیں۔ و نعلم ما تو سوس بہ نفسہ و نحن اقرب الیہ من جبل الوردید۔ یعنی ہمارا علم ایسا وسیع ہے کہ مواد تو مواد و سادس تک کا ہم کو علم ہے پس جو اجزاء منتشر ہو گئے ہیں ان کا ہم کو پورا علم ہے کہ کہاں کہاں موجود ہیں ان کو ہم جب چاہیں گے پھر مجتمع کر دیں گے پس یہاں جو وساوس کے علم کا ذکر ہے تو وہ اس غرض سے ہے کہ بعث و نشر کے وقوع پر دلیل قائم کی جائے اور یہ مراد نہیں کہ ان پر مثل اور اعمال کے جزا و سزا ہوگی جیسا کہ سیاق و سباق سے میں نے ثابت کر دیا ہے۔ اس پر عرض کیا گیا کہ کیا حضرت نے یہ تحقیق اپنی تفسیر بیان القرآن میں بھی لکھی ہے۔ فرمایا کہ تفسیر میں کیا کیا لکھا جاتا ہے تفصیل تو یاد نہیں ہے لیکن کوئی مختصر سی عبارت بین القوسین ترجمہ میں ضرور ہوگی۔ جس سے کوئی اشکال بھی رفع ہو جائے۔ مجھے اب کیا یاد ہے اور اس وقت کیا معلوم یہ تفسیر ذہن میں تھی یا نہیں اور یاد رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے یہاں تو الحمد للہ الحمد للہ چشمہ ہر وقت اہل رہا ہے پھر تھوڑے سے سکوت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر فرمایا کہ حضرت بدوں اس کے کہ وہاں کوئی خدمت پیش کی جائے یہ سب تحقیقات ہیج ہیں۔ ایک بھنسانی کا ان پڑھ دیہاتی جو معانی تو کیا الفاظ بھی نہیں جانتا لیکن حرام حلال کا اہتمام رکھتا اور پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے وہ ان صوفیہ سے افضل ہے جن میں قوت عملیہ نہیں۔ صرف حقائق و معارف ہی ہیں۔ عرض کیا گیا کہ محققین کی نماز تو غیر محققین سے افضل ہوگی فرمایا کہ ان تحقیقات کو اس افضلیت میں کچھ دخل نہیں بلکہ اس کا مدار اخلاص ہے چونکہ محقق اخلاص کی حقیقت غیر محقق سے زیادہ جانتا ہے اگر وہ اس پر عمل کرے گا تو عمل کے اعتبار سے اس کی نماز افضل ہوگی اور اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ غیر اللہ پر نظر نہ ہو محض اللہ ہی مقصود ہو غیر اللہ مقصود نہ ہو نہ علما نہ عملاً۔ اور ایک نظر تو معبود ہونے کی حیثیت سے ہوتی ہے وہ تو الحمد للہ نماز میں غیر اللہ پر کسی کو نہیں ہوتی کیونکہ نمازی کا یہ پختہ اعتقاد ہوتا ہے کہ معبود اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن دوسرے اعتبار سے نظر ہو جاتی ہے یعنی نماز کے وقت قصداً خطرے جمع کر لئے جاتے ہیں اور یہ عملاً نظر الی الغیر ہے جو ممنوع ہے کیونکہ یہ منافی خشوع ہے اور یہ درجہ ہر شخص کو ادنیٰ توجہ سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن ناواقفی سے لوگوں نے خشوع کو بہت مشکل سمجھ رکھا ہے حالانکہ جو درجہ اس کا مامور بہ اور ضروری ہے وہ بہت آسان ہے اور وہ وہ درجہ ہے جس کو میں نے ایک مثال

سے ظاہر کیا ہے اس سے پھر رفتہ رفتہ اس میں قوت ہو جاتی ہے وہ مثال یہ ہے کہ دو طرح کے حافظ ہوتے ہیں ایک پکا حافظ دوسرا کچا حافظ۔ پکا حافظ تو بلا سوچے ہوئے پڑھتا چلا جاتا ہے اس کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ ہر لفظ پر سوچے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ وہ آزادی کے ساتھ دوسری باتیں سوچتا رہتا ہے اور پڑھتا چلا جاتا ہے کیونکہ اس کو بھولنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا اور ایک کچا حافظ ہوتا ہے اس کو برابر اپنی توجہ ہر لفظ پر قائم رکھنی پڑتی ہے تاکہ وہ بھول نہ جائے۔ بس اتنی توجہ عبادت کے وقت کافی ہے جتنی میں نے اس مثال سے بتلا دی۔ اس سے زیادہ کاوش ہے اور اس سے کم کم ہمتی۔ پھر اس توجہ میں رفتہ رفتہ قوت بڑھ جائے گی۔ یعنی اول اول اس توجہ میں تکلف ہوگا پھر آسانی ہونے لگے گی۔ یہ مثال بھی کسی نے نہیں دی یہ اللہ کا فضل ہے کہ میرے دل میں اس نے یہ مثال ڈال دی۔ اس سے یہ بالکل صاف ہو گیا کہ ضروری استحضار کا درجہ کتنا ہے۔ بس وہ یہ درجہ ہے باوجود اس کے لوگ کہتے ہیں کہ خشوع و خضوع بڑا مشکل ہے۔ اب بتلائیے کہ جو درجہ ضروری ہے وہ یہ ہے اور یہ کیا مشکل ہے لوگ خشوع و خضوع کے انتہائی درجہ کو مشکل سمجھ کر ضرورت کے درجہ سے بھی محروم ہو گئے بس وہ مثال ہے کہ کھاؤں گھی سے نہیں جاؤں جی سے۔ کہتے ہیں کہ نماز میں ایسا استغراق ہو کہ تیر لگا ہوا نکال لیں تو خبر نہ ہو۔ جانے کہاں سے یہ درجہ گھڑ لیا ہے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس کی نماز کامل اور باخشوع ہو سکتی ہے لیکن ایسا استغراق تو حضور ﷺ کو بھی نہ ہوتا تھا۔ حضور خود فرماتے ہیں کہ میں بعض اوقات نماز میں طویل قراءت کا قصد کرتا ہوں لیکن جب کسی بچہ کے رونے کی آواز نماز میں سنتا ہوں تو اس خیال سے کہ کہیں اس کی ماں جماعت میں شریک نہ ہو بڑی سورۃ کی بجائے چھوٹی سورت پڑھتا ہوں تاکہ اس کی ماں جلدی سے فارغ ہو کر اس کو جا کر سنبھال لے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کو نماز میں ایسا استغراق نہ ہوتا تھا۔ استفسار پر فرمایا کہ نماز میں سہو ایسا استغراق کی کمی سے ہوتا ہے پھر فرمایا کہ اس کے متعلق ایک عجیب و غریب نکتہ ہے وہ یہ کہ بعض اوقات میرے ہی ذہن میں آئی ہوگی اس وقت لکھ دیا پھر بھول گیا غرض بجائے اس کے کہ علوم درسیہ میں کمال حاصل کرنے کی فکر میں رہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق محبت بڑھا دے جو ان کمالات کو بڑھاتا ہے۔ وہ ضابطہ سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اور نجات ہوتی ہے رابطہ سے اسی کی کوشش کرے اور اسی کو مانگے ہم جاہل سہی بد عقل سہی مگر اس حال میں بھی ہمیں خدا سے مانگنا چاہیے کیونکہ ہم چاہے جیسے بد حال ہوں شیطان سے تو زیادہ بد حال نہیں اس نے باوجود اس درجہ بد حال ہونے کے بھی اللہ تعالیٰ سے مانگا تو ہم کیوں نہ مانگیں ہم تو الحمد للہ مؤمن ہیں چاہے ایمان ضعیف ہی ہو جو ولایت عامہ کے لئے بھی کافی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اللہ ولی اللدین آمنوا ایخرجہم من الظلمت الی النور دیکھئے اس میں قید عملوا الصلحت کی بھی نہیں ہے۔ البتہ دوسری آیت میں ولایۃ خاصہ کا ذکر ہے الا ان اولیاء اللہ لا خوف

عليهم ولا هم يحزنون الذين آمنوا وكانوا يتقون اس ولایت میں تقویٰ کی بھی ضرورت ہے اور یوں تو اللہ تعالیٰ کی تکوینی رحمت کفار پر بھی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی حفاظت کے لئے ملائکہ متعین ہیں۔ لیکن اس کو ولایت نہیں کہتے اور یہ رحمت صرف کفار کے ساتھ یہاں دنیا میں ہے باقی وہاں آخرت میں نہیں ہوگی۔ دنیا میں اس رحمت کے عام اور آخرت میں خاص ہونے پر اسطر ادا ایک مناظرہ یاد آ گیا جو شیطان نے ایک بڑے عارف سے یعنی غالباً حضرت عبداللہ بن سہل سے کیا تھا اور ان کو اس مناظرہ میں شیطان نے ساکت کر دیا تھا۔ اس بناء پر حضرت عبداللہ نے یہ وصیت فرمادی ہے کہ شیطان سے کبھی کوئی مناظرہ نہ کرے واقعہ یہ ہے کہ شیطان نے حضرت عبداللہ سے کہا کہ آپ کیا لعنت لعنت میرے اوپر کیا کرتے ہیں خبر بھی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ورحمتی وسعت کل شیء اور میں بھی شیء میں داخل ہوں اللہ تعالیٰ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ وہ مجھ پر بھی ہوگی آپ کیا لعنت لعنت لئے پھرتے ہیں حضرت عبداللہ نے جواب دیا ہاں خبر ہے رحمت تو وسیع ہے لیکن اس میں قید بھی ہے۔ فساکتبھا للذین یتقون اس پر اس نے کہا کہ جناب قید آپ کی صفت ہی اللہ تعالیٰ کی صفت نہیں اللہ تعالیٰ مقید نہیں اس پر حضرت عبداللہ بن سہل چپ ہو گئے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ گو اس کا جواب تو تھا جو مجھ ناکارہ تک نے دیدیا ہے جس کو عرض کروں گا مگر انہوں نے بجائے اس کو جواب دینے کے اہل طریق کو یہ وصیت کی کہ کبھی شیطان سے مناظرہ نہ کرے حضرت عبداللہ بن سہل سے جو جواب نہ بن پڑا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شیطان نے ان کے ذہن میں تصرف کیا کیونکہ وہ بڑا صاحب تصرف ہے اسی طرح حضور نے بھی یہ فرمایا ہے کہ دجال کا سامنا ہو جائے تو اس سے مناظرہ نہ کریں بہت لوگ اس سے مناظرہ کرنے جاویں گے اور اس کے معتقد ہو جاویں گے۔ اس کا راز حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے جو کہیں گو منقول دیکھا نہیں لیکن جی کو لگتا ہے یہ مولانا کا کشف ہے جو حجۃ تو نہیں لیکن چونکہ نصوص میں یہ مسکوت عنہ ہے اس لئے اگر ان کے جی کو لگے جن کو مولانا سے محبت و عقیدت ہے تو اس کا کچھ مضائقہ بھی نہیں مولانا فرماتے تھے کہ اس کی حالت مجذوبوں کی سی ہوگی اس کے اقوال کی لوگ تاویل کریں گے یہاں تک کہ دعویٰ خدائی کی بھی تاویل کریں گے اسی واسطے مجذوبوں سے زیادہ تعلق رکھنا نہ چاہیے گو ان میں اگر آثار قبول پائے جاویں ان پر اعتراض بھی نہ کرے لیکن ان سے زیادہ اختلاط بھی نہ کرے اسی طرح اہل باطل سے مناظرہ بھی نہ چاہیے کیونکہ مناظرہ میں ان سے تلبس ہوتا ہے اور تلبس سے اثر ہو جاتا ہے ایک بزرگ کا یہاں تک ارشاد ہے کہ اہل باطل کے شبہات کا عوام میں ظاہر کرنا بھی مضر ہے گو ساتھ ہی انکار و بھی کر دیا جائے کیونکہ عوام کے ذہن پہلے سے خالی ہیں خود نقل کرنا ان کے ذہن میں خواہ مخواہ شبہات کا ڈالنا ہے پھر چاہے وہ زائل ہی کر دیئے جائیں کیونکہ اس صورت میں یہ بھی تو احتمال ہے کہ وہ شبہات پیدا ہو جانے کے بعد

پھر باوجود انکار کر دینے کے زائل ہی نہ ہوں۔ اسی لئے مجھے اس وقت شیطان کے اس مناظرہ کو نقل کرتے ہوئے ڈر بھی معلوم ہوا لیکن خیر یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جس کو شبہ پڑ جائے بالخصوص جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی میرے ذہن میں القاء فرما دیا ہے۔ اس کو ذرا توجہ سے سنئے البتہ اس کے سمجھنے کے لئے درسیات کی ضرورت ہے۔ درسیات بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہیں۔ علماء کے قلوب میں یہ اللہ تعالیٰ کی الہام فرمائی ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ فلسفہ اور منطق بھی جو داخل درس ہیں یہ بھی بڑے کام کی چیز ہیں گو یہ مبادی ہیں مقاصد نہیں لیکن چونکہ مقاصد کی تحصیل ان پر مبنی ہے اس لئے یہ بھی ضروری ہیں گو مقاصد کے درجہ کو نہیں پہنچتے مقاصد تو بہت عالی ہیں اگر علم کلام میں اور منطق میں مہارت ہو تو قرآن و حدیث اور فقہ کے سمجھنے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے غرض جو یہ چیزیں درس میں داخل ہیں یہ بڑے کام کی ہیں چنانچہ انہیں کی بدولت یہ اشکال بھی حل ہوا جس کی تقریر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے جن میں رحمت بھی ہے دو تعلق ہیں۔ ایک تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ اور وہ تعلق اتصاف کا ہے یعنی اس صفت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا متصف ہونا اور ایک تعلق مخلوق کے ساتھ ہے اور وہ تعلق تصرف کا ہے یعنی مخلوق میں اس صفت کا اثر ایجاد کا ہونا۔ تو جو تعلق اتصاف کا ہے وہ تو غیر مقید ہے یعنی اس میں عموم اور اطلاق ہے یعنی وہ رحمت فی نفسہ غیر محدود ہے لیکن جو درجہ مخلوق کے ساتھ تعلق کا ہے وہ مقید ہے یعنی کسی پر رحمت فرماتے ہیں کسی پر نہیں جیسے آفتاب خود پانی صفت نور میں تو مقید نہیں لیکن جب اس کا نور زمین پر فائض ہوتا ہے تو وہاں چونکہ حجابات بھی موجود ہیں اس لئے وہاں قیود بھی ہیں تو یہ قیود دھرنہیں ہے ادھر ہے خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ اپنی صفت رحمت میں بالکل مقید نہیں لیکن جب اس صفت کا تعلق مخلوق سے ہوتا ہے تو چونکہ اس کا مدار خاص اسباب کی ساتھ مشیت پر ہے۔ اس لئے اس سے جب یہ صفت متعلق ہوتی ہے تو اس قید کے ساتھ کہ جو اہل تقویٰ ہیں ان پر تو آخرت میں رحمت ہوتی ہے اور جو اہل تقویٰ نہیں ان پر نہیں ہوتی یہ جواب بھی سا لہا سال کے بعد میری سمجھ میں آیا اور غالباً میں اس وقت امرت سر میں تھا۔ جب میں لاہور دانت بنوانے گیا تو امرت سر بھی جانا ہوا تھا۔ اور چونکہ وہاں صرف ایک دن رہنا تھا اس لئے وہاں میں نے ملنے والوں کی کوئی روک تھام نہیں کی۔ احباب نے اس کا انتظام بھی کرنا چاہا مگر میں نے روک دیا کہ اس میں لوگوں کی دل شکنی ہوگی۔ برخلاف اس کے لاہور میں پہرہ چوکی کا انتظام کیا گیا۔ کیونکہ وہ بڑا شہر تھا اور دانت بنوانے کے لئے کئی دن رہنا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ہر وقت ہجوم رہتا اور جس کام کے لئے جانا ہوا تھا اس میں خلل پڑتا۔ بعض لاہور والوں نے برا بھی مانا یہاں تک کہ لوگ اخباروں میں بھی اس کی شکایت چھاپنے کو تھی غرض پنجاب میں میں ایک مسئلہ مختلف فیہ ہو گیا لاہور والے تو سمجھے کہ بڑا بدخلق ہے اور امرت سر والے سمجھے کہ بڑا خلیق ہے یاد پڑتا ہے کہ امرت سر میں میں نے یہ جواب دیا تھا وہاں اس وقت علماء کا مجمع تھا سب نے بہت

پسند کیا اور یہ فیض بھی خود عبد اللہ بن سہل ہی کا تھا کیونکہ مجھے اولیاء اللہ سے محبت ہے اور اولیاء اللہ سے جو محبت ہوتی ہے تو ان سے برکات حاصل ہوتے ہیں اگر حضرت عبد اللہ سے مجھے محبت نہ ہوتی تو مجھے ان کی طرف سے جواب دینے کی اتنی فکر نہ ہوتی میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ ان کی طرف سے جواب نہ ہو کیونکہ وہ ایسے نہیں تھے کہ لا جواب ہو جاویں اس ادب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جواب ذہن میں ڈال دیا ادب بڑی برکت کی چیز ہے اور بے ادبی اس طریق میں سخت وبال لاتی ہے چنانچہ حسین بن منصور پر جو بلا آئی وہ اسی قلت ادب کی وجہ سے اور گو وہ مغلوب تھے اسی لئے حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ان کی حمایت فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

چوں قلم در دست غدارے فتاد لاجرم منصور بردارے فتاد

اور یہاں غدار سے مراد اہل فتویٰ نہیں ورنہ غداران ہوتا بلکہ خاص ایک وزیر ہے جس نے استفتاء کر کے سزا کا حکم نافذ کیا اس کا واقعہ تاریخ میں لکھا ہے کہ علمی وزیران کا دشمن تھا۔ اس نے خود ساختہ سوال کر کے فتویٰ حاصل کیا تھا اور اسی مغلوبیت کی وجہ سے حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ میں اگر ہوتا تو کبھی فتویٰ منصور کے خلاف نہ ہونے دیتا انا الحق کی یہ تاویل کرنا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انا علی الحق یہ تو مولانا کی تاویل ہے اور میں نے ایک اور تاویل کی ہے وہ یہ کہ عقائد کا یہ مسلم مسئلہ ہے کہ حقائق الالشیاء ثابتہ تو انا الحق کے معنی یہ ہوئے کہ انا ثابتہ یعنی میں بھی منجملہ اشیاء کے ایک شی ہوں یعنی چونکہ حقائق اشیاء ثابت ہیں میرا وجود بھی حق ثابت اور مطابق واقع کے اور موجود ہے۔ تو یہ گویا سفسطائی کے مسلک کا رد ہے کیونکہ وہ لوگ اس عالم کو بالکل ایک عالم خیال سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ واقع میں کچھ ہے ہی نہیں اور یہ جو کچھ ہم کو نظر آتا ہے یہ محض وہم اور خیال ہے اور یوں تو وحدۃ الوجود والے بھی یہی کہتی ہیں مگر اس کے اور معنی ہیں وہ کہتے ہیں کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا وجود ہے ویسا ہمارا وجود نہیں ہے مگر جیسا بھی ہے وجود واقعی ہے بخلاف سفسطائی کے کہ وہ وجود کی واقعیت ہی کی نفی کرتا ہے۔ ان ہی کے مقابلہ میں اہل حق نے اول مسئلہ عقائد کا اسی کو قرار دیا ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے وجہ یہ کہ سب کا اصل الاصول مسئلہ اثبات صانع ہے اور اس کی دلیل کا مقدمہ بھی حقائق اشیاء کا ثبوت ہے کیونکہ جب کوئی چیز ثابت ہی نہ ہوگی تو وہ حق تعالیٰ کے وجود کی دلیل کیسے بن سکے گی۔ جب مصنوع نہ ہوگا تو صانع کے وجود کو کیسے ثابت کیا جاوے گا پس ابن المنصور کے قول کا محمل یہ ہو سکتا ہے اور حق بایں معنی احادیث میں مستعمل ہے چنانچہ وارد ہے البعث حق والوزن حق یعنی یہ سب چیزیں ثابت ہیں اسی طرح انا الحق کے معنی یہ ہوئے کہ میرا وجود ثابت ہے۔ گویا تاویل ہی ہے مگر بعید نہیں اور اس تاویل میں اعلیٰ کے مقدر ماننے کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اسی مغلوبیت کی وجہ سے حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ گو سخت پابند سنت ہیں اور اپنے خطوط میں اتباع شریعت کی بہت سختی سے تاکید فرماتے ہیں مگر حضرت منصور بے حد حامی

ہیں۔ حضرت مولانا روم دوسری جگہ فرماتے ہیں

گفت فرعونے انا الحق گشت پست
گفت منصورے انا الحق گشت مت

وَنَحْنُ اقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ⑥

ترجمہ: میں اس کی طرف شہرگ سے بھی زیادہ قرب ہوں۔

تفسیری نکات

قرب سے مراد قرب علمی ہے

اور خدا کا قرب یہی قرب علمی و قرب رحمت ہے اور انتم اقرب الینا۔ (تم ہماری طرف زیادہ قریب ہو) نہیں فرمایا۔ اگر کوئی کہے کہ قرب و بعد تو امور نسبیہ مکررہ مشترکہ میں سے ہیں یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ انہیں ہم سے قرب ہو اور ہمیں ان سے بعد ہو۔

جواب یہ ہے کہ قرب حسی بالمعنی الملقوی بیشک ایسا ہی ہے اور یہاں تو قرب بمعنی توجہ کے ہے سو خدا کا قرب الی العبد من حیث التوجہ قرب عبد الی اللہ من حیث خدا کا قرب بندہ کی طرف باعتبار توجہ کے بندہ کا قرب اللہ تعالیٰ کی طرف باعتبار توجہ کے التوجہ کو مستلزم نہیں بس وہ اشکال مرتفع ہو گیا۔

قرب خداوندی کا معنی

یہ کہ نحن اقرب الیہ من حبل الورد۔ (ہم اس کی طرف شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) سے بظاہر یہ لازم آتا ہے کہ جب حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں تو ہم بھی ان سے قریب ہوں کیونکہ قرب و بعد امور نسبیہ متشارکہ میں سے ہیں اور امور نسبیہ کے لئے طرفین ضروری ہیں۔ تو جب ایک شے دوسری شے سے قریب ہے تو یقیناً دوسری بھی اس سے قریب ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ زید تو عمرو سے قریب ہو اور عمرو اس سے قریب نہ ہو بلکہ اگر وہ اس سے قریب ہے تو یہ بھی اس سے قریب ہے اور اس بناء پر لازم آتا ہے کہ سارا جہان مقرب ہو جائے جو اب اس اشکال کا یہ ہے کہ یہ بات قرب حسی و قرب مکانی میں ہوا کرتی ہے کہ ایک شے کا دوسری سے قرب ہونا اس کے قرب کو بھی مستلزم ہے اور یہاں حق تعالیٰ کو بندہ سے اور بندہ کو حق تعالیٰ سے جو قرب ہوتا ہے وہ قرب مکانی حسی نہیں بلکہ قرب علمی ہے اور قرب علمی میں یہ لازم نہیں کہ اگر ایک شخص کو دوسرے سے قرب علمی حاصل ہو تو دوسرے کو بھی اس سے قرب علمی حاصل ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک کو دوسرے کا علم ہو اور

دوسرے کو اس کا علم نہ ہو جیسا اوپر ایک مثال کے ضمن میں بتلایا گیا ہے۔ پس خدا تعالیٰ کو تو سب بندوں سے قرب علمی حاصل ہے مگر بندوں میں سب کو خدا تعالیٰ سے قرب علمی حاصل نہیں کیونکہ بہت سے اس سے غافل ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے نحن اقرب الیہ (ہم اس سے زیادہ قریب ہیں) فرمایا ہے۔ ہوا قرب الینا۔ (وہ ہماری طرف زیادہ قریب) نہیں فرمایا۔

(فان قلت اذا كان القرب من الامور النسبية يلزم فی القرب العلمی ایضاً من قرب احد الشیخین بالآخر قربه به قلت الذی يلزم فی القرب العلمی من قرب احدهما بالآخر هو كون الآخر قریباً منه من حیث العلمیة دون العایلة فمراو الشیخ ان قرب شی بالآخر من حیث العایلیة لا یستلزم قرب الاخر به من هذه الحیثیة فیجوز ان یکون احد عالماً بک و تكون انت انت جاهلاً به و اما ان قرب شی بالآخر من حیث العالمیة لا یستلزم قربه به من حیث المعلومیه ایضاً فلم یرده الشیخ اصلاً ۱۲ جامع)

اور یہ کوئی چیتاں نہیں ہے اس کی حقیقت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کا علم تو ہمارے ساتھ ہر وقت متعلق ہے اس لئے وہ اپنے علم سے ہمارے بہت نزدیک ہیں اور ہمارا علم حق تعالیٰ کے ساتھ یا تو متعلق ہی نہیں ہے یا متعلق ہے تو ہر دم متعلق نہیں اس لئے ہم اپنے علم سے حق تعالیٰ سے ہر دم قریب نہیں ہیں خوب سمجھ لو۔

ان فی ذلک لذكری لمن کان له قلب او القی السمع وهو شهید (اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا متوجہ ہو کر کان ہی لگا لیتا ہے) عربی زبان جاننے والے سمجھ لیں گے کہ فی ذلک کا اشارہ مذکورہ قصہ کی طرف ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ اشارہ نہ من حیث القصہ ہے بلکہ بحیثیت اس قصہ کے جزو قرآن ہونے کے ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس جزو قرآن سے نفع کس کو حاصل ہو گا۔ جس پر من کان له قلب (جس کے پاس دل ہو) صادق ہو اور ظاہر ہے کہ قرآن بتامہ بندوں کے نفع ہی کے لئے اتارا گیا ہے تو کسی جزو کی تخصیص کوئی معنی نہیں رکھتی تو یہاں گو ذلک کا اشارہ ایک جزو ہے لیکن مراد کل قرآن ہو تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن سے انتفاع کا طریقہ یہ ہے جو بیان ہو گا نہ کہ صرف اس قصہ سے انتفاع کا طریق جو اس سے اوپر مذکور ہے تو سارے ہی قرآن کی یہ حالت ہوئی کہ اس سے انتفاع شرائط مدلولہ آیت پر موقوف ہے۔ یہ مضمون مجھے اس وقت ضروری معلوم ہوا کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ قرآن تو یہ لوگ پڑھتے ہیں بلکہ اگر یہ بھی کہا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا کہ گذشتہ زمانہ سے زیادہ آج کل تلاوت قرآن کی جاتی ہے۔ بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ مخالفین اسلام بھی قرآن پڑھتے ہیں۔ لیکن یہ دعوے سے کہا جاتا ہے کہ انتفاع بالقرآن (قرآن سے نفع حاصل کرنا) پہلے سے بہت کم بلکہ قریب قریب مفقود ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شرائط انتفاع جمع نہیں بس اس آیت میں انہیں شرائط کا بیان ہے۔ ان فی ذلک لذكری لمن کان له قلب او

القى السمع وهو شهيد. (اس میں اس شخص کیلئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا وہ متوجہ ہو کر کان ہی لگا دیتا ہو) اور ان شرائط، بیان قرآن میں اور بھی بہت جگہ ہے اور ان کو جا بجا مختلف عنوانات سے بیان فرمایا ہے کہیں فرمایا ہے ذکرى، للمؤمنين۔ (مومنوں کے لئے عبرت ہے) اور کہیں عبرة لا ولى الابصار۔ (اہل بصیرت کے لئے عبرت ہے) اور کہیں فرمایا لمن اراد ان يذكر۔ (یعنی اس میں اس شخص کے لئے عبرت ہے جس کا ارادہ عبرت حاصل کرنے کا ہے) اور کہیں ان فى ذلك لعبرة لمن يخشى (اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لئے جس کو خوف خدا ہو) نزول قرآن تو گو نفع عام کے لئے ہے مگر نفع ہوتا ہے شرائط کے ساتھ اس کو اس مثال سے سمجھ لو ایک طبیب نے دو شخصوں کے لئے مسہل تجویز کیا اور دونوں کو طریقہ مسہل لینے کا اور شرائط مسہل کے مفید ہونے کے بتائے ان میں سے ایک نے تو مسہل کو ان شرائط کے ساتھ استعمال کیا اس کو خاطر خواہ نفع ہوا اور دوسرے نے بغیر شرائط کے استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کو نفع نہ ہوگا بلکہ عجب نہیں کہ نقصان پہنچ جائے۔ یہاں کیا بات ہے ظاہر ہے کہ طبیب نے تو دونوں کے نفع کے لئے واسطے مسہل تجویز کیا تھا لیکن ایک کو طبیب کی تجویز نافع ہوئی اور دوسرے کو نافع نہ ہوئی وجہ کیا ہے یہی کہ نفع مشروط بالشرائط تھا۔ واذافات الشروط المشروط (جبکہ شرط فوت ہو جاتی ہے مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے) شرائط نہیں پائی گئیں نفع بھی نہیں ہوا میں نہیں کہا جاسکتا کہ طبیب کی تجویز مفید نہیں تھی وہ تو تکلیف تھی چنانچہ دوسرے کو نفع ہوا اور اس کو جو نفع نہیں ہوا تو بوجہ شرائط موجود نہ ہونے کے نہ ہوا اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اثر کے لئے صرف شے نافع کا وجود کافی نہیں بلکہ وجود مع الشرائط ہونا چاہیے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک ہر کام میں یہی بات ہے کہ اثر کے لئے کچھ شرائط ہوتے ہیں کہ بدوں ان کے اثر مترتب نہیں ہوتا۔ اب لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر اثر نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے پھر یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ اثر نہیں ہوا۔

قرآن پاک میں تدبیر کی ضرورت

نہ معلوم کیا بات ہے صاحبو! قرآن میں کمی نہیں ہم میں کمی ہے۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ قرآن ہی چیز سے اثر نہ ہو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لو انزلنا هذا القرآن على جبل لرايته خاشعاً متصدعاً من خشية الله۔ یعنی اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو وہ پاش پاش اور ریزہ ریزہ ہو جاتا خدا کے خوف سے تعجب ہے کہ پہاڑ جیسی سخت چیز قرآن سے متاثر ہو اور ریزہ ریزہ ہو جائے اور انسان جیسی نرم چیز متاثر نہ ہو گو دونوں جگہ اثر حسب اقتضائے حکمت مختلف ہو مثلاً انسان چونکہ مکلف ہے اس لئے اس میں تصدع غالباً اس لئے خلاف حکمت ہو کہ پھر مکلف بہ یعنی قرآن کا نزول عبث ٹھہرتا ہے کہ عامل ہی مفقود ہو جائے گا اس لئے اس میں اثر صرف خشوع کافی ہوگا اور احیاناً تصدع و زہوق روح ہو جانا اس لئے خلاف حکمت نہیں کہ اس سے مکلف بہ کا

عبث ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ دوسرے مکلفین تو موجود ہیں غرض انسان میں خشوع تو عام ہو مگر یہ بھی نہیں جس کی وجہ دوسری جگہ فرماتے ہیں افسلابتد برون القرآن ام علی قلوب افعالها۔ یعنی قرآن کو غور سے نہیں دیکھتے بلکہ دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں یہی بات ہے کہ قرآن کی آیتوں میں تدبیر نہیں کیا جاتا اور دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں جن لوگوں نے تدبیر سے قرآن کو دیکھا خواہ موافقین نے یا مخالفین نے تو اثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ کیسے کیسے پتھر موم ہو گئے کیسے کیسے معاندوں نے گردن جھکا دی اس سے تاریخ بھری پڑی ہے کسی زمانہ میں قرآن میں یہ اثر تھا کہ معاندین اس کے سامنے پانی ہوتے تھے اس واسطے اس کے سننے سے بچتے تھے کہ ہمارے اوپر اثر نہ ہو جائے اور اب لوگوں کو جو اس پر ایمان کے مدعی ہیں اور جو اس کو پڑھتے ہیں شکایت ہے کہ اثر نہیں ہوتا اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن کو پڑھتے ہیں مگر تدبیر کے ساتھ نہیں پڑھتے صرف الفاظ پڑھ لیتے ہیں اور یہ بھی ان کا ذکر ہے جو الفاظ کو پڑھتے ہیں ورنہ اب تو دماغوں میں یہ خبط بھی پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ جتنا وقت اس میں صرف کیا جائے اتنے وقت میں کوئی ڈگری کیوں نہ حاصل کی جائے اور تدبیر و عمل کو جو ہم شرط نفع کی کہہ رہے ہیں یہاں نفع سے خاص نفع یعنی اثر مراد ہے اور مطلق نفع کی نفی نہیں مثلاً ایک حرف پر دس نیکیاں ملنا حدیث میں آیا ہے۔ اس میں یہ شرط نہیں اور یہ لوگ حسانت ہی کو لاشے محض سمجھتے ہیں پس ہمارا مقصود اور ہے ان کا اور۔ خلاصہ یہ کہ بہت سے مسلمان تو قرآن پڑھتے ہی نہیں اور جو پڑھتے بھی ہیں تو تدبیر کے ساتھ نہیں پڑھتے جس پر بروئے آیت مذکورہ نفع حاصل ہونا موقوف ہے پھر شکایت عدم نفع کی کیسی۔ مسلمانوں کو تو قرآن سے لگاؤ ہی نہیں رہا اور اس کے ساتھ یہ جہل مرکب ہے کہ قرآن سے نفع نہیں ہوتا قرآن سے نفع کیسے ہو جب تم اس سے لگاؤ بھی نہیں رکھتے اس سے تعجب ہوگا کہ مسلمانوں کو قرآن سے لگاؤ نہیں رہا کیوں کہ قرآن کیسے کیسے عمدہ چھپے ہوئے گھروں میں ہیں۔ تلاوت بھی کی جاتی ہے پھر یہ کیسے کہا جائے کہ قرآن سے لگاؤ نہیں رہا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن سے مراد میری صرف لکھا ہوا قرآن نہیں ہے۔ جس کی تلاوت کی جاتی ہے بلکہ جس کے بہت سے اجزاء ہیں جیسے عقائد اعمال معاشرت معاملات اخلاق یہ سب وہ اجزاء ہیں جن کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں تصوف بھی انہیں اجزاء میں داخل ہے کیونکہ تصوف کی تعریف گیر واکپڑے پہننا تعویذ گنڈے کرنا یا کشف و کرامات نہیں ہے بلکہ تصوف کی تعریف ہے تعمیر الظاہر والباطن (ظاہر و باطن کی درستی) اس تعریف کی بناء پر اس کا دین ہونا ظاہر ہے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرَى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۝

ترجمہ: اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا وہ (کم از کم دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو۔

تفسیری نکات

قرآن سے نفع حاصل کرنے کی شرائط

وہ طریقے کیا ہیں اسی کو فرماتے ہیں ان فی ذلک لذکرى یعنی اس بیان میں (اس سے اوپر اہم سابقہ کے کفار کے ہلاک کا ذکر ہے) نصیحت ہے مگر کس کو جس میں دو باتیں ہوں اور دو کا ذکر علی سبیل منع خلو ہے۔ یعنی دونوں سے خالی نہ ہو خواہ دونوں جمع ہو جائیں چنانچہ یہاں ہر واحد بھی کافی ہے اور دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے اس پر دلائل مستقلہ قائم ہیں (اس کا بیان بقدر ضرورت ختم وعظ کے قریب جہاں القی السمع کا بیان شروع ہوا مذکور ہے ۱۲) وہ دو باتیں کیا ہیں لمن کان له قلب۔ جس کے پاس قلب ہوا والقی السمع۔ یعنی کان کو متوجہ ہو کر لگا دے ان دونوں لفظوں کا ترجمہ ذرا سا ہے اور لفظ بھی چھوٹے چھوٹے ہیں اس اختصار سے تعجب ہوگا کہ ذرا ذرا کی چیزیں ہیں اور ذرا سی بات ہے جس پر تمام دین کا نفع مبنی ہے۔ اس تعجب کا رفع میں کئے دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ سمجھ لیجئے کہ قرآن منطق کی اصطلاح میں نہیں نازل ہوا بلکہ سامعین کے محاورات میں نازل ہوا ہے یہ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورے میں ہے کہ یہ دل گردہ والے کا کام ہے اس کے اگر لغوی معنی لئے جائیں تو کلام بلاغت سے بہت ہی گرا ہوا ہو جاتا ہے بلکہ مفہوم ہی غلط ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں تو یہ معنی ہو جائیں گے کہ جس کے جسم میں دل اور گردہ ہو وہ یہ کام کر سکتا ہے سو دل اور گردہ تو ہر انسان کے جسم میں موجود ہیں تو اس کے تو یہ معنی ہو گئے کہ ہر انسان یہ کام کر سکتا ہے حالانکہ یہ جملہ بولا جاتا ہے ایسے موقع پر کہ اس کام کو ہر انسان نہ کر سکے۔

لغت اور محاورہ میں فرق

بات یہ ہے کہ لغت اور محاورہ میں فرق ہوتا ہے وہ یہ کہ محاورہ میں لغوی معنی پر ایک زیادتی ہوتی ہے کہ وہ ہی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً یہاں دل سے مراد لغوی دل نہیں بلکہ وہ دل مراد ہے جس میں صفات دل ہوں اور گردہ سے مراد لغوی گردہ نہیں بلکہ وہ گردہ مراد ہے جس میں صفات گردہ ہوں اور دل کی صفت ہے ہمت اور گردہ کی صفت ہے قوت تو اس لفظ کے یہ معنی ہوئے کہ یہ کام وہ کر سکتا ہے جس میں ہمت و قوت ہو دیکھئے اب یہ لفظ کیسا

بلوغ ہو گیا اور اس موقع پر کیسا چسپاں ہو گیا جس میں یہ بولا جاتا ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ایک حاکم کہتا ہے کہ ہمیں ایک آدمی کی ضرورت ہے اس کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ ایک ایسا شخص تلاش کیا جائے جس پر آدمی کا اطلاق ہو یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اب کسی نے اس پر یہ عمل کیا کہ ایک ایسے انسان کو جو نہایت درجہ بیمار اور اپاہج ہے ڈولی میں ڈال کر لے آیا اور حاکم کے سامنے پیش کر دیا کہ لیجئے حضور آدمی حاضر ہے حالانکہ اس میں کسی کام کے کرنے کی قوت تو درکنار حواس بھی پورے موجود نہیں۔ بس ایک مضغہ گوشت ہے۔ ہاں سانس چل رہا ہے اب آپ ہی فرمائیے کہ کیا اس کے حکم پر عمل ہو گیا۔ لفظ تو ہو گیا کیونکہ آدمی کا اطلاق اس پر صادق آتا ہے آخر وہ بھی اولاد آدم تو ہے ہی۔ اور از روئے منطق بھی وہ آدمی ہے کیونکہ حیوان ناطق ہے اور ناطق کے معنی بولنے والا نہیں جیسا کہ عرف عام میں سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کے معنی ہیں مدرک کلیات و جزئیات جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں یہ سب کچھ ہے لیکن اس حاکم کے سامنے ایسے مریض انسان کا پیش کرنا احتمال امر نہیں سمجھا جاتا۔ وجہ کیا ہے جو اغراض آدمی کے متعلق ہیں جن کے واسطے حاکم آدمی مانگتا ہے وہ اس سے حاصل نہیں ہیں حتیٰ کہ اگر کمزور آدمی کو بھی پیش کیا جائے تو اس کو بھی وہ منظور نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ تو ایسے آدمی کو چاہتا ہے جو خدمت گزاری اچھی طرح کر سکے اور یہ کام بہت بڑے کٹے اور توانا و تندرست آدمی کا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس کام کے لئے آدمی چاہیے اگر اس سے وہ کام نہیں ہو سکتا تو اس سے آدمیت ہی کی نفی کی جاتی ہے۔ اسی معنی کر یہ کہا گیا ہے

آزما کہ عقل و ہمت تدبر روئے نیست خوش گفت پردہ دار کہ کس در سرائے نیست
(جو شخص عقل و ہمت و تدبیر و رائے نہیں رکھتا پردہ دار نے خوب کہا کہ سرائے گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے)
دیکھئے کس کی نفی کی ہے حالانکہ وہاں آدمی موجود ہیں وجہ یہی ہے کہ وہ محض لغوی آدمی ہیں ایسے آدمی نہیں جن سے وہ غرض پوری ہو جو آدمی سے پوری ہوتی ہے یعنی لغوی آدمی ہیں اصطلاحی نہیں ہیں۔ امراء کے ہاں تو یہ محاورہ بہت مستعمل ہے کہا جاتا ہے کہ آپ فلاں تجارت شروع کیجئے یا فلاں محکمہ کھولنے تو کہتے ہیں میں مجبور ہوں میرے پاس کوئی آدمی نہیں ہے یعنی اس کام کا آدمی نہیں ہے یوں لغوی آدمی تو بہت سے موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ محاورات میں محض لغت پر نظر نہیں ہوتی بلکہ حصول اغراض پر نظر ہوتی ہے۔

لمن کان له قلب کا مفہوم

اب سمجھ میں آ جائے گا کہ لمن کان له قلب کے کیا معنی ہیں۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ جسکے جسم میں دل بمعنی مضغہ گوشت ہو بلکہ وہ دل ہو جس سے وہ اغراض حاصل ہو سکیں جس کے لئے دل ہوتا ہے وہ اغراض کیا ہیں۔ ادراک یعنی بھلے برے کو سمجھنا اور ارادہ جس سے نافع کو اختیار اور مضر کو ترک کر سکے۔ ان کو شرعی اصطلاح میں علم

وعزم کہتے ہیں تو دو صفت ہوئیں قلب کی علم اور عزم۔ میں نے دونوں لفظ (یعنی علم اور عزم) پہلے نہیں استعمال کئے بلکہ بجائے ان کے دوسرے الفاظ یعنی ادراک و ارادہ۔ اس واسطے کہ آج کل ایسی بد مذاقی پھیل رہی ہے کہ اپنے علوم یعنی علوم دیدیہ کی اصطلاحوں سے بھی اجنبیت ہو گئی اسی واسطے میں نے اول عام محاورات سے تفہیم کر کے اس کے بعد ان لفظوں کا استعمال کیا۔ غرض دو صفت ہیں قلب کی علم اور عزم جب یہ دونوں صفتیں موجود ہوں گی تب کہا جائے گا کہ اس پر لمن کان له قلب صادق ہے۔

قرآن پاک سے منتفع ہونے کا ایک گر

اسی قبیل سے یہ لفظ ان فی ذلک لذكری لمن کان له قلب (اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لئے جس کے پاس دل ہے) اس میں بھی ایک ضابطہ بتلایا گیا ہے۔ قرآن سے منتفع ہونے کا۔ اس میں سب باتیں دین کی داخل ہو گئیں اور یہ ضابطہ ایسا جامع ہو گیا جیسے حساب دانوں کے یہاں گر ہوتے ہیں جن کو گریا دہوتے ہیں وہ کیسی جلدی حساب کر لیتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ گر جانتے ہیں۔ باقاعدہ ضرب تقسیم کرنے والا جس حساب کو منٹوں میں نکالے گا اس کو گر جاننے والے سیکنڈوں میں نکال دیتے ہیں۔ اور باقاعدہ حساب لگانے والے کو قلم دو ات پنسل کاغذ تختی سلیٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور گر جاننے والوں کی زبان پر حساب کے گر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بات یہی ہے کہ ان کو حساب کے گریا دہوتے ہیں مثلاً جتنے روپے کی سیر بھر چیز اتنے آنے کی چھٹانک بھریا جتنے روپیہ کا ایک گز کپڑا اتنے آنے کا ایک گرہ۔ اس سے ہزاروں روپیہ کا حساب ذرا سی دیر میں زبانی ہی لگایا جاتا ہے۔ غرض گر بھی تو ایک ضابطہ ہی کا نام ہے جو استقرار کے بعد وضع کر لیا جاتا ہے۔ گر کا فائدہ یہ ہے کہ حساب کرنے میں بہت سہولت اور جلدی ہوتی ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی اس آیت میں گر بتا دیا ہے۔ قرآن سے منتفع ہونے کا۔ تو دیکھئے ایک گر کتنے استقرار کے بعد وضع ہوتا ہے اگر ہم قرآن سے نفع اٹھانے کا گروضع کرتے تو کتنے استقرار کی ضرورت ہوتی اور کتنے زمانہ میں اس میں کامیابی ہو سکتی تھی پھر بھی ہمارا ذہن کہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ لہذا یہ بالکل سچی بات ہے کہ برسوں کی محنت بھی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی پس قدر کیجئے حق تعالیٰ کی رحمت کی کہ ہم کو اس محنت سے بچا دیا اور اپنی طرف سے خود ہی اس گر کی تعلیم کر دی جس کا مختصر عنوان علم و ہمت ہے۔

یہ ایک تفصیل تھی آیت کے ایک جزو ان فی ذلک لذكری لمن کان له قلب اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لئے جس کے پاس دل ہے اب آیت کا دوسرا جزو رہ گیا یعنی او القی السمع و هو شہید جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یا اس شخص کو نفع ہو گا قرآن سے جس نے قرآن کو سنا توجہ کے ساتھ کان لگا کر

اس تقابل پر نظر ظاہر میں شبہ ہو سکتا ہے کہ کان لگا کر سننا یہ بھی ایک ذریعہ علم ہی ہے تو معنی یہ ہوئے کہ جس کو علم ہو اس کو نفع ہوگا قرآن سے اور لمن کان لہ قلب میں بھی یہی مضمون تھا جیسا آپ نے اس کا حاصل سنا کہ جس قلب میں علم و عزم ہو۔ تو اس دوسرے جملہ میں باعتبار علم کے بلکہ ظاہر تکرار ہو گیا۔

معلومات کی دو قسمیں

اس شبہ کا حل یہ ہے کہ معلومات دو قسم کی ہوتی ہیں ایک وہ جو بدوں نے سمجھ میں آ سکتی ہیں اور ایک وہ جو بدوں نے سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ اول کی مثال مسئلہ وجود صانع ہے کہ سننے پر موقوف نہیں۔ دنیا میں کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی ایسا نہیں جو فعل کے لئے فاعل کی ضرورت نہ سمجھتا ہو اور دوسری کی مثال مسئلہ معاد ہے اور کیفیت حشر و نشر و جنت و نار ہے کہ اس کا علم بلا سماع کے نہیں ہو سکتا تو لمن کان لہ قلب (اس شخص کے لئے جس کے پاس دل ہے) متعلق ہے قسم اول کے معنی یہ ہوئے کہ جس کا قلب سلیم ہو یعنی اس میں عقل سلیم سے استعداد ہو صحیح بات کے سمجھنے کی چنانچہ صاحب جلالین نے قلب کی تفسیر عقل سے کی ہے اور القی السمع متعلق ہے قسم دوم کے معنی یہ ہوئے کہ جو باتیں مدرک بالعقل نہیں جن کو سمعیات کہتے ہیں ان کے متعلق یہ عادت ہو اس شخص کی کہ غور سے سناوہ عناد نہ کرے جیسے بعض کفار نے کہہ دیا تھا کہ قلوبنا فی اکنۃ مما تدعوننا الیہ وفی اذاننا وقر ومن بیننا و بینک حجاب یعنی جس بات کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں اس کی طرف سے ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک پردہ پڑا ہوا ہے مطلب یہ کہ تمہاری دعوت کو قبول کرنا تو کہاں ہم تمہاری بات سننا بھی نہیں چاہتے۔ یہ عناد ہے تو جس شخص میں یہ عناد نہ ہوگا بلکہ غور سے سنے گا قرآن کو تو اس کو بھی نفع ہوگا اور قرآن جو باتیں سمعیات کی قسم سے بتائے گا وہ اس کی سمجھ میں آ جائیں گی کیونکہ وہ باتیں سب حق ہیں عناد سے ان پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جب عناد نہ ہوگا تو ان کی واقعیت قلب میں بٹھتی چلی جائے گی۔

قلب سلیم

تو حاصل یہ ہوا کہ جس میں ایسا قلب ہو کہ عقلیات میں صفت سلامت رکھتا ہو اور بات کو صحیح سمجھتا ہو (اور یہ حاصل ہے جزو اول کا) اور سمعیات میں قرآن کو کان لگا کر توجہ سے سنے عناد نہ کرے تو اس کو نفع ہوگا۔ اب جملہ او القی السمع (یا متوجہ ہو کر کان لگائے) میں تکرار نہ رہا تقابل ہو گیا اب ایک شبہ رہا کہ اوپر جو قلب کی صفات بیان کی گئی ہیں اس میں کسی علم کی تخصیص نہیں تھی۔ اور تقابل کا مدار تخصیص ہے تو تعمیم میں پھر

تقابل نہ رہا جواب یہ ہے کہ یہ تقابل منطقی نہیں کہ ایک دوسرے کا جزو نہ ہو تقابل عرفی ہے جس کے لئے بعض اجزاء کا تقابل بھی کافی ہے۔ پھر یہ تقابل تضاد کا نہیں ہے بلکہ مانعہ الخلو ہے کیونکہ دونوں صفتیں ایک شخص میں جمع ہو سکتی ہیں اور صحت حکم کے لئے فرد واحد کافی ہے (کما سیاتی) (جیسا کہ عنقریب آتا ہے) جو شان ہوتی ہے مانعہ الخلو کی چنانچہ شروع وعظ کے ذرا بعد دل گردہ کی مثال سے ذرا پہلے مانعہ الخلو ہونے کی تصریح ہے۔

ثم رایت بعد سنین فی روح المعانی ما یقارب هذا باختلاف العنوان مع الحکم بكونه مانعة الخلو والله الحمد ولهذا التقابل وجوه اخرى محتملته (چند سال کے بعد میں نے روح المعانی میں اختلاف عنوان سے اس کے قریب قریب دیکھا مع حکم مانعہ الخلو کے الحمد للہ اس تقابل کے لئے اور بھی وجوہ محتمل ہیں) اب ان متقابلین میں جو امر مشترک ہے اور وہ امر مشترک روح ہے شرائط کی وہ قلب سلیم ہے کیونکہ عناد نہ ہونا بھی صفت قلب ہی کی ہے تو مدار آخرت قلب ہی پر ٹھہرا تو یہ معنی ہوئے کہ جس شخص میں ایسا قلب ہو جس کو قلب کہا جاسکتا ہے کہ عقلیات کے متعلق بھی سلیم ہو اور سمعیات کے متعلق بھی سلیم ہو اس کو نفع ہوگا قرآن سے اور چونکہ یہ سب آثار قلب سلیم کے لوازم سے ہیں تو بواسطہ ملزوم کے ان سب لوازم میں بھی تلازم ہوگا۔ تحقق ملزوم کے وقت تو تلازم عقلی اور صرف ایک لازم کے تحقق کے وقت تلازم عرفی اس لئے ہر واحد کے تحقق کو صحت حکم کے لئے کافی کہیں گے (یہ بیان ہے سیاتی کا جو ابھی گذرا خلاصہ یہ کہ قرآن نصیحت ہے قلب سلیم کے لئے۔ تو قلب کو سلیم بنائیے پھر دیکھئے قرآن سے کیا کیا چیزیں حاصل ہوں گی۔ جب قلب سلیم ہوگا تو قرآن سے اس میں صفت علم بڑھے گی اور اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی اسی کے بارہ میں کہا ہے۔

بنی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر انبیاء جیسے علوم بغیر کتاب و اوستا اور معین کے دیکھو گے)

یعنی وہ علوم پیدا ہوں گے کہ تمام علوم ان کے سامنے گرد نظر آئیں گے اور ہر چیز کی حقیقت منکشف ہو گی وہ علوم ہوں گے جن کو علوم کہنا صحیح ہے۔ سفلی اور اوہام نہ ہوں گے دنیا کے عقلاء ان کے سامنے سر جھکائیں گے اور اس علم کی برکت سے ہمت کا تراپد کی بھی یہ کیفیت ہوگی کہ کسی کا خوف اس کے دل میں نہ رہے گا دنیا بھر ایک طرف اور وہ ایک طرف۔

چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش

موحد چہ درپائے ریزی زرش

ہمیں است بنیاد توحید و بس

امید و ہر اش نباشد زکس

(موحد کے قدموں پر سونا نچھاور کر خواہ اس کے سر پر تلوار ہندی رکھو امید و خوف اس کو کسی سے نہ ہوگا۔ بس توحید کی بنیاد یہی ہے)

نہ کسی کے خوف سے حق سے وہ منحرف ہوگا نہ کسی لالچ سے وہ حق کو چھوڑے گا اور ہمت کی قوت کی وہ حالت ہوگی۔

الحاصل

اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا اگر فہیم زیادہ نہ ہو تو کم از کم یہی ہو کہ وہ (دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو (اور سن کر اجمالاً حقانیت کا معتقد ہو کر اتباعاً لاہل الفہم اس بات کو قبول کر لیتا ہو) آہ تو ضیح مزید جدید و مفید پہلی شان محقق کی ہے اور دوسری مقلد کی یعنی تذکر کے لئے یہ شرط ہے کہ مخاطب محقق ہو یا مقلد۔ فقط

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا

مَسْنَا مِنْ لُغُوبٍ ۖ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ

الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ۚ

ترجمہ: ہم نے بیشک آسمان زمین کو اور ان کی درمیانی اشیاء کو چھ دن میں پیدا کیا مگر ہم کو کچھ تھکن ذرا بھی نہیں ہوئی (کیونکہ یہ تو تاثر ہے جو ممکن کی شان سے ہے واجب کو تاثر نہیں ہوا کرتا) پس آپ ان (یہودیوں) کی باتوں پر صبر کیجئے (زیادہ رنج نہ کیجئے) اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہئے افتاب نکلنے سے پہلے اور چھپنے سے پہلے۔

تفسیری نکات

شان نزول

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کے اس قول سے سخت رنج پہنچا تھا ان اللہ استلقی علی العرش فی یوم السبت للراحة (نعوذ باللہ منہا) کہ اللہ تعالیٰ چھ دن میں آسمان و زمین پیدا کر کے ساتویں دن یعنی سنیچر کو عرش پر لیٹ گئے تاکہ تھکن دور ہو اور آرام ملے نعوذ باللہ نعوذ باللہ اور اس پر یہود کے قول کے رد کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ ولقد خلقنا السموات والارض وما بینہما فی ستة ایام وما مسنا من لغوب فاصبر علی یقولون۔

صلوٰۃ معین صبر ہے

اس کے بعد یہ بڑھایا و سبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب جس میں نماز کا حکم ہے اب دیکھنا چاہیے کہ اس کو تسلی میں کیا دخل ہے کیونکہ یہ قرآن ہے جس کا لفظ لفظ مربوط ہے۔ کوئی بات بے ربط نہیں تو فاصبر علی ما یقولون کے بعد تسبیح بمعنی صلوٰۃ کا امر یہ بتلاتا ہے کہ صلوٰۃ معین صبر ہے اور یہ ایسی اعانت ہے جیسے عاشق کو کسی دشمن کی گستاخی سے جو اس نے محبوب کی شان میں کی ہو رنج ہوا ہو اور محبوب یہ کہے کہ تم ان باتوں سے رنج نہ کرو آؤ تم ہم سے باتیں کرو۔ بے ہودوں کی باتوں کو چھوڑو غور کیجئے محبوب کی اس بات سے عاشق کو کس قدر تسلی ہوگی۔ اس طرح حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ ان کی بیہودہ باتوں سے رنج نہ کیجئے آئیے نماز میں ہم سے باتیں کیجئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنج کا اندازہ دوسری آیت سے ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں قد نعلم انه لیحزنک الذی یقولون فانہم لا یكذبونک و لكن الظلمین بایات اللہ یحجدون ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کافروں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے۔ آگے مشہور تفسیر تو یہ ہے اور میں نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ فانہم لا یكذبونک علت ہے ایک جملہ محذوفہ کی تقدیریوں ہے فلا تحزن و کل امرہم الی اللہ فانہم لا یكذبونک السخ یعنی آپ غم نہ کیجئے اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیجئے کیونکہ یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے ہیں۔ (کیونکہ آپ کو تو محمد امین کہتے اور صادق مانتے تھے) بلکہ یہ ظالم تو خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ (سو آپ کس لئے رنج کرتے ہیں وہ آپ کو تو کچھ نہیں کہتے ہماری آیتوں سے گستاخی کرتے ہیں سو ہم خود نمٹ لیں گے) مگر ایک بار مجھے ذوقاً دوسری تفسیر سمجھ میں آئی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عشق مع اللہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اس مشہور سے یہ ابہام ہوتا ہے کہ حضور کو آیات الہیہ کی تکذیب سے رنج نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنی ذات کے ساتھ جب کوئی خلاف بات ہو اس وقت رنج ہونا چاہیے حالانکہ آپ کے عشق و محبت کا مقتضایہ ہے کہ آپ کو کفار چاہے کتنا ہی کہہ لیتے اس سے آپ کو زیادہ رنج نہ ہوتا آپ کو تو بڑا رنج اسی کا تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ گستاخی کرتے اور آیات الہیہ کی تکذیب کرتے تھے پس خاص اس اعتبار سے اس کی تفسیر قریب یہ ہو سکتی ہے کہ فانہم لا یكذبونک علت ہے لیحزنک الذی یقولون کی اور ترجمہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کو کفار کی باتوں سے بہت رنج ہوتا ہے کیونکہ اس لئے کہ وہ آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اگر آپ ہی کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو آپ کو زیادہ غم نہ ہوتا مگر آپ کو تکذیب آیات الہیہ کا تحمل نہیں ہو سکتا اس صورت میں حذف و تقدیر کی بھی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر آپ کی شان عشق

کے بھی موافق ہے اور اس حدیث کے بھی موافق ہے۔ کان لا ینتقم لنفسه فی شیء الا ان تنتھک حرمت اللہ فینتقم فیہا للہ او کما قال . کہ آپ اپنے واسطے اپنی ذات کے لئے کسی سے کسی بات میں انتقام نہ لیتے تھے ہاں اگر حرمت کی توہین ہوتی دیکھتے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے لئے انتقام لیتے تھے اور گو ظاہر ایہ تفسیر سیاق سے بعید ہے مگر ایک بار ذوقاً کچھ قریب معلوم ہوئی تھی اسی لئے اس مقام پر اپنے دعوے کی تائید میں اس کو ذکر کر دیا گو وہ دعوے اس پر موقوف نہیں بلکہ ظاہر ہے کہ آپ کو کفار کی ان گستاخیوں سے جو حضرت حق کی شان میں وہ کرتے تھے سخت رنج ہوتا تھا تو ایسے شدید حزن کے لئے نہایت قوی تسلی کی ضرورت ہے اور یہاں تسبیح بمعنی صلوة کو تسلی کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور عادتاً عاشق کو تسلی کسی چیز سے ایسی نہیں ہوتی جیسے محبوب کے قرب و مشاہدہ سے ہوتی ہے پس معلوم ہوا کہ نماز میں ایسا قوی قرب و مشاہدہ ہوتا ہے جو کسی اور امر سے نہیں ہوتا۔

سُورَةُ الذَّارِيَاتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

كَانُوا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے۔

تفسیری نکات

ربط

وبالا سحار ہم يستغفرون کا ربط کانوا قليلاً من الليل ما يهجعون سے ظاہر میں یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ رات کو تہجد پڑھنے سے استغفار بالاسحار کو کیا تعلق ہے بعض مفسرین نے تو یہ کہا کہ وہ معاصی سے توبہ کرتے ہیں اور اسحار کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہ وقت اجابت دعا کا ہے اور تہجد سے استغفار کا تعلق یہ ہے کہ وہ جلب منفعت ہے اور یہ دفع مضرت ہے۔ اور بعض نے کہا کہ وہ تہجد پڑھ کر اس طاعت ہی سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ طاعات بھی معاصی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ زیادہ سہل اور ظاہر یہ ہے کہ وہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں اور اخیر شب میں لذت طاعات سے یہ اس لذت کے آثار سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ اس وقت یہ حال ہوتا ہے۔

۔ چہ خوش وقتی و خرم روزگارے کہ یارے برخوردار از وصل یارے اور وصل کی لذت جیسی ہوتی ہے معلوم ہے اس لذت میں کبھی انہماک ہو کر اس کی مقصودیت کا شبہ ہو جانا بعید نہیں اور اس دولت وصل سے مشرف ہو کر عجب کا پیدا ہو جانا بھی عجیب نہیں اس لئے اس سے استغفار کرتے ہیں (ایضاً ص ۴۲)

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۗ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ

وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُونِ ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝

ترجمہ: اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کیا کریں میں ان سے (مخلوق کی) رزق رسائی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے کھلایا کریں بے شک اللہ خود سب کو رزق پہنچانے والا قوت والا نہایت قوت والا ہے۔

تفسیری نکات

جن و انسان کا مقصد تخلیق

ما ارید منہم من رزق ای لا نفسہم ولا لعیالہم۔ وما ارید ان یطعمون ای وما اردت بخلقہم ان یطعمونی۔ یعنی میں نے اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ اپنے اور اپنے عیال کے لئے رزق ڈھونڈیں نہ اس لئے پیدا کیا کہ وہ مجھے کھلا دیں۔ یہاں ایک نکتہ سمجھنا چاہیے کہ اطعام حق کے غایت ہونے کا تو احتمال ہی نہ تھا پھر اس کی نفی کی کیا ضرورت تھی۔ سو نکتہ یہ ہے کہ یہاں دونوں میں دو غایتوں کی نفی کو قرین فرمایا ان میں ایک ایسا امر ہے کہ اس کے غایت ہونے کا احتمال ہی نہیں اور ایک میں اس کا احتمال تھا سو دونوں کو قرین فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ جیسا ایک امر یقیناً منفی ہے ایسا ہی دوسرے کو سمجھو کیونکہ دونوں کی علت مشترک ہے چنانچہ اس علت کو اس طرح ذکر فرمایا کہ ان اللہ هو الرزاق الخ یعنی وہ تو خود بڑے رزاق ہیں کہ تم کو اور تمہارے عیال کو سب کو رزق دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے و امر اہلک بالصلوٰۃ واصطر علیہا لا نسئلک رزقاً نحن نرزقک (اور اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہے اور خود بھی اس کے پابند رہے ہم آپ سے معاش (کموانا) نہیں چاہتے معاش تو آپ کو ہم دیں گے) یہ آیت بھی اس کے قریب قریب ہے خلاصہ یہ ہے کہ نہایت تاکید و اہتمام کے ساتھ اس مقصود کو ثابت فرمادیا کہ انسان وحق جل و علی شانہ نے صرف عبادت کے واسطے پیدا کیا ہے تو عبادت اتنا بڑا امر اہم ہے۔ اب صرف یہ سمجھنا باقی رہا کہ عبادت ہے کیا چیز سو اس میں غلطی یہ واقع ہوئی ہے کہ اس کی حقیقت کو نہیں سمجھا سو جو عربی جاننے والے ہیں ان کو تو اس کی حقیقت سمجھنا آسان ہے۔ مگر حق تعالیٰ کی تعلیم ایسی سہل ہے کہ اس کا فیض سب کو پہنچتا ہے چنانچہ لفظ عبادت ہی کو محاورات میں ایسا

جاری کر دیا گیا کہ اب کوئی بھی اس سے ناواقف نہیں ہے مگر غایت ظہور کی وجہ سے اس کی حقیقت سمجھنے میں خفا ہو گیا۔ چنانچہ اس کا مفہوم سب کے لئے بہت ہی آسان ہے جو لوگ عربی دان ہیں وہ تولغت میں دیکھ لیں گے کہ اس کے معنی ہیں غایۃ التذلیل (نہایت ذلت) مگر عوام جو لغت نہیں جانتے اگر ان کے سامنے صرف اسی کو پیش کیا جائے ان کو یہ شبہ ہوگا کہ یہ ابھی تراشا گیا ہے اس لئے میں ان کے مستعمل محاورہ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ عبد کے معنی سب کو معلوم ہیں کہ غلام ہیں چنانچہ عوام میں بھی عبد اللہ عبد الرحمن نام اسی واسطے رکھے جاتے ہیں اور عبادت اسی عبد کا مصدر ہے اور عبد اسی مصدر سے مشتق ایک صفت ہے جب عبد کے معنی غلام ہیں تو عبادت کے معنی عبد شدن یعنی غلام ہو جانا یا بندہ ہو جانا ہوئے۔ بندہ فارسی ہے اور عبد اور غلام عربی ہے مگر غلام کو اردو میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اردو میں سب زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں اور غلام کا لفظ بہ نسبت عبد بلکہ بہ نسبت بندہ کے بھی بوجہ کثرت استعمال کے زیادہ اقرب الی الفہم (فہم سے زیادہ قریب) ہے بہر حال ان تینوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس سے عبادت کی حقیقت منجملہ تو سمجھ میں آگئی کہ غلام ہونا ہے۔

عبادت و طاعت کا فرق

اس کے متعلق حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تحقیق بیان کرتا ہوں فرمایا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے ما خلقت الجن والانس الا ليعبدون (میں نے جنوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) تو باوجود اس کے کہ ملائکہ اور حیوانات جمادات نباتات جوہر و اعراض سب کے سب عبادت میں مصروف ہیں جیسا کہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بارے میں ارشاد ہے يسبحون الليل والنهار لا يفترون (پاک بیان کرتے ہیں رات اور دن اور اس سے نہیں تھکتے) حیوانات وغیرہ کے بارے میں فرماتے ہیں ان من شئ الا يسبح بحمده ولكن لا تفقهون تسبيحهم (کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے کہ اللہ کی حمد و تعریف نہ کرتی ہو لیکن ان کی تسبیح کو تم لوگ نہیں سمجھتے) ان کے علاوہ اور متعدد آیات سے ہر ایک چیز کا عبادت میں مشغول ہونا معلوم ہوتا ہے پھر انسان اور جن کی تخصیص عبدیت میں کیوں فرمائی گئی فرمایا کہ وجہ یہ ہے کہ ایک تو نوکر ہوتا ہے۔ ایک غلام ہوتا ہے نوکر کی خدمات ہمیشہ معین ہوا کرتی ہیں یعنی اگرچہ کتنے بھی مختلف کام نوکر سے لئے جائیں لیکن کوئی کام ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس میں نوکر عذر کر دے اور کہہ دے کہ میں اس کام کے لئے نہیں ہوں مثلاً اگر کوئی شخص اپنے نوکر سے کہنے لگے کہ تو مہتر کا کام بھی کیا کر تو وہ ہرگز نہ منظور کرے گا اور عذر کر دے گا۔ علی ہذا اور بہت سے کام ایسے نکلیں گے جن میں نوکر کی جانب سے عذر ہوگا بلکہ اولاد بھی جس پر نوکر سے زیادہ قبضہ اور تسلط ہوتا ہے بعض کاموں میں انکار کر دیتی ہے چنانچہ ہمارے ایک

خاندانی سید اور معزز دوست نے ایک ایسے موقع پر کہ سقوں نے پانی بھرنا چھوڑ دیا تھا اپنے لڑکے کو کہا کہ بھائی سقوں نے تو پانی بھرنے سے جواب دیدیا ہے اہل محلہ کو سخت تکلیف ہوتی ہے تم ہی لوگوں کے یہاں پانی بھر آیا کرو وہ لڑکا بہت خفا ہوا برخلاف غلام کے کہ اس کا کوئی خاص مقرر کام نہیں ہوتا بلکہ اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک وقت آقا کی نیابت کرتا اور زرق برق لباس میں ہوتا ہے اور دوسرے وقت آقا کے نجس کپڑوں کو صاف کرتا ہے ایک وقت بھنگلی کا کام کرتا ہے تو دوسرے وقت سفارت کا کام کرتا ہے۔ پس غلام نوکر بھی ہے مہتر بھی ہے سفیر بھی ہے خلیفہ بھی ہے پس انسان اور جن تو بمنزلہ غلام کے ہیں اور دوسری مخلوقات مثل نوکر کے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دوسری مخلوقات کی عبادت کو تسبیح و تقدیس و سجدہ وغیرہ الفاظ سے فرمایا اور انسان اور جن کی عبادت کو بلفظ عبدیت فرمایا اور جب انسان اور جن عبد اور غلام ہیں تو ان کی کوئی خاص خدمت نہ ہوگی بلکہ ایک وقت نماز روزہ کرنا عبادت ہوگا تو دوسرے وقت سونا اور قضائے حاجت کرنا لوگوں سے ملنا وغیرہ وغیرہ کام عبادت ہوں گے چنانچہ حدیث میں ہے۔ نہی رسول اللہ ان یصلی حاقنا او کما قال (قضا حاجت کی شدت کے وقت نماز ادا کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا) کہ جس وقت پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو اس وقت نماز پڑھنے کی ممانعت ہے اور دفع فضلہ واجب ہے دیکھئے ایک وقت انسان کے لئے ایسا نکلا کہ اس کو مسجد جانا حرام اور بیت الخلاء جانا واجب ہوا۔

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔

غایت آفرینش

عبادت ایسی ضروری چیز ہے کہ غایت خلق جن و انس کی بھی ہے۔ اور یہاں جن کو بھی انسان کے ساتھ ذکر اشریک کیا گیا ہے اور دوسرے اکثر مقامات میں باوجودیکہ جن بھی انسان کی طرح تمام احکام شرعیہ کے مکلف ہیں مگر پھر بھی تعبیر میں جو جن کا ذکر نہیں آتا تو وہ اکتفاء ہے۔ لہذا انسان ہی کا ذکر آتا ہے ورنہ احکام شریعہ دونوں ہی میں مشترک ہیں۔ اس آیت سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ آفرینش کی غایت محض عبادت ہے اب اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ بجز اس کے اور کوئی مقصود ہی نہیں تمام مقاصد کا انحصار کر کے فرمایا کہ صرف عبادت کیا کریں اور اس حصر سے باوجودیکہ سب غایت کی نفی ہو گئی مگر پھر بھی جن غایات کی مقصودیت کا باعتبار عادات کے کچھ شبہ نہ ہو سکتا تھا اس مقام پر ان سب کی نفی تصریحاً بھی فرمادی۔

سُورَةُ الطُّورِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ

وَمَا أَلْتَنَّهُمْ مِنْ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ

تَنْجِيًّا: اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا، ہم ان کی اولاد کو بھی (درجہ میں) ان کے ساتھ شامل کر دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی چیز کم نہیں کریں گے۔

تفسیری نکات

شرف نسب میں راہ اعتدال

میری پھوپھی صاحبہ اپنے گھر پر لڑکیوں کو پڑھایا کرتی تھیں اور کسی سے معاوضہ وغیرہ کچھ نہ لیتی تھیں ایک مرتبہ ان کے یہاں ایک سید کی لڑکی پڑھنے آئی وہ فرماتی تھیں کہ اسی روز رات کو میں نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا فرماتی تھیں کہ عمدۃ النساء دیکھو ذرا میری بچی کو محبت سے پڑھانا۔ اسی طرح اور بہت سی بشارتیں اور منامات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل اللہ کو اپنی اولاد کا خیال رہتا ہے اور آخرت میں اس نسبت سے یہ نفع ہوگا کہ حق تعالیٰ بزرگوں کی اولاد کو انہی بزرگوں کے درجوں میں پہنچادیں گے چنانچہ ارشاد ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلْتَنَّهُمْ مِنْ شَيْءٍ اس میں افراط و تفریط دونوں کا علاج کر دیا گیا فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتی رہی یعنی کافر و شریر نہ ہوں تو ہم ان کو بھی ان ہی کے ساتھ ملا دیں گے یعنی گو عمل میں دونوں برابر نہ ہوں مگر پھر بھی سب کو برابر کر دیا جائے گا جیسے کوئی بادشاہ کہیں مہمان بن کر جائے اور

اس کا بیٹا بھی اس کے ہمراہ ہو تو وہ بھی اسی جگہ ٹھہرے گا جہاں بادشاہ ٹھہرے گا اب یہاں کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید اس برابری کی صورت یہ ہو کہ اوپر کے درجہ والوں کو نیچے کر دیا جائے یا کچھ ان کو گھٹایا جائے اور کچھ ان کو بڑھایا جائے اور اوسط پورا کر کے درمیانی درجہ دے دیا جائے تو اس کا جواب دیتے ہیں وَمَا التَّاهَمُ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ کہ ہم بلند درجہ والوں کے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کریں گے بس معلوم ہو گیا کہ برابری کی صورت یہ ہوگی کہ ناقص الاعمال کو کامل الاعمال کے درجہ میں بھیج دیا جائے گا۔ کاملین کے درجات میں کمی نہ کی جائے گی اب اس کو سن کر شاید کسی کو ہوس ہوتی کہ پھر ہم کو عمل کی کیا ضرورت ہے تو آگے ایسا فیصلہ فرمایا ہے جس سے اس خیال کا استیصال ہو گیا فرماتے ہیں کل امری بما کسب رہین کہ ہر شخص اپنے کئے ہوئے (اعمال) کے ساتھ مقید ہوگا معلوم ہوا کہ عمل کی پھر بھی ضرورت ہے بدوں عمل کے یہ دولت نصیب نہیں ہو سکتی یہاں سے یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ شرف نسبت نافع ہے یا نہیں اس وقت اس بارے میں غلو ہو رہا ہے بعض تو اسی کو اصل قرار دیتے ہیں اور بعض اس کو مٹاتے ہیں کہ یہ کوئی چیز نہیں اور دیکھا یہ گیا ہے کہ جو لوگ ذی نسبت نہیں ہیں وہی زیادہ تر اس کو مٹاتے ہیں اور دونوں کا منشا تکبر ہے جو لوگ نسبت تو اصل قرار دیتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنی بڑی چیز ہے ہم کو بڑا سمجھو اور اس کو مٹاتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہم شرفاء سے کسی بات میں کم نہیں ہیں کیونکہ شرافت نسب کوئی چیز نہیں بعض نے تو یہ کیا کہ نسبت ہی کا استیصال کر دیا اور بعض نے یہ کیا کہ اپنے کو کھینچ تان کر شرفاء میں داخل کر دیا۔

نجات کے لئے نسب کافی نہیں

فرمایا کہ اس زمانے میں لوگوں نے نسب کے امر میں بے حد افراط و تفریط کر رکھی ہے حالانکہ افراط اور اسی طرح تفریط دونوں بے جا ہیں یعنی محض نسب کو نجات کے لئے کافی سمجھنا بھی غلط ہے کیونکہ خود حدیث میں ہے بِإِطَاعَةِ مَنْقُذِي نَفْسِكَ مِنَ النَّارِ جس سے معلوم ہوا کہ نسب کے نافع ہونے کے لئے ایمان اور اتباع شرط ہے بلکہ اس کے خلاف کی صورت میں بزرگوں کی اولاد پر زیادہ وبال کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ دنیا میں بھی مشاہد ہے کہ اگر اپنی اولاد نافرمانی کرے تو اس پر زیادہ غصہ آتا ہے یہ نسبت اجنبی کی مخالفت کے اسی طرح نسب کو محض بے کار سمجھنا یہ بھی غلطی ہے قرآن میں ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ الْحَقَنَابَهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ لِحُوقِ كَيْفَ يَكُنِ فِيهِمْ يَتَّبِعُونَ وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَنْ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ فَسَاءَ مَا يَحْكُمُونَ اور اولاد کے عمل کی کمی پوری کر دی جائے گی یہ نفع ہے نسب کا لیکن یہ نسبت مخصوص نہیں معنی اصطلاحی کے ساتھ بلکہ مطلق انتساب الی المقبول نافع ہوگا حتیٰ کہ اگر کوئی دنی النسبت ہو اور بزرگ و عند اللہ (مثلاً کوئی جلاہا) تو وہ بھی اپنی

اولاد کے کام آئے گا یہ نہیں کہ صرف شریف النسب ہی کام آئے اور دنی النسب کی بزرگی اس کی اولاد کے لئے کارآمد نہ ہو۔ حاشا وکلا۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا

ترجمہ: اور آپ ﷺ اپنے رب کی تجویز پر صبر سے بیٹھے رہے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔

تفسیری نکات

حکایت حضرت سید صاحبؒ

(۹) فرمایا کہ حضرت سید صاحبؒ نے جب حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بیعت کی تو حضرت شاہ صاحب نے تصور شیخ تعلیم فرمایا سید صاحبؒ نے باادب انکار فرمادیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔

بھی سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

سید صاحب نے فرمایا بھی سجادہ رنگین کن معصیت کے باب میں ہے اور معصیت جو بھی آپ فرمادیں کر سکتا ہوں۔ مگر شرک نہیں کر سکتا۔ اس پر شاہ صاحب نے فرمایا۔ ہم آپ کو طریق نبوت سے سلوک طے کرا دیں گے طریق ولایت چھوڑ دیں گے کیونکہ آپ کی استعداد بہت ہی اعلیٰ ہے چنانچہ کل تیرہ دن میں سارا سلوک طے ہو گیا۔

دولت مقصودہ

فرمایا۔ ذکر میں اس طرح مشغولی اختیار کرنا کہ اہل و عیال کی بھی خبر نہ رہے یہ معصیت ہے کیونکہ مشغولی کا کمال وہی ہے جس کو شریعت نے تجویز فرمایا ہے۔ درحقیقت خلق (مخلوق) مشاہدہ حق کا مرآة ہے پس جس وقت حکم ہو کہ براہ راست ہمارا مشاہدہ مت کرو بلکہ اس مرآة (یعنی مخلوقات) کے ذریعہ سے دیکھو تو اس وقت یہ مشاہدہ بالواسطہ ہی مطلوب ہے حتیٰ کہ اگر مشاہدہ خاصہ ہر دو قسم یعنی بواسطہ مرآة و بغیر مرآة سے منع فرمادیتے تو بھی اطاعت واجب ہوتی۔ اگر اطاعت بلا مشاہدہ خاصہ ہو تو اس کی مثال یہ ہے۔

(۱) ارید وصالہ و یرید ہجری۔ (میں ان سے ملاقات چاہتا ہوں اور وہ میرے فراق کے

طالب ہیں)

اور وہ کافی ہے کیونکہ اس حالت میں اگر یہ شخص راوانی نہیں مگر مرئی تو ہے اور یہ بھی دولت مقصودہ ہے۔

اور آیت (۲) و اصبر لحکم ربک فانک باعینا (اور آپ اپنے رب کی تجویز پر صبر سے بیٹھے رہے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں) (الطور آیت ۴۸) میں یہی صورت ہے کہ عاشق کو ارشاد ہے ہم تو تم کو دیکھ رہے ہیں پس محبوب اگر توجہ کرے اور آغوش میں لے لیوے تو عشاق کے نزدیک بعض وجوہ سے وہ الذہے عشق کی نظر میں (۳) الا انہ بکل شیء محیط (یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو اپنے علم کے احاطہ میں رکھتے ہیں) (السجدہ آیت ۵۴)

میں اللہ تعالیٰ کا احاطہ الذہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی توجہ کی دلیل ہے۔ پس اہل و عیال میں مشغول ہونے سے گو بندہ کی توجہ اصطلاحیہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ تو اس کو دیکھتے ہیں اور اپنے بندے کی طرف متوجہ ہیں اور احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۴ ص ۴۸)

سُورَةُ النَّجْمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِن هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۗ

ترجمہ: اور نہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی خواہش سے باتیں بناتے ہیں ان کا ارشاد نبوی وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

تفسیری نکات

حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاہیر نخل کے بارہ میں اول مشورہ منع فرمایا اور بعد میں فرمایا انتم اعلم بامور دنیا کم اس پر بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ جس قدر ارشاد نبوی ہوتا ہے وحی سے ہوتا ہے۔ اور وحی میں خلاف کہاں وما یَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ان ہوا لا وحی یوحى ارشاد حق تعالیٰ ہے جو اب یہ ہے کہ وحی سے جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں وہ احکام دینیہ ہیں وہ ضرور واقعی ہوتے ہیں ان میں مشورہ نہیں فرمایا جاتا۔ اور جو امور دنیوی ہیں جن میں مشورہ ہے ان میں خلاف ممکن ہے اتم اعلم اسی واسطے فرمایا بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امور دنیویہ میں شریعت کو دخل نہیں اور تاہیر نخل کے قصے کو دلیل لاتے ہیں یہ بات غلط ہے اس واسطے کہ اوامر و نواہی متعلقہ امور دنیا شریعت ہی سے ثابت ہیں پھر انکار کیوں ہو سکتا ہے احکام جو متعلق امور دنیوی ہیں جن کا اہتمام ضروری ہے شریعت ہی سے ثابت ہیں پس معاملات میں دوسرے ہیں ایک تو تجربات کہ فلاں کام کیوں کریں کہ نفع ہو۔ زراعت کیونکر کریں کہ غلہ پیدا ہو۔ کھیت کیونکر جو تا جائے تخم ڈالنا کس وقت مناسب ہے۔ یہ تو تجربات ہی۔ دوسرے شریعات ہیں کہ فلاں صورت سے تجارت کرنے میں ربوا ہوگا۔ وہ حرام ہے فلاں صورت پر جائز ہے مثلاً یعنی احکام حلت و حرمت گو امور دنیاوی ہی سے متعلق ہوں یہ مسائل اور شریعت سے ثابت ہیں تاہیر نخل تجربات سے ہے۔

وَلَقَدْ رَاَهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۗ

ترجمہ: اور انہوں نے (یعنی پیغمبر نے) اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی صروتِ اصلیہ میں دیکھا ہے۔

تفسیری نکات

ثبوت معراج جسمانی

فرمایا کہ رام پور میں ایک شخص نے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہو یا روحانی۔ میں نے کہا کہ جسمانی کہنے لگے کہ ثبوت میں نے کہا سبحان الذی اسری بعبدہ الایۃ اور لقد راہ نزلة اخری عند سدرۃ المنتھیٰ اور حدیثیں کہنے لگے کیا یہ ممکن ہے کہ جسم انسانی ایسے طبقہ سے عبور کرے جہاں ہوانہ ہو میں نے کہا کہ ہاں ممکن ہے کہ ثبوت میں نے کہا کہ امکان نام ہے عدم الوجود وعدم الامتناع کا جب وجوب و امتناع نہ ہوگا تو امکان ثابت ہو جائے گا اور چونکہ امکان اصل ہے لہذا جو مدعی امتناع یا وجوب کا ہو دلیل اس کے ذمہ ہے ہم اصل سے متمسک ہیں ہمارے ذمہ دلیل نہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کی معراج عروجی و نزولی

غرض حضور ﷺ کی معراج عروجی تو کامل ہے اور آپ ﷺ کی معراج نزولی اکمل ہے۔ سوان میں فرق کامل اکمل کا ہے ناقص اکمل کا نہیں۔ کیونکہ آپ کی جو حالت بھی ہے وہ کمال سے خالی نہیں۔ گو بعض حالتیں بعض سے زیادہ کامل ہوں مگر ناقص کوئی نہیں۔ اور آپ کی معراج نزولی کا معراج عروجی سے افضل ہونا صرف صوفیہ کے قول ہی سے ثابت نہیں بلکہ اس پر دلائل موجود ہیں۔

ایک دلیل تو یہ ہے کہ معراج کی غایت حق تعالیٰ نے رویت آیات بیان فرمائی ہے چنانچہ سورہ نجم میں تو فرمایا ہے لقد رای من آیات ربہ الکبریٰ اور سورۃ الاسراء میں فرمایا ہے لسریہ من ایاتنا اور ظاہر ہے کہ حضور کو آیات دکھلانے سے دو فائدے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کی معرفت زیادہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آپ خود دیکھ کر دوسروں کو بتلا دیں۔

خلاصہ یہ کہ معراج سے دو مقصود تھے۔ ایک یہ کہ رویت آیات و از دیاد علوم سے آپ کی تکمیل ہو دوسرے یہ کہ ان علوم سے آپ دوسروں کی تکمیل کریں پہلا فائدہ لازمی ہے اور دوسرا فائدہ متعدی ہے اور ظاہر ہے کہ جو وقت فائدہ متعدیہ کے ظہور کا ہوگا وہ فائدہ لازمیہ کے وقت سے افضل ہوگا کیونکہ بعثت رسول سے

اصل مقصود افادہِ خلائق ہی ہے نیز دوسروں کی تکمیل سے خود رسول کے درجات میں بھی ترقی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ فائدہ متعدد یہ کا ظہور بعد نزول کے ہوا تو نزول کا عروج سے افضل ہونا ثابت ہو گیا۔

دوسری دلیل یہ آیت ہے وَلِلْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّكَ مِنَ الْاُولٰٓئِیْ اس کا بیان یہ ہے کہ ایک مرتبہ کچھ دنوں نزول وحی میں توقف ہو گیا اور کفار نے طعن کیا تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رنج و غم کا اثر ہوا اور آپ پر حالت قبض طاری ہو گئی۔ تو بعد میں حق تعالیٰ نے آپ کی تسلی فرمائی اور سورہ ضحیٰ نازل ہوئی۔ جس میں اول ان آیات کی قسم کھائی ہے جن کو اس حالت سے خاص مناسبت ہے فرماتے ہیں۔ وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَا وُدَّعٰک رَبِّکَ وَمَا قَلٰی قسم ہے دن کی اور رات کی جب وہ قرار پکڑ لے اس جگہ رات اور دن کی قسم بہت ہی مناسب ہے کیونکہ دن مشابہ ہے حالت بسط کے اور یہ رات مشابہ ہے حالت قبض کے۔

وجہ تشبیہ ایک تو یہ ہے کہ حالت بسط میں انوار کا توارد ہوتا ہے اور دن بھی محل نور ہے اور حالت انوار میں وہ انوار نہیں رہتے تو وہ رات کے مشابہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جس طرح دن میں کاروبار زیادہ ہوتے ہیں اسی طرح حالت بسط میں سالک سے کام زیادہ ہوتا ہے اور حالت قبض میں کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔ نماز میں دل لگتا ہے نہ ذکر میں نہ تلاوت میں تو قبض میں کام کم ہو جاتا ہے۔ وہ رات کے مشابہ ہے کہ اس میں بھی کاروبار بند ہو جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس جگہ رات اور دن کی قسم سے مقام کی یعنی جواب قسم ما وودعک ربک وما قلی وللاخرة خیر لک من الاولیٰ کی حقیقت بتلا دی جس کا حاصل یہ ہے کہ سالک پر ان دونوں حالتوں کا آنا ایسا ہے جیسے لیل و نہار کا تعاقب پس جس طرح دن کے بعد رات کا آنا غیر مقبول ہونے کی علامت نہیں اسی طرح بسط کے بعد کہ تو اتروحی ہے قبض کا آنا کہ توقف وحی ہے غیر مقبول ہونے کی دلیل نہیں بلکہ جس طرح ہم نے عالم میں لیل و نہار کا اختلاف حکمت کے لئے رکھا ہے یونہی سالک پر بسط و قبض کا تعاقب حکمت کے لئے مقرر کیا گیا ہے پس قبض سے پریشان نہ ہونا چاہیے۔

إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۗ

ترجمہ: یہ لوگ صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں اور یقیناً بے اصل بات امر حق کے اثبات میں (ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

تفسیری نکات

شان نزول

شان نزول اس کا یہ ہے کہ دین کے باب میں کفار انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں کچھ دعوے کیا کرتے اور وہ دعوے بلا دلیل تھے حق تعالیٰ ان پر ملامت فرماتے ہیں کہ یہ لوگ صرف اپنے خیالات اور ظن کا اتباع کرتے ہیں حالانکہ ظن محض سے حق ثابت نہیں ہوتا ہے محض سے مراد وہ جس کا استناد نص کی طرف نہ ہو رائے محض ہو۔ یہ محض کا لفظ اہل علم کے یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اہل علم کو اس مقام پر شبہ ہو جایا کرتا ہے کہ شریعت میں ظن کا تو اعتبار کیا گیا ہے چنانچہ خبر واحد اور قیاس ظنی ہے اسی طرح قیاس شرعی بھی اس کا جواب محض کے لفظ سے نکل آیا یعنی جو ظن معتبر ہے وہ محض ظن نہیں ہے بلکہ وہ ظن معتبر ہے جس کا استناد نص کی طرف ہے چنانچہ خبر واحد جو ظنی ہے وہ تو اصل ہی میں ظنی الثبوت نہیں ہے محض اس کی سند میں ظن عارض ہو گیا ہے ورنہ بحیثیت رسول ہونے کے فی نفسہ قطعی ہے اسی طرح قیاس تو اصل ہی میں ظنی ہے لیکن وہ خود مثبت (یعنی حکم کا ثابت کرنے والا) نہیں ہے بلکہ مظہر (حکم کو ظاہر کرنے والا) ہے۔ اور مثبت تو نص ہے اور قیاس کی طرف مستند ہے اور یہاں جس ظن پر ملامت ہے اس سے مراد وہ ظن ہے جس کا کسی نص کی طرف اسناد نہ ہو بعض نصوص سے علوم ظنیہ کے مطلقاً مفید نہ ہونے کا شبہ ہو گیا ہے جن میں سے ایک ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً یقیناً ہے بے اصل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

اس میں شیئاً نکرہ ہے تحت الھی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ظن کسی درجہ میں بھی مفید نہیں تو سمجھنا چاہیے کہ یہ دھوکا اصطلاح اور محاورہ کے خلط سے پیدا ہوا ہے قرآن کو محاورات پر سمجھنا چاہئے کیونکہ اس کا نزول محاورات عرب ہی پر ہوا ہے نزول قرآن کے وقت اہل عرب ان معنوی اصطلاحات کو جانتے بھی نہ تھے یہ تو بعد میں مقرر ہوئی ہیں۔

پس اب سمجھو کہ محاورات میں ظن کے معنی مطلق خیال کے ہیں خواہ صحیح یا غلط مدلل یا غیر مدلل مطابق واقع ہو یا خلاف واقع۔ تو ظن اصطلاحی بھی اس کی ایک فرد ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ظن کا استعمال بمعنی

اعتقاد جازم ہوا ہے۔ یظنون انہم ملاقوا ربہم وہ اللہ کی ملاقات کا یقین رکھتے ہیں۔
یہاں اعتقاد جازم مراد ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ اعتقاد آخرت میں ذرا سا بھی شک کفر ہے اور ایک
جگہ آخرت کے متعلق کفار کا قول نقل کیا گیا ہے۔

ان نظن الاظنأ و مانحن بمستیقین محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو یقین نہیں۔
یہاں وہم و خیال مراد ہے کیونکہ ان کو آخرت کے متعلق ظن اصطلاحی بھی نہ تھا بلکہ وہ تو منکر و مذہب تھیں ہی طرح۔
ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا مفید نہیں ہوتے۔
میں ظن اصطلاحی مراد نہیں بلکہ خیال بلا دلیل مراد ہے کیونکہ یہاں کفار کے بارہ میں گفتگو ہے اور
ان کا ظن (ملائکہ بنات اللہ ہونے کے بارہ میں) کسی دلیل سے نہ تھا بلکہ خلاف دلیل تھا۔ چنانچہ اوپر کی آیت
سے اس کا کفار کے متعلق ہونا ظاہر ہے فرماتے ہیں۔

ان الذین لا یؤمنون بالآخرة لیسمون الملائكة تسمیة جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لائے وہ
فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں شمار کرتے ہیں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے محض بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں۔
اسی کے متعلق آگے ارشاد ہے وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً کہ ایسا ظن جو بلا دلیل ہو جیسا کفار
کو تھا مغنی عن الحق نہیں ہے۔

آیات منجملہ و مشککہ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ طلباء معقول کے بعد قرآن کو پڑھتے ہیں جبکہ وہ اصطلاحات ان کے ذہن میں رچی
ہوئی ہوتی ہیں تو قرآن میں بھی ان کو وہی سوجھتی ہے اسی کی مناسبت سے وحدۃ الوجود کا ذکر آ گیا کہ اس کی
حقیقت بھی ایک چیز کا ذہن میں رچ جانا ہے۔ بہر حال ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً میں ظن
اصطلاحی مراد نہیں بلکہ ظن بلا دلیل مراد ہے پس ظن اصطلاحی کا غیر کافی ہونا یا حجت نہ ہونا قرآن سے ثابت نہیں
ہو سکتا بلکہ دلائل شرعیہ سے اس کا معتبر و حجت ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قرآن میں
بعض آیات منجملہ و مشککہ بھی ہیں۔ سب کی سب مفسر و محکم ہی نہیں ہیں اور جب بعض آیات منجملہ و مشککہ بھی
ہیں تو ان کی کوئی تفسیر قطعی نہیں ہو سکتی ورنہ پھر اجمال و اشکال ہی کہاں رہا اور جب کوئی تفسیر قطعی تو نہیں، ظنی ہو
گی۔ اب اگر ظن مطلقاً غیر معتبر ہے تو آیات منجملہ و مشککہ بالکل متروک العمل ہو جائیں گی۔ حالانکہ اس کا کوئی
قائل نہیں ہے۔ مثلاً لاستم النساء میں ابہام ہے۔ جس کی وجہ سے تفسیر میں اختلاف ہو رہا ہے کہ اس سے مراد
لس بالید ہے یا ملاستہ بالجماع ہر فریق اپنی تفسیر کو دلائل سے ثابت کرتا ہے اور جس کے نزدیک جو معنی راجح
ہیں اس پر عمل کرتا ہے حالانکہ ہر تفسیر ظنی ہے قطعی کی گنجائش بھی نہیں مگر کسی نے اس آیت کو یہ کہہ کر ترک نہیں کیا

کہ اس کی قطعی مراد تو معلوم نہیں اور ظن معتبر نہیں لہذا اس پر عمل نہیں ہو سکتا اور جب ظن معتبر ہے تو جو معنی جس شخص کے نزدیک راجح ہیں وہ اس کو مدلول کلام ہی سمجھ رہا ہے گو قطعاً نہ سہی ظناً ہی سہی جس کا قرینہ یہ ہے کہ اس ظن کی بناء پر وجوب و حرمت کراہت و مندوبیت وغیرہ احکام شرعیہ ثابت کئے جاتے ہیں اور یہ احکام بدوں نسبت الی الشارح کے ثابت نہیں کئے جاسکتے پس ثابت ہو گیا کہ مدلول ظنی بھی مدلول نص ہی ہے (تو جس طرح قطعیات کو قطعاً مدلول نص کہا جاتا ہے اسی طرح ظلیات بھی ظناً مدلول نص ہیں خواہ بلا واسطہ قیاس کے خواہ بواسطہ قیاس کے غرض محکم حکم اور علل کا جدا جدا حکم ہے۔

وَإِذْ أَنْتُمْ أَجْنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ

ترجمہ: اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

تفسیری نکات

جنین پر اثر

حکماء کا قول ہے کہ جس عمر میں بچہ عقل ہیولانی کے درجہ سے نکل جاتا ہے تو گو اس وقت وہ بات نہ کر سکے مگر اس کے دماغ میں ہر بات اور ہر فعل منقش ہو جاتا ہے اس لئے اس کے سامنے کوئی بات بھی بے جا اور نازیبا نہ کرنا چاہیے بلکہ بعض حکماء نے یہ لکھا ہے کہ بچہ جس وقت ماں کے پیٹ میں جنین ہوتا ہے اس وقت بھی ماں کے افعال کا اثر اس پر پڑتا ہے اور اجنہ اسی جنین کی جمع ہے قرآن میں ہے و انتم اجنۃ فی بطون امہاتکم بعض لوگ اجنہ کو جن کی جمع سمجھتے ہیں یہ غلط ہے جن کی جمع جنات و جان ہے اور مفرد جنی ہے مونث جنیہ ہے اور جن اسم جنس ہے تو حکماء الہی نے یہ کہا ہے کہ ماں کو لازم ہے کہ حمل کے زمانہ میں نہایت تقویٰ و طہارت سے رہے کیونکہ بحالت حمل بھی اس کے افعال کا اثر جنین پر ہوتا ہے چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق ایک حکایت سنی ہے گو کتابی نہیں مگر تقریب فہم میں اس کو بطور مثال بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ ایک مرد و عورت بہت نیک تھے مگر ان کے بچہ نہ ہوتا تھا بڑی دعاؤں اور امیدوں کے بعد حمل ٹھہرا اور بچہ کی امید ہوئی تو دونوں نے عہد کیا کہ دونوں زمانہ حمل میں احتیاط اور تقویٰ سے گزر کریں مرد نے بھی بہت احتیاط کی تاکہ اس کے افعال کا اثر عورت پر نہ پڑے اور اس کا جنین پر نہ پڑے چنانچہ غایت احتیاط کے بعد بچہ پیدا ہوا اور اس آثار رشد و صلاح کے ظاہر تھے جوں جوں بڑھتا گیا رشد و اصلاح کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ ایک مرتبہ وہ ہوشیار ہو کر باپ کے ساتھ بازار جا رہا تھا کہ ایک کنجڑن کے ٹوکے میں سے ایک پیر اٹھا کر کھالیا مرد کو حیرت ہوئی کہ یہ بات اس میں

کہاں سے آئی گھر آ کر تلوار سوت لی اور بیوی سے دھمکا کر پوچھا کہ بتلا اس میں یہ عیب کہاں سے آیا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے حمل کے زمانے میں کسی کی چوری کی ہے۔ عورت نے کہا تلوار کو نیام میں کرو میں سوچ کر بتلاؤں گی پھر سوچ کے بتلایا کہ ہمارے پڑوسی کی پیری کی ایک شاخ ہمارے گھر میں لٹک رہی ہے اس پر سے ایک بیر توڑ کر میں نے کھالیا کیونکہ میں نے غلطی سے اس کو چوری کا نہیں سمجھا جب جنین پر بھی ہماری حرکات و افعال کا اثر ہوتا ہے تو ہوشیار بچوں کی طبیعت پر کیوں اثر نہ ہوگا گو وہ بات نہ کر سکتے ہوں مگر اثر ہر بات کا لیتے ہیں۔

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ

ترجمہ: تم اپنے نفسوں پر تزکیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے۔

تفسیری نکات

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ

جس کا ترجمہ ناواقف یوں کرے گا کہ اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ لا تزکو انہی کا صیغہ ہے مشتق تزکیہ سے تو اب اس پر اشکال واقع ہوگا کہ ایک جگہ تو تزکیہ کا امر ہے اور ایک جگہ اس سے نہیں ہے اس کے کیا معنی جواب اس کا یہ ہے کہ اگر اسی آیت میں لا تزکو انفسکم (تم اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ بیان کرو) کو اس کے مابعد سے ملا کر غور کیا جائے تو شبہ حل ہو جائے گا۔ قرآن میں اکثر شبہات ماسبق اور مابعد کو نہ ملانے سے پیدا ہوتے ہیں اگر شبہ وارد ہونے کے وقت آیت کے ماسبق اور مابعد میں غور کر لیا کریں تو خود قرآن ہی سے شبہ رفع ہو جایا کرے اور اسی جگہ شبہ کا جواب موجود ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہر شبہ کا جواب بھی ساتھ ساتھ ذکر فرمادیا ہے جیسا کہ تکوینیات میں بھی حق تعالیٰ کی یہی عادت ہے چنانچہ جن لوگوں نے خواص ادویہ کی تحقیق کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جن نباتات میں کسی قسم کا ضرر ہے جس مقام پر وہ پیدا ہوتی ہیں اسی مقام پر ایک دوسری نباتات بھی حق تعالیٰ پیدا کر دیتے ہیں جس میں اس ضرر کی اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک گھاس زہریلی ہوتی ہے جس کو کہتے ہیں اس میں بچھو کی سی خاصیت ہے اس کے چھونے سے بچھو کا سا اثر ہوتا ہے تو جس مقام پر وہ پیدا ہوتی ہے اسی مقام پر اس کے پاس ہی اللہ تعالیٰ نے دوسری گھاس اس کی اصلاح کرنے والی پیدا کر دی ہے کہ اس کے ملنے سے وہ اثر زائل ہو جاتا ہے خیر تکوینیات میں تو ہم کو زیادہ تحقیق نہیں اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں کہ سب چیزوں کی خاصیات دریافت کی جائیں اور ہر قسم کی دوائیں جمع کی جائیں کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ عدم تحقیق کی وجہ سے کسی مضر کو استعمال کر لے گا اور اس کی

مضرت کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ ہلاک ہو جائے گا تو ہلاک ہونا تو ایک دن ضروری ہے۔ بدوں کسی مضرت چیز کے استعمال کئے بھی موت ایک دن آتی ہے۔

دینی ضرر ایک خسارہ عظیم ہے

مگر شریعات میں یہ ضروری ہے کہ جو امور مضرت ہیں ان کو جانے کیونکہ ان کے نہ جاننے سے دینی ضرر ہوتا ہے جو کہ خسارہ عظیم ہے۔ اس کا ضرر موت سے بھی ختم نہ ہوگا بلکہ مرنے کے بعد بھی باقی رہے گا اور یہ سخت ضرر ہے۔ جس کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کانوا یسئلونہ عن الخیر و کنت اسئلہ عن الشر مخافة ان یدرکنی یعنی اور صحابہ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی تحقیق کیا کرتے تھے اور میں شر کی تحقیق زیادہ کیا کرتا تھا اس خوف سے کہ کہیں شر میں مبتلا نہ ہو جاؤں اس لئے جو چیز دین کو مضرت ہو اس کی تحقیق کر لینا لازم ہے۔ منجملہ اس کے وہ شبہات بھی ہیں جو قرآن و حدیث میں لوگوں کو پیش آیا کرتے ہیں ان کا رفع کرنا ضروری ہے اور اس میں حق تعالیٰ نے یہ اعانت فرمائی ہے کہ جس جگہ قرآن میں شبہ ہوتا ہے وہیں جواب بھی مذکور ہوتا ہے لہذا شبہ کے وقت سیاق و سباق میں ضرور غور کر لینا چاہیے۔ چنانچہ لا تنزکوا انفسکم (تم اپنے نفسوں کا تزکیہ بیان کرو) پر جو قد افلح من زکھا سے تعارض کا شبہ ہوا تھا اس کا جواب اسی جملہ کے ساتھ ساتھ دوسرے جملہ میں مذکور ہے یعنی هو اعلم بمن اتقى (وہ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے) میں کیونکہ اس میں مذکور کی علت کا ذکر ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ بیان نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے اس میں حق تعالیٰ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک اپنا زیادہ علیم ہونا دوسرے من اتقی کے ساتھ علم کا متعلق ہونا۔

تقویٰ باطنی عمل ہے

نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ تقویٰ باطنی عمل ہے چنانچہ حدیث میں صراحتہ مذکور ہے الا ان التقویٰ ہنا و اشار الی صدرہ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سنو تقویٰ یہاں ہے۔

تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے

نیز تقویٰ کے معنی لغتہ ڈرنے اور پرہیز کرنے کے ہیں یعنی معاصی سے بچنا اور ڈرنا تو ظاہر ہے کہ باطن کے متعلق ہے اور معاصی سے بچنے کا ڈر خود اصلاح باطنی ہے چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اس کی پوری

تصریح ہے۔ ان فی جسد ابن ادم مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کله الا وہی القلب کہ انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے سن لو وہ دل ہے اس سب سے تقویٰ کی حقیقت واضح ہوگئی کہ تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے۔ پس اب تقویٰ اور تزکیہ دونوں مترادف ہوئے آیت کا حاصل یہ ہوا۔ ہو علم بمن تزکیٰ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب یہ سمجھو کہ اس میں تزکیہ کو عبد کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس سے اس کا داخل اختیار ہونا مفہوم ہوتا ہے تو وہ مقدر ہوا۔ پھر یہ کہ اعلم فرمایا ہے اقدر نہیں فرمایا۔ اس سے بھی اشارہ معلوم ہوا کہ بندہ کی قدرت کی نفی مقصود نہیں ہے پس اس سے بھی تقویٰ و تزکیہ کا مقدر و عبد ہونا مفہوم ہوا۔ ورنہ اعلم نہ فرماتے بلکہ اقدر علی جعلکم متقین یا اس کے مناسب اور کچھ فرماتے جب تقویٰ اور تزکیہ ایک ٹھہرے اور مقدر و عبد ٹھہرے اب غور کرنا چاہیے کہ ہو اعلم بمن اتقی تزکیہ انفسکم کی علت بن سکتی ہے یا نہیں اگر لا تزکیہ کا معنی یہ لئے جائیں کہ نفس کا تزکیہ نہ کیا کرو یعنی نفس کو رذائل سے پاک کرنے کی کوشش نہ کرو تو ہو اعلم بمن اتقی کی علت نہیں ہو سکتی کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے نفسوں کو رذائل سے پاک نہ کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے تزکیہ اور تقویٰ کیا ہے اور یہ ایک بے جوڑی بات ہے یہ تو ایسا ہوا جیسے یوں کہا جائے کہ نماز نہ پڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے نماز پڑھی ہے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا بندہ کے کسی فعل کو جانا اس کے ترک کی علت نہیں ہو سکتی ورنہ پھر سب افعال کو ترک کر دینا چاہیے کیونکہ حق تعالیٰ تو بندہ کے سبھی افعال کو جانتے ہیں بلکہ اس کے مناسب یہ علت ہو سکتی تھی کہ ہو اعلم بمن اتقی علی جعلکم متقین او نحوہ یعنی یوں فرماتے کہ تم نفس کو رذائل سے پاک نہ کرو۔ کیونکہ تم کو متقی بنانے پر حق تعالیٰ زیادہ قادر ہیں تم پورے قادر نہیں ہو پھر کیوں کوشش کرتے ہو جب یوں نہیں فرمایا بلکہ اعلم بمن اتقی فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں تزکیہ کے وہ معنی نہیں بلکہ کچھ اور معنی ہیں جس کے ترک کی علت ہو اعلم بمن اتقی ہو سکتی ہے یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو۔ یعنی پاکی کا دعویٰ نہ کرو۔ کیونکہ حق تعالیٰ ہی کو خوب معلوم ہے کہ کون متقی ہے اور کون پاک ہوا ہے یہ بات تم کو معلوم نہیں اس لئے دعویٰ بلا تحقیق مت کرو۔ اب کلام میں پورا جوڑ ہے اور علت و معلول میں کامل ارتباط ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تزکیہ باب تفعیل کا مصدر ہے اور تفعیل کی خاصیتیں مختلف ہیں جس طرح اس کی ایک خاصیت تعدیہ ہے اسی طرح ایک خاصیت نسبت بھی ہے پس قد افلح من زکھا میں تزکیہ کا استعمال خاصیت تعدیہ کے ساتھ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا اس میں نفس کو رذائل سے پاک کرنے کا امر ہے اور لا تزکیہ انفسکم میں تزکیہ کا استعمال خاصیت نسبت کے ساتھ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو اس میں نفس کو پاک کہنے کی ممانعت ہے اب ان دونوں میں کچھ بھی

تعارض نہیں کیونکہ جس چیز کا ایک جگہ امر ہے دوسری جگہ اس کی ممانعت نہیں۔ بلکہ ایک نئی چیز کی ممانعت ہے۔ حکم تو نفس کے پاک کرنے کا ہے اور ممانعت پاک کہنے سے ہے کہے اب کیا اشکال رہا (زکوٰۃ النفس)

وَأَنَّ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝

ترجمہ: انسان کو وہی ملتا ہے جو اس نے سعی کی ہے۔

ایصال ثواب کا ثبوت

یہاں پر ایک بات طلباء کے کام کی یاد آئی وہ یہ ہے کہ معتزلہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ایک کے عمل کا ثواب دوسرے کے پہچانے سے بھی نہیں پہنچ سکتا اور ایصال ثواب کا انکار کرتے ہیں جو اب اس کا یہ ہے کہ لانا انسان میں لام نفع کا ہے اور نفع دو قسم کا ہے ایک ثواب دوسرا وہ خاصیت جو عامل کے اندر اس سے پیدا ہوتی ہے پس یہاں دوسری قسم کا نفع مراد ہے نہ کہ اول قسم بوجہ دوسری نصوص کے چنانچہ ایک دوسری آیت سے بھی یہ مضمون معلوم ہوتا ہے۔

سُورَةُ الْقَمَرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَاَنْشَقَّ الْقَمَرُ ①

ترجمہ: قیامت نزدیک آگئی اور چاند شق ہو گیا

تفسیری نکات

علامات قرب قیامت

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ شق قمر کا معجزہ علامات قیامت سے ہے اس میں وقوع کا انکار نہیں بلکہ معجزہ نہیں مطلب یہ ہے کہ جیسے طلوع شمس من المغرب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بلکہ علامات قیامت ہے ایسے ہی شق القمر بھی معجزہ نہیں بلکہ علامات قرب قیامت سے ہے جیسے آیت میں اقتراب ساعت کے اقتران سے مفہوم بھی ہوتا ہے اقتربت الساعة وانشق القمر

وَلَقَدْ يَسْرُنَا الْقُرْآنَ لِذِكْرِهِمْ لَمَّا كُرِهَ لِمَنْ مِّنْهُمْ مَّا كَانُوا يَسْتَعْجِلُونَ ۝۱۷

ترجمہ: اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

تفسیری نکات

استنباط احکام محققین کا کام ہے

ایک بار دین میں موجودہ زمانہ کے لوگوں کی آزادی اور خود رائی کا بیان ہو رہا تھا ارشاد فرمایا کہ اب تو لوگوں کی جرات یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ فقہاء اور مجتہدین نے جو مسائل قرآن و حدیث سے استنباط کئے ہیں ان کو غلط قرار دیتے ہیں اور خود قرآن و حدیث سے احکام کا استنباط کرنا چاہتے ہیں اور جب ان کو استنباط کی صعوبت پر متنبہ کیا جاتا ہے تو آیت ولقد يسرنا القرآن للذکر الایة پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب قرآن آسان ہے تو پھر کیا وجہ اس کو سمجھنا اور اس سے مسائل کا استنباط صرف علماء ہی کے ساتھ مخصوص ہو ہم نہ کر سکیں حالانکہ ان کا نہ یہ دعویٰ صحیح ہے اور نہ ان کا اس آیت سے یا اسی قسم کی دوسری آیتوں سے استدلال صحیح ہے کیونکہ قرآن و حدیث کے متعلق دو چیزیں ہیں ایک تو ان سے استنباط مسائل کا دوسرے تذکر و تذکیر یعنی ترغیب و ترہیب تو قرآن کو جو آسان فرمایا گیا ہے وہ صرف تذکر و تذکیر کے لئے آسان فرمایا گیا ہے چنانچہ اس آیت میں يسرنا کے بعد للذکر کا لفظ موجود ہے اسی طرح اس مضمون کی ایک دوسری آیت ہے۔ فانما يسرناه بلسانك لتبشربه المتقين و تنذربه اس میں بھی تصریح ہے کہ قرآن تبشیر و انذار کے لئے آسان کیا گیا ہے باقی رہا استنباط مسائل کا سوال سو اس کے متعلق کہیں ارشاد نہیں کہ وہ آسان ہے بلکہ میں خود قرآن سے ثابت کرتا ہوں کہ قرآن و حدیث سے استنباط احکام صرف محققین ہی کا کام ہے ہر شخص اس کا اہل نہیں۔ پانچویں پارہ میں ارشاد ہے۔ واذا جاءهم امر من الامن او الخوف اذا عوا به و لوردوه الى الرسول والى اولى الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم شان نزول اس آیت کا بالاتفاق یہ ہے کہ حضور کے زمانہ میں جب کوئی جہاد وغیرہ ہوتا تھا تو مواقع قتال سے جو خبریں آتی تھیں بعض لوگ بلا تحقیق ان کو مشہور کر دیتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس آیت میں ارشاد ہے کہ جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ وہ امن کی ہو یا خوف کی تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جوان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے حوالہ پر رکھتے تو ان میں جو اہل استنباط ہیں اس کو وہ حضرات پہچان

لیتے کہ کون قابل اشاعت ہے کون نہیں دیکھئے۔ یہاں مستنبطو نہ منہم فرمایا ہے اور یہ من تبعیضیہ ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اہل استنباط ہیں۔ سب نہیں حالانکہ یہ جنگ کی خبریں کوئی از قسم احکام شرعیہ نہ تھیں بلکہ واقعات حیہ تھے جو احکام کے مقابلہ میں عمیر الفہم نہیں تو جب معمولی واقعات حیہ کے متعلق قوت استنباط کا اثبات صرف بعض لوگوں کے لئے کیا گیا ہے تو موٹی بات ہے کہ قرآن و حدیث سے احکام کا استنباط تو بدرجہا مشکل ہوگا اس کا اہل ہر شخص کیسے ہو سکتا ہے اسی طرح حضور کے زمانہ کا ایک دوسرا واقعہ ہے وہ یہ کہ جب اول بار آیت لا یستوی القاعدون من المؤمنین غیر اولی الضرر والمجاہدون الا یہ نازل ہوئی جس میں مجاہدین کی قاعدین پر تفصیل کا بیان ہے تو اس وقت اس میں غیر اولی الضرر نہ تھا۔ اس لئے صحابہ تک نہ سمجھ سکے کہ یہ حکم مخصوص ہے قاعدین غیر اولی الضرر کے ساتھ حالانکہ حقیقت لغویہ و نصوص اعتبار عذر کی بناء پر قاعدین سے مراد یہاں وہی لوگ ہو سکتے تھے جو بلا کسی عذر کے جہاد میں شریک نہ ہو سکے ہوں ورنہ معذورین تو فی الحقیقت مقعدین ہیں۔ قاعدین نہیں مگر باوجود اس کے صحابہ اس کو نہ سمجھ سکے اس لئے اس کے متعلق سوال کیا جس پر غیر اولی الضرر بعد میں نازل ہوا اس سے صاف معلوم ہوا کہ محض زبان دانی فہم احکام کے لئے کافی نہیں یہ تو ایک فرع کے متعلق تحقیق تھی۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ عمیق ایک اصل کی تدقیق ہے وہ یہ کہ ظاہر اس میں ایک اشکال متوہم ہوتا ہے کہ غیر اولی الضرر قاعدین کا بیان ہے اور پھر نزول میں اس سے فصل کے ساتھ موخر تو اصل کلام میں بیان مراد سے کمی کا احتمال رہتا ہے اس اشکال کے حل کے لئے انہوں نے فہم خداداد سے اسی آیت کے قرینہ سے ایک اصل کلی کا استنباط کیا کہ بیان کے اقسام اور ان کے جدا جدا احکام سمجھ کر ایسی عجیب تفصیل کی کہ حیرت ہوتی ہے اس تفصیل کی بناء پر غیر اولی الضرر کو بیان تغیر نہیں قرار دیا بلکہ بیان تفسیر فرمایا ہے اور یہ حکم فرمایا کہ اگر بیان تغیر ہوتا تو اس کے اندر فصل نہ ہوتا بخلاف بیان تفسیر کے کہ اس کے اندر فصل جائز ہو دیکھئے کیا ایسے اصول ہم جیسے موسس کر سکتے ہیں اس تقریر سے جواب کا خلاصہ یہ نکلا کہ تذکرہ و تذکیر کے لئے تو قرآن آسان ہے باقی رہا استنباط فروع کا یا اصول کا یہ ایسا مشکل ہے جو ہمارے بس کا نہیں اس ایک ہی مسئلہ کو دیکھ لیجئے فرع کو بھی اور اس کی بناء بیان تغیر و بیان تفسیر کو بھی۔

اگر فقہاء ان مسائل کو استنباط نہ کر جاتے تو آج کل کے معترضین میں سے کیا کوئی شخص اس پر قادر تھا کہ ان مسائل کا ایسا استنباط کر سکے۔

استدلالات اور استنباطات کا ہے وہ دقیق ہے۔ اب رہا یہ شبہ کہ جب قرآن و حدیث کا سمجھنا بلا علوم درسیہ کے دشوار ہے تو صحابہ نے قرآن و حدیث کو کیونکر سمجھا کیونکہ یہ علوم درسیہ اس زمانہ میں تو مدون نہ تھے نہ ان کی تحصیل معتاد تھی تو جواب اس کا یہ ہے کہ صحابہ کی طبائع سلیم تھیں اس لئے ان کو قرآن و حدیث کے اندر

ایسے شبہات ہی پیدا نہ ہوتے اور مقاصد کے سمجھنے کے لئے ان کو مبادی کی تحصیل کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی اس لئے قرآن و حدیث کو بلا علوم درسیہ بخوبی سمجھ لیتے تھے۔ بخلاف آج کل کے لوگوں کے کہ وہ قرآن و حدیث کو تو بلا علوم درسیہ کے کیا سمجھتے معمولی معاملات و واقعات روزمرہ کے دقائق کا بھی بلا علوم درسیہ کے سمجھنا ان کو دشوار ہی ہو جاتا ہے۔

تذکر کے لئے قرآن آسان ہے

فرمایا ولقد یسرنا القرآن للذکر کا مطلب یہ تذکر کے لئے قرآن آسان ہے باقی استنباط احکام کا سو یہ بہت مشکل ہے عوام کیا سمجھتے عوام تو اخبار و حکایات کی کہنہ بھی نہیں سمجھ سکتے چنانچہ ارشاد ہے واذا جاء ہم امر من الامن او الخوف الی قوله تعالیٰ لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم (الخ) (اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن ہو یا خوف) تو اس کو وہ حضرات پہچان لیتے ہیں جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۳ ص ۱۲۲-۱۲۳)

دقائق قرآن و حدیث بلا علوم درسیہ سمجھ نہیں آ سکتے

قرآن و حدیث کے اندر جو تہ قیقات ہیں وہ بغیر مبادی کے سمجھ میں نہیں آتی ہیں اور مبادی بدوں تحصیل درسیات کے سمجھ میں نہیں آ سکتے تو قرآن و حدیث کے بہت سے دقائق بلا علوم درسیہ کے سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے دو حصے ہیں ایک حصہ تو نفس احکام اور اس کے متعلق تذکر و تذکیر کا ہے وہ تو آسان ہے اور نصوص کے اندر جا بجا جو قرآن کو آسان فرمایا گیا ہے اس سے مراد یہی حصہ ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر دوسری جگہ فرماتے ہیں وانما یسرناہ بلسانک لبشر بہ المتقین وتندر بہ قوما لدا۔ باقی رہا دوسرا حصہ جو استدلال اور استنباطات کا ہے وہ دقیق ہے۔ اب رہا یہ شبہ کہ جب قرآن و حدیث کا سمجھنا بلا علوم درسیہ کے دشوار ہے تو صحابہ نے قرآن و حدیث کو کیونکر سمجھا کیونکہ یہ علوم درسیہ اس زمانہ میں تو مدون نہ تھے۔ نہ ان کی تحصیل معقود تھی تو جواب اس کا یہ ہے کہ صحابہ کی طبائع سلیم تھیں اس لئے ان کو قرآن و حدیث کے اندر ایسے شبہات ہی پیدا نہ ہوتے اور مقاصد کے سمجھنے کے لئے ان کو مبادی کی تحصیل کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی اس لئے قرآن و حدیث کو بلا علوم درسیہ بخوبی سمجھ لیتے تھے۔ بخلاف آج کل کے لوگوں کے کہ وہ قرآن و حدیث کو تو بلا علوم درسیہ کے کیا سمجھتے معمولی معاملات و واقعات روزمرہ کے دقائق کا بھی بلا علوم درسیہ کے سمجھنا ان کو دشوار ہی ہو جاتا ہے

چنانچہ میں اس کی تائید میں ایک تازہ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ جب میری سوانح لکھی جا رہی تھی تو میں نے ہدایت کی تھی کہ اس سوانح میں میرے متعلق کشف و کرامت کا کوئی باب نہ تجویز کیا جاوے کیونکہ مجھ سے کوئی کشف و کرامت صادر ہی نہیں ہوئی۔ اس پر بعض احباب نے کہا کہ مثلاً فلاں فلاں واقعات ایسے ہیں جو پسند صحیح ثابت ہیں اور اگر وہ دوسروں کے متعلق ہوتے تو ان کو ضرور کشف و کرامت کے اندر داخل سمجھا جاتا تو اگر ان واقعات کو ہم کرامت کے باب میں درج کر دیں تو کیا حرج ہے میں نے کہا کہ چونکہ ایسے واقعات کے اندر مجھ کو دوسرا بھی احتمال ہوتا ہے اس لئے میں ایسے واقعات کو بھی کرامت کے عنوان سے درج کرانا نہیں چاہتا البتہ تمہارا دل چاہے تو ایسے واقعات کو سوانح میں انعامات الہیہ کے عنوان کے تحت میں درج کر سکتے ہو تو میرا یہ جواب ان کی سمجھ میں نہ آیا اور اس پر انہوں نے یہ شبہ پیش کیا کہ کرامت بھی تو حق تعالیٰ کا انعام ہی ہوتا ہے پھر کرامت میں اور انعام میں کیا فرق ہوا۔ لہذا ہماری درخواست ہے کہ ان واقعات کو کرامت ہی کے عنوان کے تحت درج کرنے کی اجازت دی جائے تو پھر میں نے ان کو علوم درسیہ کے قواعد کے ذریعہ سمجھایا اور یہ جواب دیا کہ ملزوم تو لازم کے لئے مستلزم ہوتا ہے مگر لازم ملزوم کے لئے نہیں ہوتا جیسے آگ تو حرارت کے وجود کو مستلزم ہے مگر حرارت آگ کے وجود کو مستلزم نہیں پس ہر کرامت کا تو انعام ہونا لازم ہے مگر ہر انعام کا کرامت ہونا لازم نہیں۔ لہذا ہر انعام کو کرامت میں کیسے داخل کرتے ہیں تب وہ خاموش ہوئے۔ اب میں بطور مثال کے ایک شبہ بیان کرتا ہوں جو علوم درسیہ سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے خود قرآن کی ایک آیت کے متعلق ہوتا ہے وہ یہ کہ نوس پارہ میں ارشاد ہوتا ہے **وَلَوْ عَلَّمَ اللَّهُ خَيْرًا لَّاسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ**۔ اس آیت میں کفار کی مذمت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ علم خیر کے لئے اسماع لازم ہے اور اسماع کے لئے تولى لازم ہے اور قاعدہ عقلیہ ہے کہ لازم کا لازم لازم ہوا کرتا ہے تو علم خیر کیلئے تولى لازم ہوئی جس کا مطلب اس قاعدہ مذکورہ کی بناء پر یہ ہوا کہ اگر حق تعالیٰ کو ان کفار کے متعلق خیر اور بھلائی کا علم ہوتا تو ان کفار سے تولى اور اعراض کا صدور ہوتا اور اس کا استحالہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کے علم کا واقع ہے مطابق نہ ہونا لازم آتا ہے جو محال ہے۔ اب اس شبہ کا رفع کرنا اس شخص کے لئے جو علوم درسیہ سے واقف نہ ہو بہت دشوار ہے اور جو علوم درسیہ پڑھ چکا ہو اس کے لئے ایک اشارہ کافی ہے۔ وہ کہ یہ شبہ تو جب صحیح ہوتا کہ یہاں اسماع حد اوسط ہوتا حالانکہ اسماع حد اوسط نہیں اس لئے کہ وہ مکرر نہیں کیونکہ پہلا اسماع اور ہے اور دوسرا اسماع اور ہے لہذا تولى کو جو لازم کا لازم سمجھا گیا اور اس بناء پر علم خیر کے لئے تولى کو لازم قرار دیا گیا خود یہی غلط ہوا پس حق تعالیٰ کے علم کے متعلق واقعہ کے غیر مطابق ہونے کا جو شبہ ہوا تھا وہ رفع ہو گیا اب آیت کا صحیح مطلب یہ ہوا کہ اگر حق تعالیٰ ان کے اندر کوئی خیر دیکھتے تو ان کو با اسماع قبول

سناتے مگر جبکہ حق تعالیٰ کے علم میں ان کے اندر کوئی چیز نہیں ہے ایسی حالت میں اگر ان کو نصیحت سنا دیں جو اسماع قبول نہ ہوگا کیونکہ یہ اسماع حالت عدم خیر میں ہوگا تو وہ لوگ اس کو ہرگز قبول نہ کریں گے۔ بلکہ توی اور اعراض کریں گے۔ اسی طرح قرآن کی آیت پر ایک دوسرا شبہ اور اس کا جواب یاد آیا اس کا واقعہ یہ ہے کہ جنگ بلقان کے زمانہ میں جب ایڈریانو پل پر کفار کا قبضہ ہوا تو ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت پریشانی ہوئی اور طرح طرح کے خیالات فاسدہ آنے لگے حتیٰ کہ بعض کو تو نصوص پر کچھ شبہات بھی پیدا ہو گئے تھے یہ حال دیکھ کر دہلی کے مسلمانوں نے ایک بڑا جلسہ کیا اور مجھ کو اس جلسہ کے اندر مدعو کیا اور صدر بنایا اور لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی نیت سے مجھ سے وعظ کی درخواست کی چنانچہ میری اس جلسہ میں تقریر ہوئی جب وعظ ہو چکا تو بآواز بلند میں کوئی شخص یہ نہ کہے کہ مجھ کو یہ پوچھنا تھا اور نہ پوچھ سکا۔ یہ سن کر ایک ولایتی منتہی طالب علم کھڑے ہوئے یہ لوگ معقول زیادہ پڑھتے ہیں قرآن سے معلوم ہوتا تھا کہ معقولی ہیں کہنے لگے کہ قرآن شریف میں وعدہ ہے ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون مگر باوجود اس کے پھر ایڈریانو پل پر کفار کا قبضہ ہو گیا تو اس کی کیا وجہ میں نے کہا کہ ذرا یہ تو بتلائیے کہ موجہات میں سے یہ کونسا قضیہ ہے بس میرے اس کہنے پر ہی وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر میں نے ہی خود ان سے کہا کہ آپ کو جو یہ شبہ ہوا کہ یہ قضیہ ضرور یہ یاد آئے ہے تو اس کی کیا دلیل ہے ممکن ہے کہ مطلقہ عامہ ہو جس کا ایک بار بھی وقوع کافی ہوتا ہے جو ہو چکا اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو گیا اس کے بعد پھر کوئی شخص نہیں کھڑا ہوا تو دیکھئے چونکہ یہ طالب علم علوم درسیہ پڑھے ہوئے تھے اور مبادی ان کے ذہن میں تھے اس لئے میرے ایک لفظ سے ان کا شبہ حل ہو گیا۔ اسی طرح ایک اور مولوی صاحب کو قرآن شریف کی ایک آیت کے متعلق شبہ تھا وہ یہ آٹھویں پارہ میں ارشاد ہے سيقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اباننا ولا حرمانا من شیء کذالک کذب الذین من قبلہم حتی ذاقوا باسنا قل هل عندکم من علم فتخرجوه لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اول کفار مشرکین کا معقول نقل فرمایا ہے کہ اگر حق تعالیٰ یہ چاہتے کہ ہم سے شرک کا وقوع نہ ہو تو ہم شرک نہ کرتے (مگر جب ہم سے شرک کا وقوع ہوا تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کیا ہے جو حق تعالیٰ کا چاہا ہوا تھا) پھر اس مقولہ کے نقل فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے کذالک سے تخرصوں تک کفار کے اس مقولہ کا رد فرمایا ہے۔ اور ساتویں پارہ میں ہے ولو شاء اللہ ما اشرکوا کو یعنی حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں کہ ان مشرکین پر اتنا رنج و غم نہ کیجئے کیونکہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں ہماری مشیت سے کر رہے ہیں اگر ہم چاہتے کہ یہ شرک نہ کریں تو یہ شرک نہ کرتے تو آٹھویں پارہ میں جو آیت ہے وہاں تو شرک کے متعلق مشیت کی نفی فرمائی ہے اور اس سے

دوسری آیت میں اس مشیت کا اثبات فرما رہے ہیں۔ تو ان دونوں آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے وہ مولوی صاحب مجھ سے اس کے جواب کے طالب ہوئے اب وہ لوگ جو بلا علوم درسیہ پڑھے ہوئے محض ترجمہ قرآن کو بطور خود دیکھ کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہم نے قرآن کو سمجھ لیا۔ ذرا اس شبہ کا تو جواب دیں۔ میں نے یہ جواب دیا کہ دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ تعارض تو جب ہوتا کہ جس مشیت کی ایک جگہ نفی کی گئی ہے اسی مشیت کا کوئی دوسری جگہ اثبات کیا جاتا۔ حالانکہ ایسا نہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ مشیت کی دو قسمیں ہیں ایک مشیت تشریحی جس کا دوسرا نام رضا ہے اور دوسرے مشیت تکوینی جس کا نام ارادہ ہے تو آٹھویں پارہ میں جس مشیت کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد مشیت تشریحی یعنی رضا ہے اور دوسری جگہ آیت میں جو مشیت کا اثبات کیا گیا ہے اس سے مراد مشیت تکوینی یعنی ارادہ ہے کیونکہ پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے کفار کا عقیدہ بیان فرمایا ہے تو کفار اپنے سے شرک کے متعلق مشیت تشریحی یعنی حق تعالیٰ کی رضا کے معتقد تھے اور دوسری آیت میں ایک عقیدہ شرعیہ بیان فرما کر حق تعالیٰ حضور کی تسلی فرماتے ہیں اور وہ عقیدہ شرعیہ یہی ہے کہ عالم میں جس سے بھی کفر و شرک کا وقوع ہو رہا ہے وہ حق تعالیٰ کے علم و ارادہ سے ہو رہا ہے گو مشیت تشریحی نہ ہو۔ اس کے بعد حضرت حکیم الامتہ دام ظلہم العالی نے حاضرین سے فرمایا کہ ان ہی دقائق کو دیکھ کر محققین نے لکھا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کے لئے چودہ علوم میں مہتر ہونے کی ضرورت ہے میں تو غیر مہتر کو اگر چہ وہ درسیات سے فارغ مولوی ہی کیوں نہ ہو۔ لوگوں کے سامنے ترجمہ قرآن بیان کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

آیت ولقد یسرنا القرآن پرایک شبہ اور جواب

قرآن کریم نے متعدد مرتبہ اس کلام کو دہرایا ہے کہ ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر یعنی ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔ اس پر عام طور پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ قرآن کے علوم و معارف تو ایسے ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء اور علماء کو اپنی عمریں صرف کرنے کے بعد بھی ان پر احاطہ نہیں ہو سکا تو پھر اس کو آسان فرمانے کا کیا مطلب۔

حضرت نے ارشاد فرمایا کہ یہ یسر (آسانی) مسائل میں ہے دلائل میں نہیں یعنی قرآن مجید نے جو احکام دیئے ہیں ان کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں۔ البتہ ان کے دلائل اور حکمتیں اور شبہات کے جوابات ان میں یسر کا ذکر نہیں۔ وہ اپنی جگہ محنت اور غور چاہتے ہیں۔ (مجالس حکیم الامت ص ۳۰۱)

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرَّحْمٰنُ ۱ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۳ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۴

ترجمہ: رحمن نے قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے انسان کو پیدا کیا (پھر) اس کو گویائی سکھائی۔

تفسیری نکات

افعال خاص حق سبحانہ و تعالیٰ

حق سبحانہ تعالیٰ نے ان چھوٹی سی آیتوں میں اپنے خاص افعال کا ذکر فرمایا ہے کہ جو سر اس رحمت ہے اور پھر اپنے اسم مبارک کو بھی عنوان رحمت ہی سے ذکر فرمایا ہے اور اس آیت میں تین رحمتوں کا ذکر ہے اور تینوں بڑی رحمتیں ہیں اور ہر ایک کو الرحمن ہی سے شروع کیا ہے کیونکہ الرحمن مبتداء ہے اور اس کے بعد خبر ہیں تو گویا عبارت یوں ہے۔

الرحمن علم القرآن الرحمن خلق الانسان الرحمن علم البيان

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں نعمتوں کا منشاء خدا تعالیٰ کی رحمت ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حاکم کسی سے کہے کہ مہربان حاکم نے تم کو عہدہ دیا۔ مہربان حاکم نے تمہاری ترقی کی مہربان حاکم نے تم کو افسر بنایا اس سے ہر اہل زبان سمجھ سکتا ہے کہ منشاء ان تمام عنایتوں کا مہربانی ہے۔ پس اسی طرح ان سب نعمتوں کا منشاء بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے اور پھر رحمت بھی عظیمہ کیونکہ رحمن مبالغہ کا صیغہ ہے تو ترجمہ کا حاصل یہ ہوا کہ۔

۱- جس ذات کی بڑی رحمت ہے اس نے قرآن کی تعلیم دی۔ یہ تو پہلی نعمت کا بیان ہے۔

۲- دوسری نعمت یہ کہ اس نے انسان کو پیدا کیا۔

۳- تیسری نعمت یہ کہ اس نے انسان کو بیان کرنا سکھلایا۔

ان تینوں نعمتوں میں اس وقت کی غرض کے مناسب تیسرا جملہ ہے۔ مگر چونکہ ان دو نعمتوں کی تقدیم جس طرح ذکر میں ہے اسی طرح وہ دونوں وجود میں بھی اس تیسری نعمت پر مقدم ہیں خواہ وجود حسی ہو یا وجود معنوی اس لئے ان کے دو جملوں کی بھی تلاوت کی گئی۔ چنانچہ ایک مقام کا تقدم اور دخل تو ظاہر ہے یعنی خلق الانسان کہ اس کو تو تکویناً دخل ہے اور یہ شرط تکوینی ہے کیونکہ جب تک انسان پیدا نہ ہو اس وقت تک تعلیم بیان ہو ہی نہیں سکتی۔ تو تعلیم و تعلم موقوف ہے وجود پر اور وجود موصوف ہے ایجاد پر۔

اسی سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ اگر پیدا نہ ہوتے تو بیان نہ کر سکتے لیکن اس کے مستقلاً ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ اس پر متنبہ فرمانا ہے کہ جو نعمت کسی دوسری نعمت کا وسیلہ ہو وہ ایک درجہ میں مستقل اور مقصود بھی ہے اس کو محض واسطہ ہی نہ سمجھا جائے یعنی بعض نعمتیں چونکہ وسیلہ ہوتی ہیں اس واسطے ان کی طرف اکثر توجہ نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے مستقلاً ذکر کرنے سے گویا یہ ارشاد فرما دیا کہ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ بھی قابل مستقل ذکر اور توجہ ہے صرف علم البیان ہی نعمت نہیں پس اگر یہ نعمت تکوین مذکور نہ ہوتی تو اس کی مقصودیت پر لفظاً تنبیہ نہ ہوتی اور ذکر کرنے میں تنبیہ ہو گئی ہے یہ مستقلاً بھی نعمت ہے کیونکہ پیدا کرنا صرف واسطہ تعلیم بیان ہی نہیں بلکہ اس میں اور بھی تو مصالح ہیں بہر حال اس پر تو توقف تکوینی ہے اور بہت ظاہر ہے۔

رہا دوسری شرط کا تقدم وہ بہت غامض ہے حتیٰ کہ اہل علم بھی بعض اوقات اس کی طرف التفات نہیں کرتے اور وہ شرط علم القرآن ہے کہ اس پر توقف تشریحی ہے یعنی بیان کا وجود اگرچہ بدوں قرآن کے حسا ہو گیا لیکن وجود صحیح قابل اعتبار تعلیم قرآن کے بعد ہوگا کیونکہ اگر بیان میں تعلیمات قرآنیہ کا لحاظ نہیں تو وہ بیان اور تقریر شرعاً باطل اور کالعدم ہے جیسا کہ آج کل اکثروں نے قرآن کی تعلیم کو بالکل ترک کر دیا ہے۔ عوام الناس کو تو دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر امور میں حدود شرعیہ سے متجاوز ہو گئے ہیں اور ان کی ذرا رعایت نہیں کرتے مگر ہم اس طرح طلباء کو بھی اپنے اقوال و افعال میں جادہ شریعت سے بہت بڑھا ہوا پاتے ہیں۔ اور قرآن کی تعلیم کو انہوں نے بھی بہت زیادہ چھوڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل تحقیق طلبہ کو ایسے جلسوں اور انجمنوں کی اجازت دیتے ہوئے کھکتے ہیں کیونکہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ جلسوں کی کارروائی میں متجاوز عن الشرع نہ ہو جاویں پس جو بیان متجاوز حدود عن الشرع ہو وہ علمہ البیان میں داخل نہیں ہے۔

فِي أَيِّ آيَةٍ رَبِّكُمْ تَكْذِبُونَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

تفسیری نکات

بیان نعم و نعم

اور یہی وجہ ہے کہ سورۃ رحمن میں بیان نعم (عذاب) کے بعد بھی وہی فرمایا ہے جو بیان نعم کے بعد فرمایا ہے یعنی فبای الاء ربکما تکذبان یعنی خدا کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو اس کی ضروری تفصیل اہل علم کے لئے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ سورہ رحمن کے اول رکوع میں تکوینی نعم کا بیان ہے اور تیسرے رکوع میں نعم اخرویہ کا ان کے ساتھ توفبای الاء ربکما تکذبان (اپنے رب کی کون کون سی نعمت جھٹلاتے ہو) کا ربط ظاہر ہے لیکن دوسرے رکوع میں نعم کا بیان ہے ان کے ساتھ فبای الاء الخ کا بظاہر کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا نعم کے بعد توفبائے الاء سے خطاب سب کے نزدیک بر محل ہے مگر اکثر لوگ نعم کے بعد فبای الاء الخ پر تعجب کرتے ہیں کہ نعم کے بعد اس کا کیا جوڑ مثلاً جہنم کا ذکر فرمایا اس کے بعد فرمایا فبای الاء الخ یعنی اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو اس میں یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا جہنم بھی نعمت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ گو بظاہر مذکور کے درجہ میں جہنم نعمت ہے لیکن ذکر کے درجہ میں وہ نعمت ہے کیونکہ اس کا ذکر ہدایت کے لئے کیا گیا ہے اور نعمت کے ساتھ ظاہر کا لفظ اس واسطے کہا کہ واقع میں خود جہنم بھی نعمت ہے ان شاء اللہ اس کو بھی بیان کر دوں گا اس وقت یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جس طرح جنت کا ذکر کر کے ترغیب دینا نعمت ہے اسی طرح جہنم کا ذکر کر کے ترہیب کرنا بھی نعمت ہے۔ جیسا کہ طبیب کا دوا بتلانا بھی نافع ہے اور قابل پرہیز اشیاء کی فہرست بتلانا اور ان کی مضرتیں بیان کرنا بھی نافع ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جس طرح حصول خیر میں کوشش کی جاتی ہے اسی طرح شر سے بچنے کا بھی اہتمام ہوتا ہے چنانچہ حضرت حدیفہؓ نے فرمایا ہے کہ اسالہ الشر مخالفۃ ان یدرکنی یعنی کل من علیہا فان و یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام جتنے روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت والی ہے رہے گی۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے کل شیء ہالک الا وجہہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نفع صورت کے تحت ارواح بھی فنا ہو جائیں گی تو پھر حیات ملکوتیہ بھی اچھی نہ ہوئی۔

اس کا جواب بعض نے تو یہ دیا ہے کہ ایک آیت میں استثناء بھی وارد ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ و نفع فی الصور فصعق من فی السموات ومن فی الارض الا من شاء اللہ۔
 کہ جب نفع صور ہوگا تو آسمان اور زمین والے سب بے ہوش ہو جائیں گئیں گے یہاں صعق سے صعقہ موت مراد ہے اس کے بعد استثناء ہے الا ماشاء اللہ کہ جس کو حق تعالیٰ چاہیں گے وہ اس صعقہ سے مستثنیٰ بھی ہوگا پس ارواح الا ماشاء اللہ میں داخل ہیں ان کو موت نہ آئے گی۔

مگر ہم اس جواب پر مجبور و مضطر نہیں ہیں بلکہ ہم تسلیم کے بعد دوسرا جواب دیتے ہیں کہ اگر نفع صور کے وقت ارواح بھی فنا ہو جائیں تب بھی اس سے انقطاع حیات لازم نہیں آتا کیونکہ وہ فنا تھوڑی دیر کے لئے ہوگا ممتد نہ ہوگا اور امور عادیہ میں زمان لطف کا انقطاع مانع استمرار نہیں موٹی بات ہے کہ اگر ایک شخص پانچ گھنٹہ تک تقریر کرے اور درمیان درمیان میں سیکنڈ سیکنڈ سکوت کرے تو یہ سکوت مانع استمرار تقریر نہیں بلکہ محاورہ میں یہی کہا جاتا ہے کہ اس نے پانچ گھنٹہ تک مسلسل تقریر کی اس پر اگر کوئی کہنے بھی لگے کہ واہ صاحب اس نے درمیان درمیان دس دس پانچ پانچ سیکنڈ سکوت بھی تو کیا تھا۔ پانچ گھنٹہ مسلسل تقریر کہاں کی تو ہر شخص یہ کہے گا کہ تم احمق ہو کہیں دس دس سیکنڈ کے سکوت کا بھی اعتبار ہوا ہے۔

اسی طرح جب آپ چلتے ہیں تو حرکت کے ساتھ درمیان میں ایک زمان لطف کا سکون ہوتا ہے کیونکہ ایک پیر کی حرکت کے بعد بدوں اس کے سکون کے دوسرے پیر کو حرکت نہیں ہو سکتی مگر اس کا کوئی اعتبار نہیں کرتا بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ ہم مسلسل بارہ کوس تک چلتے رہے۔

غرض احکام عرفیہ عادیہ میں استمرار و دوام کے لئے زمان لطف کا تخیل مغل نہیں ہوتا تو نفع صور کے وقت ارواح کا فنا تھوڑی دیر کے لئے یا ایک لمحہ کیلئے ہوگا۔ محض تھلہ قسم کے طور پر جیسے قرآن میں ہے ان منکم الا واردھا کہ ہر شخص کو جہنم کا درد ضرور ہوگا۔ درد بمعنی مرور بھی آتا ہے اس پر تو کچھ سوال بھی نہیں اور بمعنی دخول بھی ہے۔ اس پر سوال ہوتا ہے کہ بعض تو دخول سے محفوظ رہیں گے۔ تو اس کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ بعضوں کا درد اگر بمعنی دخول بھی ہو محض تھلہ قسم کیلئے ہوگا۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ جہنم کی پشت پر پل صراط بچھایا جائے گا جس پر ہو کر سب مسلمان گزریں گے۔ بعض تو کٹ کر جہنم میں ہی جا گریں گے یہ تو حقیقتہً وارد ہوں گے اور بعض مثل برق خاطف کے گزر جائیں گے ان کو خبر بھی نہ ہوگی کہ جہنم کدھر کونسی ان کا درد تھلہ قسم کے لئے ہوگا کہ بس جہنم کی پشت پر سے گزر گئے اور راستہ میں جہنم پڑ گئی گو ان کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جیسے کوئی جلدی آگ کے اندر ہاتھ کو گزار دے۔ اسی طرح تھلہ قسم کے لئے ارواح کا فنا بھی ایک آن کے لئے ہو جائے تو یہ مانع بقاء نہ ہوگا۔
 یہ جواب محققین کا ہے اور بالخصوص فلاسفہ کے مذہب پر تو یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ ان کے نزدیک

زمانہ آتات سے مرکب نہیں بلکہ آن طرف زمان ہے۔ تو اب یہ کہنا بہت بہل ہے کہ ارواح کا بقا تو زمانی ہے اور فناء آتی ہے اور بقا زمانی کا انقطاع فناء زمانی ہی سے ہو سکتا ہے۔ نہ کہ فناء آتی سے اس تقدیر پر درحقیقت میں بھی انقطاع بقاء نہ ہوگا۔

يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرتے ہیں آسمان والے اور زمین والے اور وہ ہر وقت ایک شان میں ہے۔

تفسیری نکات

یعنی ہر وقت عالم میں مختلف قسم کے تصرفات کرتا رہتا ہے کسی کو حیات بخشا رہتا ہے کسی کو موت دیتا ہے کسی کو خوشی کسی کو غم کسی کو عزت کسی کو ذلت کسی کو پستی کسی کو رفعت یہاں پر لفظ سوال عام ہے خواہ بلسان قال ہو یا بلسان حال ہو یہ اس واسطے میں نے کہا کہ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ مخلوق میں تو بعض لوگ ملحد بھی ہیں جو خدا ہی کو نہیں مانتے اور بعض مانتے تو ہیں مگر زبان سے کبھی خدا سے کچھ نہیں مانگتے تو سمجھ لو کہ ملحدین متکبرین گوزبان قال سے سوال نہ کریں مگر زبان حال سے سب سوال کرتے ہیں کیونکہ سوال بزبان حال ہی کی دو قسمیں ہیں ایک بقصد ایک بلا قصد مریض حکیم کے پاس اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے یہ زبان حال سے سوال ہے معالجہ کا گوزبان قال سے کچھ نہ کہتا یہ تو سوال بزبان حال بقصد ہے اور بلا قصد کی یہ صورت ہے کہ ایک بیمار پڑا ہوا چیخ رہا ہے اس کی حالت بتلا رہی ہے کہ وہ معالجہ کا طالب ہے گو وہ قصد سوال بھی نہ کرتا ہو غرض کوئی زبان حال سے سوال کرتا اور کوئی زبان حال سے بقصد اور کوئی زبان حال سے بلا قصد شریعت میں بھی زبان حال سے قصد سوال کرنے کی ایک نظیر موجود ہے۔ حدیث میں ہے من شغله القرآن عن ذكرى ومسئلتى اعطيته افضل ما اعطى السائلين جو شخص قرآن میں اس درجہ مشغول ہو کہ اسے ذکر و دعا کی بھی فرصت نہ ہو یا دعا کی طرف التفات نہ ہو تو حق تعالیٰ اس کو سائلین سے زیادہ عطا فرماتے ہیں کیونکہ تلاوت قرآن میں مشغول ہونا یہ بھی سوال بزبان حال قصد ہے اور بلا قصد میں سب شامل ہیں جمادات بھی اور نباتات بھی اور ملحدین و متکبرین بھی کیونکہ سب کی حالت حدوث و امکان بتلا رہی ہے کہ یہ کسی بہت بڑی ہستی کے محتاج ہیں جس کے قبضہ میں سب کا وجود و بقاء ہے چنانچہ ہر ملحد و متکبر کی حالت دیکھ لی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ احتیاج میں سر سے پیر تک بندھا ہوا ہے جب سوال کو عام لے لیا گیا کہ خواہ بزبان حال ہو یا بزبان حال اور بقصد ہو یا بلا قصد تو اب من فی السموات والارض (جو آسمانوں اور زمین ہیں) میں لفظ من اپنے عموم پر ہے خاص کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ لفظ من میں ذوی العقول کی تغلیب ہے غیر ذوی العقول پر کہ

ذوی العقول کے لفظ میں غیر ذوی العقول کو بھی شامل کر لیا گیا اور اگر اہل تحقیق کا قول لے لیا جائے تو پھر تغلیب کی بھی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ ان کے نزدیک جمادات و نباتات وغیرہ سب ذوی العقول ہیں غیر ذوی العقول نہیں گو ان کی عقل اس درجہ نہ ہو جو تکلیف بالا احکام کے لئے کافی ہو مگر معرفت حق کے لئے ضرور کافی ہے چنانچہ حیوانات و جمادات و نباتات سب کے سب خدا کو پہچانتے ہیں بلکہ انبیاء اولیاء تک کو پہچانتے ہیں ہاں اگر یہ کہا جائے کہ لغت سب پر حاکم ہے محققین پر بھی اور غیر محققین پر بھی کیونکہ قرآن کا نزول لغت پر ہوا ہے نہ کہ محققین کی تحقیقات پر اور لغت میں لفظ من ان ذوی العقول کے لئے خاص ہے جو ظاہر میں ذوی العقول ہیں تو بے شک تغلیب کا ماننا ضروری ہوگا اور یہی صحیح ہے لیکن اب یہ سوال ہوگا کہ پھر تغلیب میں نکتہ کیا ہے سو اس میں نکتہ اسی وقت سمجھ میں آیا ہے کہ اس میں ذوی العقول کو تنبیہ ہے کہ خدا سے مانگنا اصل میں ذوی العقول کا کام ہے اور جو تمہارا کام تھا اس میں غیر ذوی العقول بھی تمہارے شریک ہیں پھر تمہارا خدا سے سوال نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟ کسی سے سوال نہ کرنے کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ اس کے خزانے میں کمی ہو یا اس میں شفقت و رحم نہ ہو یا سخاوت نہ ہو اور جس میں یہ سب باتیں موجود ہوں کہ اس کے خزانے بھی بے انتہا ہوں شفقت و رحم بھی کامل درجہ کا ہو سخاوت بھی اعلیٰ درجہ کی ہو اس سے سوال نہ کرنا تو بڑا غضب ہے پس خدا تعالیٰ سے ضرور سوال کرنا چاہیے شاید آپ یہاں ایک بات کہیں وہ یہ کہ ہم نے بعض دفعہ سوال کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں مگر مطلوب نہیں ملتا سو اس کا ایک تو جواب یہ ہے کہ آپ نے سوال کی طرح سوال ہی نہیں کیا خدا تعالیٰ سے اس طرح مانگو جس طرح کسی دنیا کے بادشاہ سے مانگا کرتے ہیں کیا بادشاہ سے مانگنے کے وقت آپ کی وہی صورت ہوتی ہے جو دعا کے وقت ہوتی ہے ہرگز نہیں۔ ایک ادنیٰ بادشاہ سے بھی کوئی سوال کرتا ہے تو اس کا دل رعب و جلال سے پر ہوتا ہے صورت پر عاجزی و خشوع کا پورا اثر ہوتا ہے اور سوال کے وقت کوئی بات بادشاہ کی مرضی کے خلاف اس میں نہیں ہوتی اور ہماری یہ حالت ہے کہ عین دعا کے وقت ہم سینکڑوں گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں کسی کے پاس پر ایسا حق دبا ہوا ہے کسی کے پاس موروثی زمین دبی ہوتی ہے بعض کی صورت بھی دعا کے وقت شریعت کے موافق نہیں ہوتی بلکہ باغیانہ شکل ہوتی ہے پھر یہ کہ دعا میں بھی لجاجت و التجا نہیں ہوتی دل بھی حاضر نہیں ہوتا اوپر سے دل سے دعا کرتے ہیں صورت پر بھی عاجزی اور زاری نہیں ہوتی اس حالت میں یہ بتلاؤ سوال سوال ہے۔ (السوال فی السوال)

پس اب حاصل آیت کا یہ ہوا کہ تمام مخلوق جو آسمان و زمین میں ہے حق تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے اب ایک سوال پیدا ہوگا کہ معنی عبادت کو لفظ سوال سے کیوں تعبیر کیا گیا اس میں کیا نکتہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک نکتہ تو یہ ہے کہ مخلوق عبادت کر کے کچھ ہم پر احسان نہیں کرتی بلکہ اپنا ہی بھلا کرتے ہیں کہ صورت سوال پیدا کر کے کچھ ہم سے لے لیتے ہیں دوسرے اس میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ عبادت کے اندر سوال کی

شان ہونا چاہیے عبادت اس طرح کرنا چاہیے جس طرح سوال کیا کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سوال میں صورت بھی عاجز نہ ہوتی ہے دل میں بھی تقاضا و طلب ہوتا ہے اور جس سے سوال کرتے ہیں اس کی طرف آنکھیں لگی ہوتی ہیں دل بھی ہمہ تن متوجہ ہوتا ہے کہ دیکھئے درخواست کا کیا جواب ملے تو یہی شان عبادت میں ہونا چاہیے اس سے تکمیل عبادت کا سہل طریقہ معلوم ہو گیا کہ عبادت کیونکر کامل ہوتی ہے لیجئے یہ انمول جواہرات آپ کو مفت بلا مشقت مل گئے ان کی قدر کیجئے اور یہاں سے علوم قرآن کا اندازہ ہوگا کہ لفظ لفظ میں کتنے علوم ہیں اور یہ تو وہ ہیں جہاں ہم جیسوں کی فہم پہنچتی ہے اور حکماء امت و عارفین اور صحابہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاں تک پہنچی ہوگی ان کی کیا شان ہوگی۔

عورتوں کے فضائل

اور حوروں کی شان میں قرآن پاک میں یہی وارد ہے فیہن قاصرات الطرف نیز عورتوں کے فضائل میں ہے الغافلوات المؤمنات معلوم ہوا کہ خارجیات سے بے خبری اصل وضع ہے۔ عورتوں کی اور گو یہاں پر مراد غفلت عن الفواحش ہے۔ مطلق بے خبری مراد نہیں مگر غفلت عن الفواحش مردوں میں بھی تو مقصود ہے لیکن باوجود اس کے عورتوں کی مدح میں تو اس کو لائے مردوں کے لئے تو یہ نہیں فرمایا اس سے صاف معلوم ہوا کہ مطلق بے خبری بھی عورتوں کے زیادہ مناسب ہے اب نالائق کہتے ہیں کہ پردہ توڑ کر بے پردہ ہو جاؤ اور ترقی کرو ان کے یہاں کسی چیز کی کوئی حد ہی نہیں عجب گو بردمانوں میں بھرا ہے میرا دل تو گواہی دیتا ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی ان نالائقوں کو کامیابی نہ ہوگی اللہ تعالیٰ دین کی امداد کریں گے جس سے ان اطراف کی عورتیں ہرگز قبول نہیں کریں گی۔

فرمایا حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کل یوم ہو فی شان مثلاً زندہ کرنا مارنا وغیرہ تجلیات اسمائے الہیہ ہر وقت ہر آن ہوا کرتی ہیں اسمائے الہیہ کی تجلی کو اس طرح پر سوچے کہ فلاں فلاں اسم کے فلاں فلاں اثر ظاہر ہوئے مثلاً امانت احیاء تخلیق ترزوق وغیرہ جو ان کے ساتھ متعلق ہے اس سے عرفان میں ترقی ہوگی۔

فسای الاء ربکما تکذبان (پس اپنے رب کی کون کونسی نعمت کی تکذیب کرو گے) اس سورہ میں تین قسم کے مضمون ہیں۔ اول رکوع میں آیات توحید ہیں اور دوسرے رکوع میں آیات عذاب اور تیسرے رکوع میں جنت کا بیان۔ اول اور سوم میں یعنی توحید اور جنت کے بیان میں تو فسای الاء ربکما تکذبان ظاہراً بھی بے جوڑ نہیں لیکن جہنم کے ذکر کے ساتھ فسای الاء ربکما تکذبان کا کیا جوڑ ہو سکتا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں فیومثلایسنل عن ذنبہ انس ولا جان یعنی قیامت کے دن کسی جن وانس کا عذر گناہ کے متعلق نہ چلے گا اس کے آگے پھر وہی فسای الاء ربکما تکذبان ہے اس میں کونسی نعمت تھی جو یاد دلائی گئی

آگے ہے يعرف المجرمون بسیمہم فیؤخذ بالواصی والاقدام یعنی گنہگاروں کو ان کے چہروں سے پہچان لیا جائے گا پھر یہ گت بنے گی کہ ایک طرف سے بال پکڑے جائیں گے اور ایک طرف سے پیر اور دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اس کے آگے بھی فرماتے ہیں فبای الاء ربکما تکذبان اس میں کوئی نعمت ہے جس کو جتلیا گیا۔ آگے ہے ہذہ جہنم الیٰ بکذب بہا المجرمون یطوفون بینہا و بین حمیم ان یعنی بطور سرزنش کہا جائے گا یہ وہی جہنم ہے جس کو مجرمین جتلیا کرتے تھے حاصل یہ ہے کہ ان کی یہ حالت ہوگی کہ کبھی آگ میں جلائے جائیں گے اور کبھی ماء حمیم پلایا جائے گا جس سے آنتیں کٹ پڑیں گی بتائیے کس قدر سخت عذاب ہے لیکن اس کے ساتھ بھی وہ آیت ملی ہوئی ہے فبای الاء ربکما تکذبان (حق تعالیٰ شانہ کا عذاب سے ڈرانا بھی رحمت ہے) ان ساری آیتوں میں سے کسی میں بھی رحمت کا ذکر نہیں بلکہ عذاب ہی عذاب کا ذکر ہے پھر کس نعمت کو یاد دلایا اور اس کا کیا جوڑ ہے۔

دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ کہا جائے کہ یہ آیت نعوذ باللہ جا بجا بے جوڑ ہے یا کچھ جوڑ بتلایا جائے بے جوڑ تو ہو نہیں سکتی اس واسطے کہ قرآن شریف ایسا کلام ہے جس کی فصاحت و بلاغت صرف مسلمانوں ہی کے نزدیک مسلم نہیں بلکہ بے دینوں اور دشمنوں اور مخالفین کے نزدیک بھی مانی ہوئی ہے اور کلام کے لئے اس سے زیادہ کوئی عیب نہیں ہو سکتا کہ اس میں جوڑ اور ربط بھی نہ ہو۔ غرض قرآن میں اس شق کا تو احتمال ہی نہیں پس یہ یقینی بات ہے کہ جوڑ ہے اور جوڑ یہی ہے کہ عذاب کو یاد دلایا گیا تاکہ اس کے موجبات سے لوگ بچیں اور رحمت کے مستحق ہوں جیسے کہ باپ نے بچے کو ڈرایا تھا کہ اس چیز کو مت کھانا اس سے بچش ہو جائے گی۔ یہ اس نے اسی واسطے کہا کہ بچہ اس تکلیف دہ چیز سے بچ جائے اور بچش کی تکلیف نہ اٹھائے جس طرح باپ کا ڈرانا رحمت تھا اسی طرح حق تعالیٰ کا عذاب کو بیان کرنا بھی رحمت ہے اسی کو بار بار یاد دلاتے ہیں اور فرماتے ہیں فبای الاء ربکما تکذبان یعنی ہماری تمہارے اوپر ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ ہم تم کو ایسے ایسے عذابوں سے بچانا چاہتے ہیں تم کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے اس آیت کے تکرار سے میرے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ آیات عذاب بھی آیات رحمت ہیں اب غور کرنے کی بات ہے کہ جن کی آیات عذاب بھی رحمت ہوں تو آیات رحمت کا کیا حال ہوگا اس کو کس لفظ سے بیان کیا جائے۔

جنت کی نعمتوں کے مستحق

کیونکہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جن اچھے عمل کریں گے تو جنتی ہوں گے سورۃ رحمن میں جنت کی نعمتوں کا ذکر کر کے فرمایا ہے۔ فبای الاء ربکما تکذبان (پھر تم اے جن وانس) اپنے رب کی

کوئی نعمت کا انکار کرتے ہو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی نعمتیں دونوں ملیں گی نیز یہ بھی فرمایا کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اَنْسٌ قَلْبُهُمْ وَلَا جَانٌ (یعنی حوروں کو ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا نہ کسی جن نے) تو اگر جن کا احتمال ہی نہ تھا تو یوں کیوں فرمایا اور اس سے بھی صاف لیجئے کہ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ایک فریق جنت میں ہوگا۔ ایک فریق دوزخ میں ہوگا تو دو فریق فرمائے ہیں تیسرا فریق نہیں فرمایا اور یہ یقین ہے کہ دوزخ سے بچے رہیں گے تو اب اگر وہ جنت میں نہ جاویں تو تیسرا فریق ہونا لازم آتا ہے نہ وہ فریق فی الجہنہ (جنت کے فریق) میں داخل ہوئے نہ فریق فی السعیر (دوزخ کے فریق) میں اب رہی یہ بات ہے کہ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اعراف میں بھی رہیں پس تیسرے فریق کا بھی ثبوت ہوا مگر یہ شبہ بہت جلد زائل ہو جاوے گا کیونکہ اسی مقام پر فرماتے ہیں ادخلوا الجنة لا خوف عليكم ولا انتم تحزنون (تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں نہ تم رنجیدہ ہو گے) اس میں دو تفسیریں ہیں ایک تو وہ جو میں اختیار کرتا ہوں کہ یہ اہل اعراف کا قول ہے وہ دوزخیوں کو چڑانے کے لئے اہل جنت کے بارہ میں کہیں گے کہ اهلوا الذين اقسمت لا ينالهم الله برحمة (کیا یہ وہی لوگ ہیں کہ جن کے بارہ میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہ کرے گا۔)

قِيلَ لَهُمْ ادخلوا الجنة الخ دیکھو نہیں تو یہ کہہ دیا گیا کہ تم جنت میں چلے جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم رنجیدہ ہو گے دوسرا ایک قول اور ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اہل اعراف کے لئے ادخلوا الجنة۔ یعنی تم بھی جنت میں داخل ہو جاؤ سو اس آیت میں تو دونوں احتمال ہیں مگر میں دوسری آیت سے استدلال کرتا ہوں فرماتے ہیں وبينهما حجاب و على الاعراف رجال يعرفون كلا بسيماهم ونادوا اصحاب الجنة ان سلام عليكم لم يدخلوها وهم يطمعون (ان دونوں کے درمیان ایک اڑ ہوگی اور اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ ہر ایک کو ان کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے السلام علیکم۔ ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اور اس کے امیدوار ہوں گے۔) اس سے معلوم ہوا کہ اہل اعراف کو جنت میں داخل ہونے کی امید ہوگی اور عالم آخرت عالم انکشاف حقائق ہے۔ وہاں غلط امید نہیں ہو سکتی دوسرا استدلال اور ہے کہ سورہ حدید میں ہے فضرب بينهم بسور له باب باطنه فيه الرحمة وظاهره من قبله العذاب (پھر ان کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا کہ اس کے اندرونی جانب میں رحمت ہوگی اور بیرونی جانب میں عذاب ہوگا۔)

مگر اس سے قبل سمجھئے کہ حدیث میں ہے کہ تین قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ کہ ان کے حسنات زیادہ ہوں گے سیئات سے وہ تو جنت میں جائیں گے یہ لوگ اعراف میں ہوں گے۔ اب سنئے بسورہ باب کو مفسرین نے بالا جماع اعراف کہا ہے تو اس کے دوزخ میں ایک طرف عذاب ہے اور ایک طرف رحمت ہے تو وہاں دونوں

طرف کا اثر ہے اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ مؤمنین میں سے جو جہنم میں جاویں گے وہ گناہوں کی سزا ملنے کے بعد جنت میں جاویں گے تو اہل اعراف جو ان سے صلح حالاً ہیں وہ کیوں جنت میں نہ جاویں گے اور گفتگو ان جنوں میں ہو رہی ہے جو صلح ہوں ہاں اس کے ہم بھی قائل ہوں گے کہ جنوں میں تین قسم کے لوگ ہوں گے اس میں سے ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہیں جن کے حسنات و سنیات برابر ہوں گے اور وہ اولاً اعراف میں ہوں گے مگر کچھ دنوں کے بعد پھر جنت میں جاویں گے اور اعراف کے متعلق ایک اور بات یاد آئی جو عوام میں مشہور ہے اور بالکل غلط ہے وہ یہ کہ رستم اور نوشیرواں اور حاتم طائی یہ سب اعراف میں رہیں گے لوگوں کی بھی عجیب حالت ہے اپنی طرف سے جو چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں گویا یہ اس محکمہ کے حاکم ہیں کہ ان کے اختیار میں ہے جس کو جہاں چاہیں بھیج دیں خوب سمجھ لو کہ اگر ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے تو محض سخاوت یا شجاعت یا عدالت کی وجہ سے جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے کسی کے اندر کتنی ہی خوبیاں ہوں جب تک ایمان نہ ہوگا سب بے کار ہیں۔

تجلیات اسماء الہیہ کا مراقبہ

فرمایا حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کل یوم ہو فی شان مثلاً زندہ کرنا مارنا وغیرہ وغیرہ تجلیات اسمائے الہیہ ہر وقت ہر آن ہوا کرتی ہیں۔ اسمائے الہیہ کی تجلی کو اس طرح پر سوچے کہ فلاں فلاں اسم کے فلاں فلاں اثر ظاہر ہوئے مثلاً امانت احیاء تخلیق ترزیق وغیرہ جو ان کے ساتھ متعلق ہے اس سے عرفان میں ترقی ہوگی۔

(مقالات حکمت صفحہ ۶۶)

هٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: یہ ہے وہ جہنم جس کو مجرم لوگ جھٹلاتے تھے۔

تفسیری نکات

کرامت استدراج میں فرق

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا گیا کہ اگر کسی خارق (کرامت) کے بعد قلب میں زیادت تعلق مع اللہ محسوس ہو تب تو وہ کرامت ہے اور اگر اس میں زیادت محسوس نہ ہو تو ناقابل اعتناء (توجہ) ہے اور یہ جو آج کل مخترع کشف و کرامت کی بناء پر پیروں کو مریداں می پرانند کا مصداق بناتے ہیں اور لوگوں کو پھنساتے ہیں بالکل ہی واہیات بات ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کیا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بدوی نفاع نام معتقد تھا اس نے ایک بار کہلا کر بھیجا کہ لڑائی میں میرے گولی لگ گئی ہے تکلیف ہے دعا کیجئے نکل جائے اس کا بیان ہے کہ دوسرے دن حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور زخم میں انگلی ڈال کر گولی نکال لی۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سن کر فرمایا کہ مجھے پتہ بھی نہیں نیز بعض اوقات خارق استدراج (ڈھیل) ہوتا ہے اور استدراج کے بعد نفس میں تکبر ہوتا ہے بس ایسے اشتباہ کی حالت میں اگر کوئی چیز راحت اور آرام کی ہے تو وہ ذکر اللہ میں مشغول رہنا ہے اور گنہگاری اور اپنے کو فنا کر دینا اور مٹا دینا اس ہی میں لطف ہے بدوں اس کے چین ملنا مشکل ہے مولانا فرماتے ہیں۔

بیچ کنجے بے دو بے دام نیست جز بخولت گاہ حق آرام نیست

اور کرامت و استدراج میں ایک ظاہر فرق یہ ہے کہ صاحب کرامت متصف بالایمان والعباد وغیرہ ہو گا۔ اور صاحب استدراج افعال منکرہ میں مبتلا ہوگا اور پہلا فرق جو مذکور ہوا انکسار و تکبر وغیرہ کا وہ اثر کے اعتبار سے ہے۔ (الافاضات الیومیہ ج ۱ ص ۲۱۹)

حقیقت گناہ

یہ تو ان گناہوں کی حالت ہے جن کو ہم گناہ سمجھتے تھے۔ مگر چند روز عادی ہو جانے کی وجہ سے غفلت ہو گئی بہت سے گناہ ایسے ہیں کہ جن کی طرف آج کل خیال بھی نہیں جاتا بلکہ چھوڑنے سے جی برا ہوتا ہے اور یوں تو گناہ سب ہی برے ہیں لیکن ایسے گناہ زیادہ خطرناک ہیں جو علی العموم عادت اور رواج میں داخل ہو گئے ہوں کیونکہ طبیعتیں ان سے مانوس ہو گئی ہیں حتیٰ کہ ان کی برائی ذہن سے دور ہو گئی اور بجائے اس کے ان کی ضرورت اور بھلائی دلنشین ہو گئی ہے ان کے چھوٹنے کی کیا امید ہو سکتی ہے آدمی چھوڑتا اس چیز کو ہے جس کی برائی خیال میں ہو اور جس چیز کی برائی ذہن سے نکل جاتی ہے پھر اس کو کیوں چھوڑنے لگا ان گناہوں کو میں مختصر بیان کرتا ہوں۔

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ گناہ کیا چیز ہے گناہ کی حقیقت ہے خدا کے حکم کو بجانہ لانا اور ان احکام کی کئی قسمیں ہیں ایک وہ جو کہ عقائد کے متعلق ہیں اور ایک وہ جو عمل کے متعلق ہیں اور بعض معاملات کے متعلق ہیں اور بعض حقوق عباد کے متعلق ہیں میں ان کو ترتیب وار مختصر مختصر بیان کرتا ہوں اول عقائد کے متعلق سنئے۔

ان حقوق کا بجالانا یہ ہے کہ عقائد جیسے خدا تعالیٰ نے بیان فرمائے ویسے ہی رکھے جائیں لیکن ان میں بھی بہت فساد آ گیا اور ان کو جو کچھ خراب کیا جہالت نے کیا عورتوں میں تو عام رواج ہے کہ پڑھنے پڑھانے کو کچھ چیز ہی نہیں سمجھتیں۔ جس کی طبیعت بچپن سے جس طرف کو چل جائے اسی طرف چھوڑ دی جاتی ہے۔

وَلَمِنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ ۖ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۱۷﴾ ذَوَاتَا

اَقْنَانٍ ۖ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۱۸﴾ فِيهِمَا عَيْنَانِ تَجْرِيانِ ۖ

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۱۹﴾ فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ ۖ

ترجمہ: جو شخص دنیا میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانہ ہے جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہتا ہے اس کے لئے دو باغ ہیں سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ وہ دونوں باغ کثیر شاخوں والے ہوں گے سوائے جن و انس اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں سے منکر ہو جاؤ گے۔ ان دو باغوں میں دو چشمے ہوں گے بہتے ہوئے چلے جائیں گے سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے ان دونوں باغوں میں ہر میوے کی دو قسمیں ہوں گی)

تفسیری نکات

دو جنتیں

یعنی جو شخص حق تعالیٰ کے خوف سے گناہ سے بچے گا اس کی جگہ جنت ہی میں ہے اور دوسری آیت میں ہے کہ اس کے لئے دو جنتیں ہیں کہ ان میں نہریں ہیں اور طرح طرح کے نعیم ہیں لیکن اس درجہ کا تو کیا ذکر ہماری تو یہ حالت ہے کہ ہم معاصی کئے جاتے ہیں اور دل میں کبھی کھٹکا بھی نہیں ہوتا کہ یہ گناہ ہوا بلکہ ان معاصی پر فخر کرتے ہیں کہتے ہیں ہم نے ذرا سی نوکری میں اتنا روپیہ کما لیا یہ ہمارا ڈھنگ اور چالاکی ہے۔ دھوکہ دے کر اور معاملات ناجائز کر کے ساری عمر روپیہ جمع کرتے رہتے ہیں پھر اس کو ہنر سمجھتے ہیں یہ وہ حالت ہے جس کو موت قلب کہتے ہیں اس کے بعد توبہ کی بھی کیا امید ہے کیونکہ توبہ کی حقیقت ہے ندم یعنی پشیمانی اور پشیمانی اسی کام سے ہوا کرتی ہے جس کی برائی ذہن میں باقی ہو۔ اور جب گناہ دل میں ایسا رچ گیا کہ اس پر فخر کرتے ہیں تو پھر پشیمانی کہاں؟

سُورَةُ الْوَاقِعَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۖ وَأَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۖ

مَا أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ۖ

ترجمہ: سو جو دہانے والے ہیں۔ وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں اور جو بائیں والے ہیں۔ وہ بائیں والے کیسے برے ہیں۔

تفسیری نکات

اصحاب الجنتہ کی دو قسمیں

ظاہر ہے کہ یہاں اصحاب الیمینہ سے مراد اصحاب جنت ہیں اور اصحاب المشئمہ سے مراد کافر ہیں مگر اصحاب الیمینہ سے مراد کل اصحاب جنت نہیں بلکہ صرف عامہ مومنین مراد ہیں اور خواص کا ذکر آگے ہے۔
والسابقون السابقون اولئک المقربون .

اس سے پہلے معلوم ہوا کہ یہ تیسری قسم ہے جو اصحاب الجنتہ سے بھی ممتاز ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ کہیں جنت سے الگ رہیں گے نہیں سکونت کے اعتبار سے یہ بھی اصحاب جنت ہیں مگر طلب کے اعتبار سے ان سے الگ ہیں۔

پس اصحاب الجنتہ کی دو قسمیں ہیں ایک من یطلب الجنتہ دوسرے من یتطلب الحق وان سکن الجنتہ اور سابقون کے تکرار سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ دونوں مذکورہ طبقوں سے سابق ہیں پس اصحاب جنت سے بھی سابق ہوئے یعنی معنی ہیں اہل جنت سے ان کے ممتاز ہونے کے آگے حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ

اولئک المقربون کے بعد فی جنت النعیم بھی فرمادیا تا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ شاید مقرب ہونے سے مراد یہ ہے کہ نعوذ باللہ وہ خدا تعالیٰ کی گود میں بیٹھیں گے تو بتلادیا کہ وہ بھی جنت ہی میں ہوں گے مگر دوسروں سے مقرب ہوں گے بہر حال اہل جنت میں دو قسمیں ہونا نصوص سے صراحتاً معلوم ہو رہا ہے اور اہل طریق کے کلام میں تو اس کی بہت تصریح ہے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ طلب کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی چیز کا طالب نہ ہونہ جنت کا نہ دوزخ سے بچنے کا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنت کو طلب نہ کرے بلکہ یہ مطلب ہے کہ بالذات طلب نہ کرے گو بعض اہل حال ایسے بھی ہیں جنہوں نے یہ صاف کہہ دیا کہ ہم کو نہ جنت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کی۔ مگر یہ لوگ محقق نہیں ہیں ہاں مغلوب ہیں چنانچہ اہل حال ایسے بہت گزرے ہیں جنہوں نے طالبان جنت پر انکار کیا ہے۔

السابقون مکرر فرمانے کا سبب

فرمایا کہ ایک نکتہ بیان کرتا ہوں گو ہے دلالت میں متحمل مگر قواعد کے بالکل مطابق ہے چونکہ کسی بزرگ کے کلام میں دیکھنے میں نہیں آیا اس لئے جرات نہیں ہوتی۔ اگر صوفیہ کو سو جھتی تو بڑے اچھلتے کودتے اور ہم تو طالب علم ہیں ہم میں وہ ذوق نہیں اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ایک آیت ہے فاصحاب المیمنة ما اصحاب الميمنة و اصحاب المشنمة ما اصحاب المشنمة و السابقون السابقون اولئک المقربون یہاں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اس آیت میں سابقون سابقون دو جگہ فرمایا ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ مقربین اصحاب میمنہ سے بھی بڑھ گئے۔ ایک سابقون سے ایک جماعت سے سبقت کی طرف اشارہ ہے دوسرے سابقون سے دوسری جماعت ہے۔ یہ میرا ذوق ہے کوئی دلالت قطعی نہیں ہے اس اشارہ پر اس میں تائید ہو جائے گی بعض عشاق کے ایسے مقالات کو جو موہم ہیں استغناء عن جنات کی اور یہ تائید اس تاویل سے ہوگی کہ مراد جنت کا وہ درجہ ہے جو اصحاب میمنہ کے ساتھ خاص اور یہ ان سے سابق ہونے کے طالب ہیں۔

سُورَةُ الْحَدِيدِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ

ترجمہ: تو ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں۔

تفسیری نکات

قرب حق سبحانہ و تعالیٰ

ہاں تم ہی ان سے دور ہو اس لئے ونحن اقرب الیہ من جبل الورد یعنی ہم تم سے بہت نزدیک ہیں یہ نہیں فرمایا کہ اتم اقرب الینا۔ کہ تم ہم سے بہت نزدیک ہو اس لئے کہ تم دور ہو اور وہ نزدیک ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ قرب و بعد تو نسبت مکررہ میں سے ہے۔ جب ایک دوسرے کے قریب ہوگا تو دوسرا بھی اس سے قریب ہوگا ایک بعید ہوگا تو دوسرا بھی بعید ہوگا مگر یہ قرب جسمی میں ٹھیک ہے۔ یہاں قرب کے معنی قرب علمی کے ہیں قرب جسمی کے نہیں ہیں پس مراد محض یاد اور توجہ ہے تو اس اعتبار سے وہ قریب ہیں یعنی تمہاری طرف متوجہ ہیں اور تم بعید ہو یعنی تم ان کی طرف متوجہ نہیں پس اگر تم ذرا ان کی طرف متوجہ ہو تو پھر ان کا قرب تمہیں معلوم ہو۔

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظ از میاں عاشق اور معشوق میں کوئی پردہ نہیں۔ تو خود ہی حجاب ہے اے حافظ درمیان سے علیحدہ ہو۔

مسابقت الی الجنۃ کا حکم

سابقوا الی مغفرة من ربکم و جنۃ عرضہا کعرض السماء والارض تم اپنے پروردگار کی

طرف دوڑوا اور نیز ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔
اس میں مسابقت الی الجنت کا امر ہے اگر جنت میں جانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے تو حکم سابقوا کیوں ہے؟ معلوم ہوا کہ ہمارے اختیار میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ اختیاری امور ہی کا مکلف فرمایا کرتے ہیں غیر اختیاری امور کا مکلف نہیں فرماتے نص موجود ہے۔

لا یکلف اللہ نفساً الا وسعها اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف شرعی نہیں بناتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔

الْمَيَّانِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ

مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ

عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسِقُونَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: کیا ایمان والوں کیلئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق (منجانب اللہ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب آسمانی ملی تھی (یعنی یہود جو نصاریٰ) پھر اس حالت سے ان پر زمانہ دراز گزر گیا (اور توبہ نہ کی) پھر ان کے دل خوب سخت ہو گئے اور بہت سے آدمی ان سے آج کافر ہیں۔

تفسیری نکات

شان نزول

اس آیت کا شان نزول سن لیجئے اس لئے کہ اس کی حقیقت سمجھنا اس پر موقوف بھی ہے۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپس میں ہنسنا بولنا شروع کیا تھا۔ اور ظاہر بات ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہنسنا بولنا معصیت کے درجہ میں ہرگز نہ تھا۔ اس لئے کہ صحابہ ایسے جری نہ تھے کہ ایک جماعت کی جماعت معصیت میں جان بوجھ کر مبتلا ہو اور نہ یہ احتمال ہے کہ ان کو معصیت کی خبر نہ ہو اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہوں کی فہرست صاف صاف بتادی تھی۔ حدیث میں ہے الحرام بین و بینہما مشتبہات حلال و حرام میں کسی قسم کا خفاء و غموض نہ تھا پھر علاوہ اس کے یہ ہے کہ صحابہ کا علم و معرفت ایسا نہ تھا کہ ان کو کسی معصیت کے ہونے کی خبر نہ ہو۔ وہ حضرات تو دقائق اور حقائق تک پہنچتے تھے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ کوئی دقیقہ ان سے مخفی نہ تھا یا یہ کہ وہ معصوم تھے میرے دعوے کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ جس امر میں ان

کی جماعت شریک ہو وہ امر ہرگز معصیت نہ ہوگا پھر یہ کہ ایک جماعت اس میں شریک ہو اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ اگر یہ ہنسنا بولنا معصیت ہوتا تو ضرور اس پر انکار تو ہوتا اور ہنسنا بولنا کوئی ایسا امر مخفی ہے نہیں کہ کوئی نہ میں چھپ کر کرتے ہوں ظاہر ہے کہ کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے یہ سب دلائل وقرائن ہیں اس بات کے کہ یہ ہنسنا بولنا ہرگز معصیت نہیں تھا مگر اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

نزول حق کا مفہوم

اس آیت میں اس فعل کے اثر سے تعرض ہے خود نفس فعل پر گرفت نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ کیا وہ وقت نہیں آیا ایمان والوں کے لئے کہ ان کے دل نرم ہو جاویں یعنی کس شے کا انتظار ہے کیا ان کے نزدیک ابھی دل کے نرم ہونے کا وقت نہیں پہنچا اور نرم ہونا کس شے کے واسطے اللہ کی یاد کے لئے اور جو حق بات نازل ہوئی ہے حق سے مراد وعدہ و وعید انداز و تبشیر پیدا کرنا چاہیے۔ یعنی خاشعین کی شکل بنانا چاہئے اس سے رفتہ رفتہ خشوع پیدا ہو جائے گا۔

ظاہر کا اثر باطن میں پہنچتا ہے

اس لئے کہ جس طرح باطن ظاہر میں موثر ہے اسی طرح ظاہر کا اثر بھی باطن میں پہنچتا ہے جس طرح دل کے اندر اگر غم ہو تو اس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے اسی طرح اس کا عکس بھی ہے کہ اگر رونے کی شکل بنالی جاوے تو دل میں بھی کیفیت غم کی پیدا ہو جاوے گی۔ اسی واسطے تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر رونانہ آوے تو رونے کی شکل ہی بنا لو تو شکل بنانا مقصود اصلی نہیں ہے مقصود تو یہ ہے کہ دل میں خشوع پیدا ہو اور اگر خشوع ہے اور رونانہ آوے تو کچھ حرج نہیں۔

بکا مامور بہ سے مراد دل کا بکا ہے

ایک دوست نے مجھ کو لکھا ہے کہ میں جب حج کرنے نہیں گیا تھا تو رونا بھی آتا تھا اور جب سے حج کر آیا ہوں رونا نہیں آتا۔ اس کا بہت افسوس ہے۔ میں نے لکھا کہ مراد دل کا رونا ہے وہ تم کو حاصل ہے حاصل آیت کا یہ ہے کہ ذکر اللہ و ما نزل من الحق کا مقتضایہ ہے کہ خشوع ہو اور حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر خشوع پیدا نہ ہو تو رونے کی شکل بنائے اور آیت میں اس کو بطور استفہام کے فرمایا کہ کیا اس کا وقت نہیں آیا مطلب یہ ہے کہ وقت آنا چاہیے۔

تخويف وانذار

ارشاد ہے ولا یكونوا کالذین اوتوا الكتاب الخ یعنی نہ ہو جاویں وہ مثل ان لوگوں کے کہ جن کو

پہلے کتاب دی گئی ہے۔ پس ایک زمانہ درازان پر گزرا اور ان کے دل سخت ہو گئے۔ یہ ان تَخَشَع قُلُوبِهِمْ کے مقابلہ میں بظاہر تو یوں فرماتے ان لَا تَخَشَع قُلُوبِهِمْ کہ ایسا نہ ہو کہ قلب میں خشوع نہ رہے یہ نہیں فرمایا بلکہ یہ ارشاد ہے کہ اہل کتاب جیسے نہ ہوں کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے تھے یہ تَخْوِيف و انذار ہے کہ اگر تم نے غفلت کی تو تمہارے دلوں کے اندر قساوت نہ ہو جاوے۔

افعال و احوال قلب پر جوارح کا اثر

جس کا اثر یہ ہے و کثیر منہم فسقون کہ بہت سے ان میں حد سے متجاوز ہیں۔ اس کا اثر ظاہر فرما دینا بڑی رحمت ہے اس لئے کہ جو معاصی ظاہرہ ہیں ان کو تو برا سمجھتے ہیں مگر قلب کے احوال کی اطلاع کم ہوتی ہے۔ پس اگر یہ اثر ظاہر نہ فرماتے تو اس سے بچنے کا زیادہ اہتمام نہ ہوتا حالانکہ یہ اہتمام اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ خود افعال جوارح کا مناظ بھی افعال و احوال قلب ہیں۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي

كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَاهُ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لِكَيْلَا

تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ

مُتَّعِلٍ فَخُورٍ ۝

ترجمہ: کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب یعنی روح محفوظ میں لکھی ہے قبل اس کے ہم ان جانوں کو پیدا کریں یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے یہ بات بتلا اس واسطے دی ہے کہ تا کہ جو چیز تم سے جاتی رہے اس پر رنج اتنا نہ کرو اور تا کہ جو چیز تم کو عطا فرمائی اس پر اتر او نہیں۔

تفسیری نکات

مسئلہ تقدیر کا ثمرہ

یہ تعلیل ہے ماسبق کی جس کا تعلق اخبرنا کم بدلک مقدر سے ہے یعنی ہم نے تم کو اس مسئلہ کی تعلیم اس لئے کی تا کہ تم مغموم نہ ہو اور اتر او نہیں اب غور کے قابل یہ امر ہے کہ لازم کے غایت کے واسطے لایا جاتا

ہے اور اوپر مسئلہ تقدیر کا ذکر ہے تو اس کی علت و غایت دوسری آیت میں بتلائی گئی ہے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تم کو مسئلہ تقدیر اس لئے تعلیم کیا ہے کہ جب تم اس کے معتقد ہو گے تو تم کو حزن و فرح نہ ہوگا اور مسئلہ تقدیر کا یہ اثر مشاہد ہے جو لوگ تقدیر کے معتقد ہیں وہ مصائب و حوادث میں منکرین تقدیر سے زیادہ مستقل اور ثابت قدم رہتے ہیں تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کا ثمرہ ایک عمل بھی ہے یعنی حصول تفویض و توکل اور اس کا عمل ہونا ظاہر ہے پس عقائد ہر چند کہ خود بھی مقصود ہیں مگر ان کو تکمیل عمل میں بڑا دخل ہے اور یہ دخل مطلوب بھی ہے جیسا کہ آیت میں لکھا تا سوا سے مستفاد ہوتا ہے اب اسی پر تمام عقائد کو قیاس کر لیجئے کہ مثلاً توحید کی تعلیم خود بھی مقصود ہے اور اس سے اعمال کی تکمیل بھی مقصود ہے کیونکہ جس شخص پر جس قدر توحید کا غلبہ ہوگا اتنا ہی اس کے اعمال مکمل ہوں گے اس کی نماز دوسروں کی نماز سے اکمل اس کی زکوٰۃ دوسروں کی زکوٰۃ روزہ سے افضل ہوگی اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

مغرور سخن مشوکہ توحید خدا

اور شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

موحد چہ بر پائے ریزی زرش

ہمیں ست بنیاد توحید و بس

امید و ہراسش نباشد ز کس

غرض موحد کامل کی یہ حالت ہوگی جو شیخ نے بیان فرمائی ہے جو ادنیٰ توحید والے کو حاصل نہیں ہو سکتی تو عقائد کو بظاہر جملہ خبریہ ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بیان میں عرض کیا ہے مگر ان سے مقصود جملہ انشائیہ ہیں اعتقاد یہ بھی عملیہ بھی جیسا ابھی مذکور ہوا اس بناء پر اللہ واحد کا مطلب یہ ہے کہ اس اعتقاد کے ساتھ عمل میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں پس اپنے عمل میں خدا کے سوا کسی کو مقصود نہ بناؤ ورنہ ریا ہو جائے گی جو شرک اصغر ہے اور توحید کامل کے خلاف ہے اسی طرح عقلاً خدا کے سوا کسی سے طمع و خوف نہ رکھو کہ یہ بھی توحید کے خلاف ہے ہاں طبعی طمع و خوف کا مضائقہ نہیں کیونکہ وہ تو اضطرار بے اختیار ہوتا ہے جیسے سانپ کو دیکھ کر طبعاً ڈر جانا یا شیر سے ہیبت زدہ ہو جانا مگر عقلاً یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہنا چاہیے کہ بدوں مشیت الہی کے کوئی چیز نفع یا ضرر نہیں دے سکتی۔ وما ہم بضارین بہ من احد الا باذن اللہ وان یمسک اللہ بضرفلا کاشف لہ الا هو وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ۔

کہ نہ راحت رشد ز خلق نہ رنج

گر گزندت رسد ز خلق مرنج

کہ آل ہر دو در تصرف اوست

از خداں خلاف دشمن و دوست

اور یہ بڑا قیمتی مضمون ہے کہ جملہ خبریہ سے محض خبر مقصود نہیں ہوتی بلکہ کوئی انشا مقصود ہوتی ہے۔

بہت سے لوگوں کو اپنے اعتقادات کی صحت پر ناز ہو جاتا ہے بس وہ اعتقاد صحیح کر کے نحن ابشاء اللہ واحبہاہ کا مصداق ہو جاتے ہیں کہ ہم اہل حق میں داخل ہیں اب ہم کو عذاب نہیں ہوگا چاہے کچھ بھی کرتے رہیں بہت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ درستی عقائد کے بعد اعمال میں کوتاہی زیادہ مضر نہیں اور اس کا منشا یہ ہے کہ ان لوگوں نے اعتقادیات میں محض علم کو مقصود سمجھ لیا ہے اور میں بھی پہلے یہی سمجھتا تھا کہ اعتقادیات میں علم ہی مقصود ہے مگر سالہا سال کے بعد ایک آیت نے مجھے اس طرف راہبری کی کہ عقائد فی نفسہ بھی مقصود ہیں اور عمل کے واسطے بھی مقصود ہیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ما اصاب من مصيبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبراہا ان ذلک علی اللہ یسیر لکیلاتنا سو علی مافاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم واللہ لا یحب کل مختال فخور۔ یہاں پہلی آیت میں تو مسئلہ تقدیر کی تعلیم ہے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے زمین میں یا تمہاری ذات میں وہ ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے (یعنی لوح محفوظ میں) اس مصیبت کے پیدا ہونے سے بھی پہلے بے شک یہ بات حق تعالیٰ پر آسان ہے۔ (اس کا انکار وہی کر سکتا ہے جس کو قدرت الہیہ کا علم نہ ہو) آگے تعلیم مسئلہ کی تعلیل فرماتے ہیں کہ یہ بات ہم نے تم کو کیوں بتلائی اس لئے تاکہ کسی چیز کے فوت ہونے پر تم کو رنج نہ ہو (بلکہ اس سے تسلی حاصل کر لو کہ یہ مصیبت تو لکھی ہوئی تھی اس کا آنا ضروری تھا ۱۲) اور کسی نعمت کے ملنے پر اتر او نہیں۔ (بلکہ یہ سمجھو کہ اس میں ہمارا کچھ کمال نہیں حق تعالیٰ نے پہلے ہی سے یہ نعمت ہمارے لئے مقدر کر دی تھی ۱۲) اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کی تعلیم سے صرف اعتقاد کر لینا ہی مقصود نہیں بلکہ یہ عمل بھی مقصود ہے کہ مصائب میں مستقل رہے اور ہر مصیبت کو مقدر سمجھ کر پریشانی نہ ہو اسی طرح نعمتوں پر تکبر و بطرنہ ہو ان کو اپنا کمال نہ سمجھے جب نص سے اس کا مقصود ہونا معلوم ہو گیا اور قاعدہ ہے کہ الشیء اذا خلا عن غایتہ انفسی شے جب اپنی حالت سے خالی ہو تو وہ کالعدم ہوتی ہے تو اب جس شخص کا مصائب و نعم کے وقت یہ حال نہ ہو وہ گویا تقدیر کا معتقد ہی نہیں یعنی کامل معتقد نہیں اگر کامل اعتقاد ہوتا تو اس کی غرض ضرور مرتب ہوتی۔

مسئلہ توحید کی تعلیم سے مقصود

اسی طرح توحید کا مسئلہ تعلیم کیا گیا ہے اس سے بھی صرف علم مقصود نہیں بلکہ قرآن میں غور کرنے سے توحید کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا خوف اور اس سے طمع نہ رہے اب جو شخص توحید کا قائل ہے مگر غیر اللہ سے خوف و طمع بھی رکھتا ہو وہ گویا توحید کا معتقد ہی نہیں بلکہ مشرک ہے چنانچہ صوفیاء نے اس پر شرک کا اطلاق کیا ہے اور صوفیاء نے کیا حق تعالیٰ نے اس کو شرک فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

فمن كان يرجو لقاء ربه فليعمل عملاً صالحاً ولا يشرك بعبادة ربه أحداً کہ جو کوئی لقاء رب کی امید رکھتا ہو وہ نیک عمل کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

حدیث میں لا یشرک کی تفسیر لایرائی آئی ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ عبادت میں ریا نہ کرے اس سے معلوم ہوا کہ ریا شریک ہے حالانکہ ریا میں غیر اللہ معبود نہیں ہوتا مگر چونکہ فی الجملہ مقصود ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں بڑا بننے کے لئے بنا سنوار کر عبادت کی جاتی ہے۔ اس لئے اس کو شریک فرمایا اور یہ بالکل عقل کے مطابق ہے کیونکہ عبادت غیر اللہ جو ارح سے ہوتی ہے اور جب وہ شریک ہے تو قلب سے غیر اللہ کو مقصود بنانا کیونکر شریک نہ ہوگا یہ تو قلبی عبادت ہے پس غیر اللہ سے خوف و طمع پر صوفیہ کا لفظ شریک اطلاق کرنا غلط نہیں کیونکہ اس صورت میں تو حید کی غایت مفقود ہے اسی طرح تمام عقائد میں غور کرو تو نصوص سے معلوم ہوگا کہ ہر اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہے تنہا اعتقاد مطلوب نہیں اور ہماری عادات میں بھی اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہوتا ہے۔

ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نزلنا ان ذلک علی اللہ یسر

مسئلہ تقدیر کی حکمت

یہاں تک تو مسئلہ تقدیر کا بیان تھا آگے اس کی حکمت بتلاتے ہیں۔ لکیلاتا سوا علی ما فاتکم

ولا تفرحوا بما آتاکم

کہ یہ مسئلہ تم کو اس لئے تعلیم کیا گیا تا کہ تم کو کسی فوت ہونے والی شے پر رنج نہ ہو اور کسی حاصل ہونے والی شے پر فرح نہ ہو کیونکہ فرح مطلقاً محمود نہیں بلکہ فرح شکر اہو وہ محمود ہے اور اسی کا ذکر ہے اس آیت میں قل بفضل اللہ وبرحمته فبذلک فلیفرحوا اور جو فرح بطراً ہو وہ محمود نہیں بلکہ مذموم ہے چنانچہ قارون کے قصہ میں ارشاد ہے اذ قال له اومه لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین (پ ۲۰)

مصائب میں حکمت خداوندی

حق تعالیٰ فرماتے ہیں ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نزلنا ان ذلک علی اللہ یسر لکیلاتا سوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم بتلایے اس آیت میں لام غایت کا متعلق کون ہے مذکور تو ہے نہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی جزو اس کا صالح نہیں، لامحالہ مقدر ماننا پڑے گا اب یہ بھی سمجھ لو کہ مقدر کیا ہے تو اس لازم سے اوپر اللہ تعالیٰ نے مسئلہ تقدیر بیان فرمایا ہے یعنی تم کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے خواہ آفاقی ہو یا نفسی وہ ایک کتاب میں اپنے ظہور سے پہلے لکھی

ہوئی تھی چونکہ یہ عجیب بات تھی اس لئے فرماتے ہیں کہ تعجب نہ کرو اللہ کو یہ سب آسان ہے اب اس مسئلہ کے بتلانے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو یہ مسئلہ اس لئے بتلایا تا کہ تم فاسق پر غم نہ کرو اور عطا کی ہوئی چیز پر اتر اؤ نہیں پس وہ مقدر را خبرنا کم بہ ہے۔

اصلاح اعمال میں تقدیر کا دخل

اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کو اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے کیونکہ اس سے حزن و بطر رفع ہو جاتا ہے اور حزن جڑ ہے تعطل ظاہر کی اور تکبر و بطر اصل ہے تعطل باطن کی یعنی غمگین و پریشان آدمی ظاہر میں تمام دین و دنیا کے کاموں سے معطل ہو جاتا ہے اور متکبر آدمی کا دل خدا کے تعلق سے معطل ہو جاتا ہے جب تک تکبر نہ نکلے خدا کے ساتھ دل کو لگاؤ نہیں ہو سکتا یہ تو تقدیر کو دخل تھا اعمال میں اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ توحید جو اعظم العقائد و اساس العقائد ہے اس کو بھی اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے چنانچہ سعدی فرماتے ہیں۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش چہ فولادی ہندی نہی برسرش
امید و ہر اش نباشد زکس ہمیں ست بنیاد توحید و بس

یعنی توحید سے مخلوق کا خوف و طمع زائل ہو جاتا ہے جب اتنا بڑا عقیدہ بھی اصلاح اعمال میں دخیل ہے تو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے اعتقاد کو آپ کے اتباع میں دخیل مانا جاوے تو کیا اشکال ہے اور یہی حضور کا اصل مقصود ہے (گو وہ فضائل ایک درجہ میں مقصود بالذات بھی ہیں)

اس لئے حضور نے اس میں زیادہ کاوش سے منع فرمایا کیونکہ جو مقصود ہے اس اعتقاد و فضیلت سے وہ بدوں تفصیل کے بھی صرف اجمالی اعتقاد سے حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح ہمارے اکابر نے اولیاء و مجتہدین میں بھی تقاضل سے منع فرمایا ہے۔

حق تعالیٰ میں خفا نہیں

چنانچہ نص میں ہے والظاهر و الباطن پھر تمہارا یہ کہنا کیونکر صحیح ہے کہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں صفت باطن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ میں بھی خفا ہے۔

اس کا جواب محققین نے یہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ جو باطن ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں خفا نہیں بلکہ غایت ظہور سے بطون ہو گیا۔

رہا یہ کہ غایت ظہور سے بطون کیسے ہو گیا۔ اس سے تو ظہور ہونا چاہیے تھا تو بات یہ ہے کہ ہمارے ادراک کے لئے غیبت و خفا کی بھی ضرورت ہے اگر کسی چیز میں غیبت بالکل نہ ہو اس کا ادراک نہیں ہو سکتا کیونکہ ادراک

التفات سے ہوتا اور التفات غیبت کی وجہ سے ہوتا ہے جو چیز من کل وجہ حاضر ہو اس کی طرف التفات نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی روح حالانکہ بہت ظاہر ہے اور انسان سے جتنا قرب روح کو ہے کسی چیز کو بھی نہیں پھر بھی روح کا ادراک نہیں ہوتا کیونکہ وہ رگ رگ میں سرایت کی ہوئی ہے اس میں کوئی درجہ غیبت کا نہیں اس لئے اس کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا اور جب التفات نہیں تو ادراک کیسے ہو۔ اسی طرح بلا تشبیہ کیونکہ یہ تشبیہ بھی ناقص ہے حق تعالیٰ میں چونکہ کوئی درجہ غیبت و خفا کا نہیں اس لئے وہ بوجہ غایت ظہور کے باطن ہیں۔ ہم کو دھوپ کا ادراک اس لئے ہے کہ وہ کبھی غائب بھی ہو جاتی ہے۔ اگر غائب نہ ہوتی تو آپ اس کو دیکھتے مگر ادراک نہ ہوتا دھوپ کا ادراک ظلمت ہی کی وجہ سے ہے اور ظلمت خفا ضواء ہی کا نام ہے نیز اگر غیبت نہ ہو تو پھر روشنی سے لذت بھی نہ آتی دن میں جو لذت ہے وہ اسی لئے ہے کہ رات میں دھوپ غائب ہو جاتی ہے۔

از دست بھر یار شکایت نمی کنم گر نیست غمیتے نہ دہد لذت حضور

(میں بھر کی شکایت نہیں کرتا اگر بھر نہ ہوتا تو قرب میں لذت نہ معلوم ہوتی)

غرض چونکہ حق تعالیٰ ہر وقت ظاہر ہیں اسی لئے خفا ہو گیا کیونکہ یہاں ہمارا ادراک ایسا ضعیف ہے جو غائب من وجہ کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے ظاہر من کل وجہ کے ساتھ متعلق نہیں ہو سکتا۔ ہاں آخرت میں یہ ادراک قوی ہو جائے گا تو ظاہر من کل وجہ کے ساتھ بھی متعلق ہوگا وہاں روح کا بھی انکشاف ہوگا اور حق تعالیٰ کا بھی دیدار ہوگا اور معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ تو بے حجاب تھے حجاب ہماری طرف سے تھا ہماری آنکھوں میں اس وقت اس کے دیکھنے کی قوت نہیں جیسے خفاش میں آفتاب کے دیکھنے کی قوت نہیں کسی نے خوب کہا ہے۔

شد ہفت پردہ چشم ایں ہفت پردہ چشم بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

یعنی آنکھ کے ساتھ پردے ہی دیدار سے مانع ہو گئے تو یہ آنکھ خود ہی مانع ہو رہی ہے ادھر سے کوئی مانع نہیں۔ اگر آفتاب چمک رہا ہے اور تم آنکھوں پر ہاتھ دھر لو تو مانع تمہاری طرف سے ہوگا آفتاب کو مخفی نہ کہا جاوے گا۔

اور وہ جو حدیث میں آخرت میں حجاب کا ذکر کرتا ہے۔ لایسقی علی وجہہ الارداء الکبریاء اس کے چہرہ پر سوائے کبریائی چادر کے کچھ باقی نہ رہے گا وہ حجاب ادراک کنہ سے مانع ہے دیدار سے مانع نہیں آخرت میں ہماری آنکھوں کی قوت بڑھ جائے گی تو خدا تعالیٰ کو دیکھیں گے مگر کنہ کا ادراک نہ ہوگا اور رویت کے لئے ادراک کنہ لازم نہیں ہم یہاں بھی بہت چیزوں کو دیکھتے ہیں مگر کنہ کا ادراک نہیں ہوتا۔ بہر حال دنیا میں رویت الہی محال عادی ہے چنانچہ حدیث مسلم میں ہے۔

انکم لن تروراکم حتی تموتوا مرنے سے پہلے تم کو ہرگز تمہارے رب کا دیدار نہ ہوگا۔

اور نص میں موسیٰ علیہ السلام کی درخواست دیدار کے جواب میں ارشاد ہے۔ لن ترانی (ہرگز مجھ کو نہیں

دیکھ سکتے) یہ جواب قابل دید ہے۔ حق تعالیٰ نے لسن ترانسی (ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتے) فرمایا ہے۔ لسن اری ہرگز نہ دیکھا جاؤں گا) نہیں فرمایا۔ بتلادیا کہ میں تو اب بھی اس قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں۔ میری طرف سے کوئی حجاب نہیں، مگر تم میں قوت دیدار نہیں تم مجھے اس وقت نہیں دیکھ سکتے۔ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا، کیونکہ دنیا میں رویت محال عادی ہے۔ ہاں تجلی ہوئی تھی اور حق تعالیٰ نے حجابات اٹھادیئے تھے۔ مگر موسیٰ علیہ السلام دیکھنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو گئے۔

عام طور پر تجلی کے لفظ سے معنی عرفی اور وہ بھی عرف عام کی طرف نظر پہنچتی ہے جس سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ تجلی کے معنی لغت ظہور ہیں جو ایک اعتبار سے صفت ہے اور ایک اعتبار سے فعل ہے اور افعال کا ظہور فاعل کا ظہور ہے۔ اس معنی کو ظہور سے تعبیر کرنا موہم خلاف مقصود نہیں۔

اور یہی معنی فلما تجلی ربہ میں مراد ہیں۔ مگر عرف عام میں تجلی کے معنی نظر آنے کے مشہور ہیں جس سے آیت میں اشکال واقع ہوتا ہے کہ تجلی ربہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی تجلی ہوئی اور اس سے پہلے لسن ترانی میں رویت کی نفی ہو چکی ہے مگر تجلی بمعنی ظہور سے یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کیونکہ لسن ترانی سے تجلی بمعنی رویت کی نفی تھی نہ کہ تجلی بمعنی ظہور کی۔

البتہ ایک اشکال باقی رہے گا وہ یہ کہ لما تجلی ربہ شرط ہے وخر موسیٰ صعق مع اپنے معطوف علیہ کے جزا ہے اور شرط وجزا میں تقدم و تاخر لازم ہے تو معلوم ہوا کہ ظہور کے بعد موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوئے تو ظہور کے وقت بے ہوش نہ تھے اور بے ہوشی ہی مانع رویت تھی تو لازم آتا ہے کہ بے ہوشی کے قبل رویت ہو گئی تو اشکال عود کر آیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شرط وجزا میں تقدم و تاخر تو ضروری ہے مگر وہ عام کہ ذاتی ہو یا زمانی صحت مجازاۃ کے لئے احد ہا کافی ہے زمانی ہی ضروری نہیں اور نہ یہاں اس پر کوئی دلیل قائم ہے پس ہم کہتے ہیں کہ یہاں تقدم و تاخر محض ذاتی ہے اور وقوع دونوں کا ایک زمانہ میں ساتھ ساتھ ہوا تجلی کا بھی اور صعق کا بھی۔ پس اب تقدم و تاخر سے وقوع رویت لازم نہیں آتا۔ البتہ اگر تجلی کے بعد کچھ زمانہ صعق میں فاضل ہوتا تو اشکال ہوتا لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں اس لئے اشکال رفع ہو گیا۔

لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتکم (الحدید آیت ۲۳)

تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتر او نہیں۔

عقیدہ تقدیر کی حکمت

قرآن کریم نے مسئلہ تقدیر کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا

بہاؤنکے یعنی تقدیر خداوندی کے معتقد ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ اگر تمہارا کوئی مقصود فوت ہو جاوے تو تم زیادہ افسوس اور رنج و غم میں گھلو اور اگر کوئی مقصود حاصل ہو جائے تو بہت زیادہ خوشی جو تکبر و غرور تک پہنچائے اس میں مبتلا نہ ہو۔ واقعی بات یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے تمام واقعات و حالات کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ کو جانتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ تقدیر الہی سے ہوتا ہے اور اس کا واقعہ ہونا ناگزیر ہے۔ کسی کی طاقت اس کو روک نہیں سکتی وہ عیش و مصیبت اور راحت و تکلیف کی دونوں حالتوں میں اعتدال پر رہتا ہے۔

حضرت نے فرمایا اس کی واضح مثال یہ ہے کہ دو شخص ہوں ایک قائل تقدیر دوسرا منکر تقدیر اور دونوں کے دو لڑکے ہوں اور دونوں اکلوتے ہوں اور وہ دونوں ایک ہی وقت ایک ہی مرض میں مبتلا ہو جاویں اور علاج معالجہ کے باوجود دونوں مر جاویں۔ پھر دونوں کے متعلق یہ ثابت ہو جاوے کہ علاج میں غلطی ہو گئی تو اب دونوں کا حال دیکھئے منکر تقدیر کو عمر بھر اضطراب اور بے چینی رہے گی کبھی قرار نہ آئے گا۔ اور قائل تقدیر کو اس طرح کا اضطراب نہیں ہوگا کیونکہ وہ سمجھے گا کہ یہ علاج کی غلطی بھی مقدر ہی تھی جس کا واقعہ ہونا ضروری تھا۔

دنیا کو اللہ تعالیٰ نے علم اسباب بنایا ہے جو کچھ ہوتا ہے اسباب کے پردوں سے اس کا ظہور ہوتا ہے حقیقت ناشناس لوگ انہیں پردوں میں رکھ کر رہ جاتے ہیں اور جن کو حقیقت کا علم ہے اور جانتے ہیں کہ اسباب عالم سب پردے ہیں اصل فاعل تو قدرت حق ہے حافظ شیرازی نے خوب فرمایا۔

ایں ہمہ مستی و بیہوشی نہ حد بادہ بود با حریفان آنچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

نرگس مستانہ کنایہ ہے عنایت حق سے۔ (مجالس حکیم الامت ص ۳۱۰-۳۱۱)

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ

لِيُقِيمُوا النَّاسَ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ

ترجمہ: ہم نے (اسی اصلاح آخرت کے لئے) اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کرنے کے حکم کو نازل کیا تاکہ لوگ (حقوق اللہ اور حقوق العباد میں) اعتدال پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے۔

تفسیری نکات

نعلدار جوتا

اس کی تفسیر میں ہمارے مولانا فرمایا کرتے تھے حدید سے مراد ہے نعلدار جوتا (یعنی فیہ باس شدید کی صفت کے اعتبار سے سلاح مراد ہے جس کی تعبیر اہل محاورہ اس عنوان سے کیا کرتے ہیں کیونکہ جو نہیم کم ہوتے ہیں ان کے لئے جوتا کی بھی ضرورت ہے) (اسرار العبادۃ)

سنا کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک

تو صاحبو یہ ایسی دلیل ہے کہ ٹوٹی ہی نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ بلا دلیل اللہ واحد ہے۔ سنا کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک یہ سو کی ایک دلیل ہے مولانا یعقوب صاحب اسی باب میں فرماتے ہیں

الوعظ ينفع لو بالعلم والحكم والسيف يبلغ وعاظ على اقم

اور یہ بھی فرماتے تھے دیکھو لوگ تو کہتے ہیں چار کتابیں نازل ہوئی ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ ایک پانچویں کتاب بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے لقد ارسلنا رسلنا بالبينات و انزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط و انزلنا الحديد فيه باس شديد و منافع للناس (حدید ۲۵)

کتب اربعہ کے بارے میں بھی انزلنا آیا ہے کہ سب کتابیں آسمان سے نازل ہوئی ہیں اور حدید کے واسطے بھی انزلنا آیا ہے یہ پانچویں کتاب ہے اور بعض وقت ظرافت فرماتے تھے کہ حدید سے مراد ہے نعلدار جوتا اور مولانا نے اس کا نام رکھا تھا روشن دماغ کہ سر پر دو چار لگا دیئے۔ دماغ درست ہو جاتا ہے اور اس سے بھی ایک نور پیدا ہوتا ہے۔

سُورَةُ الْمَجَادِلَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ

فَاتَفَسَّحُوا يُفَسِّحِ اللَّهُ لَكُمْ وَإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَانشُرُوا يَرْفَعِ

اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو جب تم کو کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو تم جگہ کھول دیا کرو اللہ تم کو جنت میں کھلی جگہ دے گا اور جب کبھی ضرورت سے یہ کہا جائے کہ مجلس سے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو جایا کرو (اس حکم کی اطاعت سے) ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) جن لوگوں کو علم دین عطا ہوا ہے (اخروی) درجے بلند کرے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے۔

تفسیری نکات

شان نزول

اس آیت کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حاضر تھے کہ اصحاب بدر آئے اصحاب بدر وہ لوگ کہلاتے ہیں کہ جو جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں۔ ان کی فضیلت بہت ہے اس وقت مجلس میں کچھ تنگی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین مجلس کو حکم فرمایا کہ مل کر بیٹھو اور ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض کو فرمایا کہ تم اٹھ جاؤ اپنے کسی دوسرے کام میں

لگو بائیں۔ کہ دوسری جگہ بیٹھ جاؤ۔ ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے بلکہ آیت کا مجموعہ ان دونوں کے مجموعے پر دال ہے کہ بعض کوٹل کر بیٹھنے کا حکم دیا ہو اور بعض کو اٹھ جانے کا حکم دیا ہو۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لبوں کر تکتے تھے وہ تو اس پر نہایت خوشی سے عامل ہو گئے۔ لیکن منافقین نے کہ وہ ایسے مواقع کے لئے ادھار کھائے بیٹھے رہتے تھے اس پر اعتراض کیا اور یہ گویا ان کو عیب جوئی کا ایک موقع مل گیا۔ حالانکہ اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تب بھی اس انتظام میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمال خوبی معلوم ہوتی ہے کہ تمام طالبان کی کس قدر رعایت کی کہ جگہ نہ ہونے کی مجبوری سے کوئی شخص محروم نہ رہ جائے لیکن چشم بد میں ہنر بھی عیب ہی ہو کر نظر آتا ہے۔

چشم بد اندیش کہ برکنده باد عیب نماید ہنرش در نظر

(بد اندیش آدمی جب کسی کام کو دیکھتا ہے تو اس کی نظر میں اس کا ہنر عیب معلوم ہوتا ہے)

منافقین کو اعتراض کا بہانہ مل گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ نئے آنے والوں کی خاطر پہلے بیٹھے ہوؤں کو اٹھایا جائے خدا تعالیٰ نے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض لغو اس لئے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ دونوں حکم مناسب اور مستحسن تھے اور مستحسن کو غیر مستحسن کہنا حماقت ہے اور مستحسن ہونا اس طرح ظاہر فرمایا کہ ان حکموں کا خود بھی امر فرمایا اور خدا تعالیٰ اگر کوئی حکم فرمائیں تو وہ قبیح ہو نہیں سکتا۔ عقلاً بھی اور نقلاً بھی جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے ان اللہ لا یامر بالفحشاء اور اس کا حکم خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مستحسن ہے کیونکہ ایسی ذات کا حکم ہے جس کی برابر کوئی حکیم نہیں پھر ہر حکم پر ایک ایک ثمرہ مطلوبہ کو بھی مرتب فرمایا کہ وہ استحسان کی مزید دلیل ہے چنانچہ حکم اور ثمرہ دونوں کے لئے ارشاد ہے اذ اقل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا۔ ایک حکم کا تو یہ صیغہ امر اس میں ارشاد ہے اس کے بعد فرماتے ہیں یفسح اللہ لکم اس کا ثمرہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو خدا تعالیٰ جنت میں تمہارے لئے فراخی فرمائیں گے یہاں تک تو پہلا حکم اور اس کا ثمرہ تھا آگے بذریعہ عطف دوسرا حکم فرماتے ہیں واذا قیل انشزوا فانشزوا یعنی جب اٹھ جانے کا حکم ہوا کرے تو اٹھ جایا کرو۔ نقلی استحسان تو اس ارشاد ہی سے ثابت ہو گیا باقی عقلی استحسان کی تقریر یہ ہے کہ صدر مجلس جب اہل ہو اور یہ حکم کرے تو وہ کسی مصلحت کی بنا پر ہوگا۔ پس اس کا قبول کرنا ضرور ہوگا اور مطلق صدر مجلس بلا تخصیص اس لئے کہا گیا کہ قرآن میں لفظ قیل ہے جو کہ ہر صدر مجلس کے کہنے پر صادق آتا ہے پس یہ شبہ جاتا رہا کہ یہ خاص ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اگرچہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے ارشاد فرمایا تھا لیکن جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ضرورت پیش آئی اسی طرح جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں اور

نیابت کی اہلیت ان میں ہے ان کو بھی صدر مجلس ہونے کی صورت میں ایسی ضرورت پیش آ سکتی ہے اور اس کے قبول پر بھی عمل کرنا ایسا ہی واجب ہوگا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر۔ تو اگر وہ اٹھنے کا حکم دیں تو فوراً اٹھ جانا چاہیے۔ اور اس کے امتثال میں تنگ و عامر نہ کرنا چاہیے کیونکہ مصلحت وقت سے ایسا کیا جاتا ہے اور توضیح مقام کی یہ ہے کہ ان حکموں کا حاصل تنادب فی الانتفاع ہے اور تنادب شرعاً بھی محمود ہے یعنی اگر کوئی مطلوب مشترک ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لئے سب طالبین کی گنجائش ایک مجلس میں نہ ہو تو شریعت نے اس کے لئے تنادب تجویز فرمایا ہے اور عقل بھی اس کے ساتھ اس میں متفق ہے کہ سب طالبین کے کمال حاصل کرنے کی یہی صورت ہے کہ آپس میں تنادب ہو زیادہ وضاحت کے لئے اس کو ایک مثال میں سمجھئے مثلاً ایک کنواں ہے کہ شہر کے ہر شخص کو اس کے پانی کی ضرورت ہے اور ایک ساتھ سب کے سب اس سے پانی نہیں بھر سکتے تو سب کے پانی حاصل کرنے کی صورت یہی ہے کہ یکے بعد دیگرے سب کے سب پانی حاصل کریں اور چار آدمیوں کو یہ حق نہیں کہ وہ کنویں پر جم کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو جگہ نہ دیں یہ مثال ایسی ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو بھی کلام نہیں تو جس طرح دنیاوی نفع میں تنادب مسلم ہے اسی طرح دینی نفع میں بھی سب کے انتفاع کی یہی صورت ہے کہ علی سبیل التناوب سب نفع حاصل کریں۔ اسی مثال کے قریب ایک دوسری مثال پیش کرتا ہوں کہ وہ وضاحت میں تو اس سے کم ہے مگر اس موقع کے زیادہ مناسب ہے وہ یہ کہ اگر ایک مدرسے میں ایک عالم ایسے ہوں کہ ہر طالب علم کو ان کی ضرورت ہو اور ہر شخص ان سے نفع حاصل کرنا چاہے کوئی بخاری شریف پڑھنا چاہے اور کوئی نسائی اور کوئی منطق و فلسفہ تو اگر بخاری شریف والے ان کو گھیر کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو وقت ہی نہ دیں تو دوسروں کے نفع حاصل کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے اور اس لئے بخاری والوں کو یہ حق نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ دوسری جماعتوں کے لئے بھی وقت چھوڑ دیں۔ ان مثالوں سے معلوم ہوا ہوگا کہ نفع دنیاوی اور دینی دونوں میں اگر طالبین کا اجتماع نہ ہو سکے تو تنادب ہونا ضروری ہے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نہایت ہی قرین مصلحت تھا اور چونکہ تفسیح اور انشز و اعام ہے بعض اور کل دونوں کو۔ اس لئے اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کو اٹھنے کو فرمائیں سب کو اٹھ جانا واجب ہوگا اور اس میں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ مہذبے اس کا تو انتفاع اجماع تھا سب کے اٹھادینے میں تو حرمان اجماع ہے جواب یہ ہے کہ اس میں بھی انتفاع اجماع اس طرح ہو سکتا ہے کہ شاید آپ خلوت میں کچھ نفع عام کے لئے سوچیں یا آرام فرمائیں تاکہ پھر سب کی مصلحت کے لئے تازہ ہو جائیں پس اس میں بھی جمع کا انتفاع ہوا اسی طرح اگر کسی دوسرے صدر مجلس کو بھی اس کی ضرورت پیش آئے کہ وہ کسی مصلحت سے بعض مجلس یا ساری مجلس کو اٹھنے کا حکم دے تو اس کو اجازت ہے کہ کہہ دے کہ اب تم لوگ اٹھو اور اس کا یہ کہہ دینا بدلیل اس کے اہل

ہونے کے قریب مصلحت سمجھا جائے اور اس پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ تو منافقین کی یہ شکایت محض حسد کی بناء پر تھی اور اس کے قبول کرنے سے اباہ کرنا محض عار و استنکاف تھا ورنہ واقع میں بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں وہ ایسے امور میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اس وقت مجھے اپنی ایک حکایت یاد آئی اپنی اوائل عمر میں جبکہ میں بالغ ہو چکا تھا ایک مرتبہ اپنی مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے کھڑا ہوا صف میں داہنی طرف آدمی زیادہ ہو گئے تھے اور بائیں طرف کم تھے۔ میں نے داہنی طرف کے ایک شخص کو کہا کہ آپ بائیں طرف آ جائیں یہ سن کر ان کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرہ تہمتا گیا زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں ہوئے حالانکہ یہ کوئی غصہ کی بات نہ تھی ترتیب صفوف تو شریعت میں بھی ضروری قرار دی گئی ہے ان کی یہ حرکت مجھے بھی ناگوار ہوئی آخر میں نے ان کے قریب کے آدمی سے کہا کہ بھائی تم ادھر آ جاؤ کیونکہ ان کی تو شان گھٹ جائے گی اس پر تو وہ ایسے خفا ہوئے کہ صف میں سے نکل کر مسجد ہی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ تو بعض طبیعتیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ اس کو عار سمجھتے ہیں کہ کسی دوسرے کا کہنا مانا کریں اور اس کا اندازہ ایسے لوگوں کے حالات دیکھنے اور ان سے ملنے سے ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے ذریعے سے یہ قانون دائمی مقرر کیا گیا ورنہ بظاہر اس کا قانون بنانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ تو ایسی ظاہر بات ہے کہ معاشرت روزمرہ میں داخل اور فطرت سلیمہ کا مقتضا ہے مگر اسی قسم کی طبائع کی بدولت یہ قانون مقرر فرمایا کہ واجب سمجھ کر ماننا پڑے اور اس کا امر بھی فرمایا اور امر کے ساتھ ترغیب بھی دی تاکہ کوئی ہیبت سے مانے اور کوئی ترغیب سے کیونکہ دوہی قسم کی طبیعتیں ہوتی ہیں بعض پر رغبت کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور بعض پر ہیبت کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن میں زیادہ لطف اسی شخص کو آتا ہے جس کی نظر واقعات پر ہو اور وہ واقعات میں غور کرے۔ مثلاً اگر ان بڑے میاں کا واقعہ پیش نظر نہ ہوتا تو اس حکم کی مشروعیت کی حکمت سمجھنے کا لطف نہ آتا اور اب معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر پاکیزہ انتظام فرمایا ہے کہ ذرا سی بات کو بھی نہیں چھوڑا غرض اس قسم کے واقعات ہوئے بھی ہیں اور قیامت تک ہونے والے بھی ہیں۔ اس لئے یہ قانون دائمی مقرر فرمایا اور اس پر اس ثمرے کو مرتب فرمایا کہ ہم تمہارے لئے جنت میں جگہ کو فراغ فرمائیں گے اور دوسرا حکم یہ فرمایا کہ اگر اٹھ جانے کا حکم ہوا کرے تو اٹھ جایا کرو۔ خدا تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور اہل علم کے درجات بلند فرمائیں گے۔ یہ حاصل ہے ارشاد کا۔ اس تقریر سے آپ کو سبب نزول آیت بھی معلوم ہو گیا اور حاصل آیت بھی جس میں حکم اور ثمرہ دونوں مذکور ہیں۔ اب میں وہ بات بیان کرتا ہوں جس کا بیان کرنا اس وقت مقصود ہے میں نے کہا تھا کہ اس ثمرے کا ایک مینہ ہے اس میں غور کرنے سے وہ قاعدہ عامہ نکلے گا۔ جس کا استحضار ہر وقت ضروری ہے سو یہاں ایک امر تو یہ ہے کہ تفسحوا اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ یفسح الله لكم یعنی جنت میں فراخی ہوگی اور دوسرا حکم یہ ہے کہ

فانشزوا اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ یرفع اللہ الذین امنوا منکم تو ان دونوں میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ صدر مجلس کے کہنے سے فراخی کر دینے میں جنت میں فراخی کیوں ہوگی اور اٹھ جانے میں رفع درجات کیوں ہوں گے۔ جس کو ذرا بھی عقل ہوگی وہ تو اس میں بالکل بھی تامل نہ کرے گا بلکہ یہی کہے گا کہ معنی یہ ہے کہ اس نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اور اولی الامر کا حکم بھی خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ ہی نے ہم کو اولی الامر کا کہنا ماننے کو فرمایا ہے پس اگر ہم نے صدر مجلس کا حکم مان لیا تو خدا تعالیٰ کا حکم مان لیا غرض پھر پھر کر معنی یہی نکلے گا کہ چونکہ اس امر کا امتثال کرنے والا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننے والا ہے اس لئے اس کو یہ ثمرہ حاصل ہوا۔ سو اصل مقصود اس وقت اسی امر کا بیان کرنا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر یہ دو ثمرے مرتب ہوتے ہیں۔

اصلاح معاشرہ کا ایک ثمرہ

ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ اصلاح معاشرت پر بھی آخرت کے ثمرے ملتے ہیں۔ جس سے اشارہ اس طرف ہے کہ احکام شرعیہ میں جس امر کو تم بالکل دنیا سمجھتے ہو اس میں بھی تم کو اجر ملے گا وجہ دلالت ظاہر ہے کہ فسحت اور قیام پر جو کہ معاشرت میں سے ہیں آخرت کا وعدہ فرمایا۔

ہر مطیع مسلمان مقبول ہے۔

ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ عام اہل ایمان بھی اگر چہ وہ جاہل ہو مقبول ہیں کیونکہ اہل علم سے قبل اہل ایمان کو بھی مقام فضل میں فرمایا ہے لہذا عام مومنین کو بھی حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا چاہیے پس ہر صاحب ایمان اگر وہ مطیع ہو مقبول ہے اور مطیع کی قید اس لئے لگائی کہ فسخ اور رفع درجات کو جس سے کہ اہل ایمان کے فضل پر استدلال کیا گیا ہے اطاعت ہی پر مرتب کیا ہے کیونکہ تقدیر کلام یہ ہے تفسحوا فی المجالس ان تفسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا فانشزوا ان تنشزوا یرفع اللہ لکم (محلوں میں فراخی کرو اگر کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے فراخی کریں گے اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ اگر اٹھو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے مرتبے بلند فرمادیں گے۔) مطلب یہ ہے کہ جب ان دو امر میں امتثال ہوگا تو یہ مرتبہ ملے گا اور اس مدلول کے بیان کرنے سے جیسے اہل علم کی اصلاح کرنا مقصود ہے کہ عوام مومنین کو حقیر نہ سمجھیں اسی طرح غیر اہل علم میں سے متکبرین کی بھی اصلاح کرنا مقصود ہے کہ ان کو بھی جلا ہے تیلیوں کو ذلیل سمجھنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ یہاں مدار فضل مطلق ایمان و اطاعت ہے۔ خواہ کوئی قوم ہو۔ ایک مدلول اس آیت

کا اور ہے جو کہ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے یعنی فاشنر وا کے بعد جو ثمرہ مرتب کیا ہے تو ایک خاص عنوان سے کیا ہے یعنی اس طرح فرمایا یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اتوا العلم اور یوں نہیں فرمایا یرفعکم والذین اتوا العلم پس اس وضع مظہر موضع ضمیر میں اشارہ اس طرف ہو گیا کہ زیادہ دخل اس ترتیب رفعت میں ایمان کو ہے پس اس سے یہ بات نکل آئی کہ اگر کوئی مومن پورا مطیع نہ ہو مگر مومن ہو تو وہ بھی عند اللہ ایک گونہ رفعت سے خالی نہیں تو جو لوگ عاصی مومن ہیں ان کو بھی ذلیل نہ سمجھو البتہ اگر خدا کے لئے ان پر ان کے سوء اعمال کے سبب غصہ کرو تو جائز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمدردی اور رحم ہونا بھی ضروری ہے۔ نفسانی غیظ اور کبر نہ ہو اور ان میں فرق کے لئے میں ایک موٹی سی مثال بیان کرتا ہوں جس کو میرے ایک دوست نے بہت پسند کیا اور ان ہی کی پسند سے مجھے بھی اس کی بہت قدر ہوئی یعنی معمولی قصوں میں غصہ دو موقعوں پر آتا ہے ایک تو اجنبی پر اور ایک اپنے بیٹے پر۔ سوا جنبی سے تو اس کی شرارت پر نفرت اور عداوت ہو جاتی ہے اور اگر اپنا بیٹا وہی حرکت کرے تو اس سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ شفقت کے ساتھ تاسف ہوتا ہے اس کے لئے دعاء کرتا ہے دوسروں سے دعا کرتا ہے اس کی حالت پر دل کڑھتا ہے اور غصہ جو ہوتا ہے تو اس کے ساتھ یہ شفقت ملی ہوتی ہے۔ پس اخوة اسلامیہ کا مقتضایہ ہے کہ اجنبی عاصی کے ساتھ بھی بیٹے کا سا برتاؤ رکھنا چاہیے یعنی اگر کبھی اس پر غصہ آئے اور خیال ہو کہ یہ غصہ خدا کے لئے ہے اس میں نفس کی آمیزش نہیں تو اس وقت دیکھنا چاہیے کہ اگر میرا بیٹا اس حالت میں مبتلا ہوتا تو اس پر مجھے اس قسم کا غصہ آتا یا نہیں اگر قلب سے نفی میں جواب آئے تو سمجھے کہ یہ غصہ خدا کے لئے نہیں ہے بلکہ تفرغ کا غصہ ہے اور یہ اس شخص کی معصیت سے بھی بڑھ کر معصیت ہے اور خوف کا مقام ہے خدا تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر ایک گنہگار اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے تو وہ مغفور ہو جاتا ہے۔ اور اگر ایک مطیع اپنے کو بڑا سمجھتا ہے تو وہ مقہور ہو جاتا ہے (خوب کہا ہے)

عافل مرد کہ مرکب مردان زہدرا در سنگلاخ باد یہ پیا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ناگہ بیک خردش بمنزل رسید اند

سو نہ تو خدا پر ناز کرنا چاہئے اور نہ ناامید ہونا چاہیے غرض تحقیر تو کسی مسلمان کی کرے نہیں لیکن غیظ و غضب جس کا منشاء بغض فی اللہ اور رحم و ہمدردی ہو اس کا مضائقہ نہیں۔ باقی کبر و عجب تو خدا تعالیٰ کو بہت نا پسند ہے۔ ہمارے ہاں ایک لڑکی تھی نماز روزے کی پابند (اب اس کا انتقال ہو گیا ہے) اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہو گئی جو کہ اس قدر پابند نہ تھا ایک روز کہتی ہے کہ اللہ کی شان میں ایسی پرہیزگار پارسا اور میرا نکاح ایسے شخص سے ہو۔ صاحبو! کتنی حماقت کی بات ہے کیونکہ اگر کوئی بزرگ بھی ہے تو ناز کس پر کرتا ہے۔ بزرگی پر ناز کرنے کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ کوئی مریض طبیب کا نسخہ پی کر ناز کرنے لگے کہ ہم ایسے بزرگ

ہیں کہ ہم نے دوا پی لی۔ کوئی اس سے پوچھے کہ اگر دوا پی کرناز کرنے لگے کہ ہم ایسے بزرگ ہیں کہ ہم نے دوا پی لی۔ کوئی اس سے پوچھے کہ اگر دوا پی لی تو کس پر احسان کیا اور کیا کمال کیا نہ کرتا جہنم میں پڑتا البتہ بجائے ناز کے خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے اپنی اطاعت کی توفیق عطا فرمائی۔ حاصل یہ کہ الذین امنوا سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ گنہگار بھی رفعت عند اللہ سے خالی نہیں۔ ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ الذین امنوا منکم والذین اتوا العلم میں تخصیص بعد تعمیم سے معلوم ہوا کہ قبول اعمال کا تفاوت خلوص سے ہوتا ہے کیونکہ اہل علم کے درجات میں امتیاز اس خلوص ہی کے سبب سے تو ہوا جیسا اوپر مذکور ہوا ہے اور اس مسئلے کو بیان کرنا اس لئے ضروری ہے کہ آج کل لوگ اعمال کے تو شائق ہیں لیکن خلوص کی پروا اکثر نہیں ہوتی۔ حالانکہ خلوص وہ چیز ہے کہ اسی کی بدولت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مرتبہ اس قدر بلند ہوا کہ ان کا نصف مد جو خرچ کرنا اور ہمارا احد پہاڑ برابر خرچ کرنا برابر نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ یہ صحبت نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے ہے تو میں یہ کہوں گا کہ ان کا خلوص بھی صحبت کی برکت سے ہے تو یہ دونوں متلازم ہیں اب خواہ صحبت کو سبب کہہ دیجئے خواہ خلوص کو بالکل وہ حالت ہے کہ

عبارة اتناشتی و حسنک واحد فکل الی ذاک الجمال بشیر

(ہماری تعبیرات مختلف ہیں اور تیرا حسن ایک ہے ساری تعبیریں اسی (ایک) جمال کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔) سب ایک ہی جمال کی تعبیریں ہیں میں نے اپنے پیرومرشد سے سنا ہے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی ایک لاکھ رکعت سے افضل ہے وجہ یہی ہے کہ اس کی ایک رکعت میں بوجہ معرفت کے خلوص زیادہ ہو گا۔ اور اسی مدلول پر ایک اور بات بھی متفرع ہوتی ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں واللہ بما تعملون خبیرہ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال پر خبردار ہیں۔ اس کو ہر جملے سے تعلق ہے کہ تم ہر حکم کی پابندی کرو اور اس میں کوتاہی نہ ہونے دو کیونکہ خدا تعالیٰ کو تمہارے باطن کی بھی خبر ہے تو خدا تعالیٰ کو اس کی اور فرو گذاشت تک کی بھی اطلاع ہو جائے گی جو تمہاری نیتوں میں بھی ہوگی۔ گویا اس جملہ سے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک مضمون کا مراقبہ سکھلایا ہے کہ اگر اس کو متحضر رکھیں تو عمل میں کبھی کوتاہی نہ ہو۔ یعنی ہر وقت یہ خیال رکھیں کہ اللہ تعالیٰ میرے ظاہر و باطن کو دیکھ رہے ہیں اس کی مداومت کے بعد چندے ایک حال پیدا ہوگا اور ذوقاً یہ سمجھے گا کہ گویا میں خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں اور قرآن و حدیث میں اس قسم کے جتنے مضامین ہیں یہ سب مراقبات ہیں ان میں بتلا دیا ہے کہ اطاعت کی اصل اور راسخ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ یہ مراقبات متحضر ہو جائیں کیونکہ جب یہ خیال پختہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے اس کام کی حاکم کو بھی اطلاع ہے تو پھر اس میں کوتاہی نہیں ہوا کرتی۔

آنے والوں کی دل جوئی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے توہر فعل میں اعتدال و انتظام تھا۔ نشست و برخاست میں، خورد و نوش میں، گفتار میں، رفتار میں اسی کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان حلقہ القرآن کہ قرآن میں جو امور مذکور ہیں وہ آپ کے لئے مثل امور طبعیہ عادیہ کے ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب کوئی آپ کے پاس آتا آپ اپنی جگہ سے کھسک جاتے اللہ اکبر ایسی باریک باتیں آپ سے طبعی امور کی طرح سرزد ہوتی تھیں۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ آنے والے کی دلجوئی اس کی قدر دانی اس کے آنے سے مسرت کا اظہار اور قرآن میں ہے۔ **يا ايها الذين امنوا اذا قيل لكم تفسحوا في المجالس فافسحوا** (اے ایمان والو جب تم سے کہا جاوے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو تم جگہ کھول دیا کرو ۱۲) قرآن میں تو یہ ہے کہ تمہیں جب جگہ چھوڑنے کا حکم ہو اس وقت کھسک جاؤ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجودیکہ جزئی حکم نہیں ہوا تھا۔ مگر آپ کھسک جاتے تھے کہ آپ کی نظر اس حکم کی علت پر تھی پس ایسی غامض (باریک) بات اور وہ آپ کی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) طبیعت کا مقتضا ہو گئی تھی پس آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھسک جاتے تھے۔ (روح القیام)

احکام مجلس عام

یہ سورہ مجادلہ کی آیت ہے حق سبحانہ و تعالیٰ نے آیت میں بعض آداب مجالس کے بیان فرمائے ہیں ہر چند آیت کا شان نزول خاص ہے مجلس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں اس لئے خصوص مورد کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ عموم الفاظ کے اعتبار سے حکم عام ہوگا پس خاص حضور ہی کی مجلس کے ساتھ یہ حکم مخصوص نہیں بلکہ یہ حکم تمام مجالس کو عام ہے اور حق تعالیٰ شانہ نے اس جگہ اس حکم کے جو کہ دو حکموں پر مشتمل ہے امثال پر اس کے ثمرہ کا بھی وعدہ فرمایا ہے چنانچہ پہلے حکم اور اس کے ثمرہ کے لئے ارشاد ہے۔

اذا قيل لكم تفسحوا في المجالس فافسحوا يفسح الله لكم (یہ تو پہلا حکم اور اس کا ثمرہ ہے) آگے بذریعہ عطف دوسرا حکم اور اس کا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں **واذا قيل انشزوا فانشزوا** یہ تو حکم ہے اور اس کا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں۔

يرفع الله الذين امنوا منكم والذين اوتوا العلم درجات اور اس ثمرہ اور اس کے وعدوں میں اول تعیم فرمائی اس کے بعد تخصیص کے طور پر بعض لوگوں کے واسطے یعنی اہل علم کے لئے ثمرہ جداگانہ بیان فرمایا اور تخصیص بعد تعیم بقواعد علم بلاغت اہتمام کو مقتضی ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اہل علم کو چاہیے کہ اس کو بہتم

بالشان سمجھ کر اس کا خاص طور پر اہتمام کریں۔

اس اجمال کی تفصیل اس کے ترجمہ سے واضح ہو جائے گی۔ اور ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے مسلمانو! جب تم سے کہا جاوے کہ مجلس میں فراموشی کرو تو فراموشی کر دیا کرو جب تم سے کہا جاوے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ جایا کرو یعنی اگر اس جگہ سے اٹھنے کا امر ہو تو اس جگہ سے اٹھ جایا کرو پھر خواہ تم کو دوسری جگہ بیٹھنے کا حکم ہو جاوے خواہ چل دینے کا امر ہو اسی پر عمل کیا کرو (استکبار و انکار نہ کیا کرو) اور ظاہر ہے کہ یہ امر عقائد میں سے نہیں اعمال رکنیہ میں سے نہیں مالی حقوق میں سے نہیں اس لئے اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا۔ چنانچہ اول تو سبھا اللدین امنوا سے خطاب ہے۔ باوجودیکہ قرآن سے تو مومنین ہی مخاطب ہیں اور اکثر قرآن میں مسلمانوں ہی سے خطاب ہوتا ہے پھر اس صریح خطاب سے کیا فائدہ ہے تو خوب سمجھ لو کہ اس سے مقصود رغبت دلانا ہے کہ یہ امر ہر چند شعائر دین سے نہیں اس لئے عام طور پر سے ممکن ہے کہ لوگوں کو اس کا اہتمام نہ ہو مگر ہمارے مخاطب وہ ہیں جو ہم پر اعتقاد رکھتے ہیں وہ ضرور اس کو قبول کریں گے اس طرز کلام سے اس مضمون کی سامعین کو رغبت دلائی اور دوسرا اہتمام ”اذا قیل“ بصیغہ مجہول سے ظاہر فرمایا باوجودیکہ واقعہ خاصہ میں اس قول کے قائل خاص حضور اقدس ہیں پھر بھی عنوان عدم تعیین قائل سے تعبیر فرمایا (یعنی قیل مجہول کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا بجائے صیغہ معلوم ”قال لکم“ کے) اور یہ عدول اس وجہ سے فرمایا کہ اس مسئلہ میں حضور کے ارشاد کی تخصیص نہیں اس لئے حکم عام ہے ہر صدر مجلس کے قول کو۔ تیسرا اہتمام یہ کہ امر کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے یعنی ”فاسسحوا“ اور ”فانشزوا“ اور ظاہر ہے کہ امر حقیقہ و وجوب کے لئے ہوتا ہے جب تک کہ کوئی قرینہ صارفیہ عن الحقیقہ نہ ہو گو واجبات کے درجات مختلف ہوتے ہیں کہیں وجوب بعینہ ہوتا ہے کہیں وجوب لغیرہ مگر نفس وجوب میں شرکت ضرور ہوتی ہے چوتھا اہتمام یہ ہے کہ ”تفسحوا“ کا امر اور اس کا ثمرہ جدا بیان فرمایا۔ اور ”انشزوا“ اور اس کا ثمرہ جدا بیان فرمایا ورنہ اگر اختصار کے ساتھ مجلس میں حکم صدر کی اتباع کا مشترک امر فرمادیتے تو اس درجہ اہتمام نہ ہوتا جیسا کہ جدا جدا بیان کرنے میں ہوا پانچواں اہتمام یہ ہے کہ لفظ فی المجالس بصیغہ جمع فرمایا باوجودیکہ فی المجلس بھی کافی تھا وہ بھی جنس کی وجہ سے عام ہوتا مگر چونکہ اس میں یہ احتمال باقی تھا کہ اس عام کو خاص پر حمل کر لیا جاتا اور مجلس سے خاص مجلس مراد لے لی جاتی (یعنی حضور کی مجلس) اس لئے فی المجالس فرمایا کہ اس کا احتمال بھی قطع فرمادیا کہ اب احتمال تخصیص کا ہو ہی نہیں سکتا لہذا حکم عام ہوگا تخصیص کا احتمال ہی نہیں چھٹا اہتمام یہ ہے کہ جس ثمرہ کو مرتب فرمایا اس کا بڑا ہونا ظاہر فرمادیا کیونکہ مقتضا علم بلاغت کا یہ ہے کہ عادتہ چھوٹے ثمرہ کو ذکر نہیں کیا کرتے اور یہاں ثمرہ کا ذکر موجود ہے اور قرآن کا فصیح و بلیغ ہونا مسلم ہے پس قرآن میں کسی ثمرہ کا ذکر کرنا اس کو مقتضی ہے کہ یہ ثمرہ بہت بڑا ہے اور جب ثمرہ بڑا ہوتا ہے تو عمل کا بڑا ہونا بھی ضروری ہے جس پر اس قدر بڑا ثمرہ مرتب ہوا ہے تو اس سے عمل مذکور کی یعنی توسع اور قیام کی اہمیت و عظمت بھی معلوم ہوئی ساتواں اہتمام خاص

اہل علم کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے یہ کیا گیا کہ ثمرہ یرفع اللہ الذی امنوا منکم والذین اتوا العلم درجت میں ایمان والوں کو اولاً و عموماً اور اہل علم کو ثانیاً و خصوصاً بیان فرمایا تاکہ اہل علم کی بالخصوص فضیلت معلوم ہو جاوے پھر اس سب کے خلاف پر وعید ہے۔ واللہ بما تعملون خبیر اس سے اور زیادہ اہتمام بڑھ گیا یعنی اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو حق تعالیٰ اس سے خبردار ہیں اس لئے تمہیں مخالفت سنبھل کر کرنی چاہیے پس واللہ بما تعملون خبیر ظاہر او وعید ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ وعدہ ہو کہ اس عمل کے کرنے پر ثمرہ کا ترتب ضرور ہوگا کیونکہ تمہارے اعمال کی حق تعالیٰ کو خبر ہے اس لئے اس عمل کے کرنے پر ثمرہ کا ترتب فرمادیں یا اعمال مذکورہ کے معتد بہ ہونے کی شرائط کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی تفسیح فی المجالس یا نشوز مطلقاً معتبر و معتد بہ نہیں بلکہ اس میں خلوص بھی شرط ہے یعنی صرف صورت عمل پر ثمرہ مذکورہ مرتب نہ ہوگا بلکہ اخلاص بھی ضروری ہوگا اور اخلاص امر باطنی ہے اس لئے اپنے خبیر بمعنی عالم باطن الامور ہونے پر تنبیہ فرمادی غرض ان سب اہتماموں سے معلوم ہوا کہ یہ عمل نہایت مہتمم بالشان ہے۔

تکبر کا علاج

اذا قيل لكم تفسحوا فی المجالس میں ایک بڑی ضروری تعلیم ہے لیکن بعد تامل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاص اہتمام سے تکبر کا علاج کیا گیا ہے جو منشاء ہے آداب مجالس پر عمل نہ کرنے کا اور بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کرنے کا پھر جب اصل اور جز خرابی کی جاتی رہے گی یعنی تکبر کا علاج ہو جائے گا اور اس کے علاج سے گناہ متروک ہو جائیں گے تو اب اعمال کرنے سے ارتقاء موانع کے سبب ان کا اصلی ثمرہ ضرور مرتب ہوگا۔ یہ حقیقت ہے اس تعلیم کی کہ اس کو معمولی نہ سمجھو اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ صدر مجلس کے کہنے پر عمل کرنے کو ازالہ تکبر میں کیا دخل ہے۔ ہم نے تو ایک بار ایسا کیا مگر کچھ بھی اثر نہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ گواہی بار عمل کرنا بھی بے کار نہیں مگر ایک بار میں معتد بہ اثر کا ظہور نہیں ہوتا، لیکن اگر بار بار اس پر عمل کریں گے تو خود ہی اثر معلوم ہو جائے گا۔ دیکھو ایک جگہ پانی کا قطرہ ٹپکتا ہے تو اس وقت تو اس سے کچھ اثر محسوس نہیں ہوتا لیکن اگر اسی طرح ٹپکتا رہے تو دس برس میں اس پانی کے قطرہ ہی سے غار ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ اس اثر میں جس طرح مجموعہ من الحیث المجموع کو دخل ہے اسی طرح ہر قطرہ کا بھی دخل ہے اسی طرح ہر عمل شرعی پر ایک مرتبہ بھی عمل کرنا ضرور تصفیہ باطن میں اثر رکھتا ہے گو کمال اثر کی علت تامہ نہ سہی اس کے لئے ضرورت ہے تکرار دوام کی۔

یہ تمہید میں مذکور ہے کہ آیت میں دو عمل اور دو ثمرے بیان کئے گئے ہیں۔ عمل اول تفسیح فی المجالس اور اس کا ثمرہ یفسح اللہ لکم اور یہ عمل مع ثمرہ کے بیان ہو چکا ہے اور عمل ثانی انشزوا۔ جس پر ثمرہ رفع درجات کو مرتب فرمایا اور انشزوا کا امتثال چونکہ واقع میں تفسیح فی المجالس سے ارفع ہے کیونکہ اس میں انقیاد کا زیادہ

انظہار ہے جو نفس کو زیادہ شاق ہے اس لئے اس پر ثمرہ بھی ارفع یعنی رفع درجات کا مرتب فرمایا۔ غالباً یہ امر بیان سے رہ گیا کہ فافسحو اور فانشزوا عام ہے خواہ جو ارح سے ہو یا قلب سے یعنی جس وقت مجلس میں تقسح کا حکم ہو کشادگی کر دے اور جب مجلس سے اٹھایا جائے اٹھ جائے اور جب تک اس حکم کی نوبت نہ آوے تو اس کے لئے دل سے آمادہ رہے اس آمادگی سے قلب میں زیادہ وسعت ہوگی اصلاح اخلاق کیلئے کیونکہ حالت قلب کی زیادہ قابل اعتبار ہے۔ پس یقیناً یہی امر منسوخ ہوا کہ آرام اور راحت روح کی معتبر ہے نہ کہ جسم کی اس حکمت کے لئے حق سبحانہ تعالیٰ کا یہ ارشاد۔ یفسح اللہ لکم اور فانشزوا یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اتوا العلم درجات ظاہر و باطن سب کے لئے شامل رکھا گیا۔

اعمال عوام اور علماء کا فرق

اب اس مضمون ضمنی کے بعد یرفع اللہ الذین امنوا کا بیان کرتا ہوں کہ یہاں پر حکم رفع درجات عام مومنین کے لئے ثابت فرمایا پھر تخصیصاً اہل علم کے لئے اس کا حکم کیا اور صرف یرفع اللہ الذین امنوا پر اکتفاء نہیں فرمایا، گو وہ اہل علم کو بھی شامل ہو جاتا، سو ایسا کرنے سے مقصود اہل علم کی فضیلت کا ثابت کرنا ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ ایک عمل عوام کا ہے کہ بوجہ بہت حقائق نہ جاننے کے وہ اس عمل کے پورے حقوق ادا نہیں کر سکتے اور ایک عمل اہل علم کا ہے وہ اس کے زیادہ حقوق ادا کر سکتے ہیں، پس اس عارض کی وجہ سے ان دونوں کے اعمال میں ضرور فرق ہوا اور اہل علم کا عمل قوی اور کامل ہوا تو اہل علم کو جدا کر کے بیان کیا اور ظاہر ہے کہ اہل علم اور عوام میں جو یہ فرق ہوا اس کا مدار بجز علم کے اور کئی شے نہیں۔ لہذا علم ہی ایسی چیز ہوئی، اس سے اہل علم کو فضیلت ہوئی، پھر جب علم مقبول و محبوب ہوا تو اہل علم بھی ضرور محبوب اور مقبول ہوں گے اور قاعدہ ہے کہ محبوب کو غیر محبوب سے زیادہ اجر دیتے ہیں اس لئے اہل علم کو زیادہ اجر ملے گا۔ اب میں اس راز کو بھی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ ایک ثمرہ تو نفس عمل پر مرتب ہوتا ہے اور ایک اس کی خصوصیت پر، مثلاً دو شخصوں سے ایک مضمون لکھوایئے، ایک تو محض مضمون لکھ دے اور ایک فنی ذی فہم ہو کہ اس کو سمجھے بھی اور خوشنویسی سے زیب و زینت کیساتھ لکھے گا، تو یہ زیادتی نفس عمل پر نہیں ہوئی بلکہ اس کی تحسین و تکمیل موقوف ہوئی علم پر اور جب کسی عمل میں تکمیل ہوگی تو وہ عمل افضل ہوگا اور اس عمل کے ثمرات بھی افضل ہوں گے۔ پس اسی وجہ سے اہل علم کے عمل پر ثمرات بھی عوام کے ثمرات سے زیادہ مرتب ہوں گے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف کی نماز غیر عارف کی لاکھ نمازوں سے افضل ہے اس لئے کہ تکمیل موقوف ہے علم پر مجھے ایک حکایت یاد آئی حضرت حاجی صاحب کے ایک خلیفہ تھے ایک مرتبہ انہوں نے قصداً اہتمام کر کے نہایت خضوع و خشوع سے نماز پڑھی اور نماز پڑھ کر مراقب ہوئے

عالم امثال کی طرف اس کی صورت دیکھنے کے لئے متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ نہایت حسین و جمیل عورت ہے جو سر سے پیر تک زیوروں میں لدی ہوئی تھی مگر آنکھوں سے اندھی ہے۔ یہ واقعہ حضرت حاجی صاحب سے بیان کیا۔ حضرت نے معانتے ہی فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی ہوگی۔ عرض کیا جی ہاں حضرت نے فرمایا یہی وجہ ہے کہ اندھی نظر پڑی حضرت کا فہم عجیب و غریب تھا فرمانے لگے کہ آنکھ کا بند کرنا خطرات سے بچنے کے لئے گوجائز ہے لیکن زیادہ اچھا ہے کہ آنکھیں کھلی رہیں گولاکھوں خطرات آتے رہیں۔ کیونکہ نماز میں آنکھیں کشادہ رہنا موافق سنت کے ہے اور بند کرنا خلاف سنت ہے یہ فرق ہے عارف اور غیر عارف میں اور عارف جس کا مدار وہی علم کا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی لاکھ رکعت سے افضل ہے اب تو معلوم ہو گیا کہ یہ وجہ ہے علم کی رفعت کی دوسری ایک وجہ یہ ہے کہ اعمال کا ثمرہ علم ہی کی وجہ سے ملتا ہے کیونکہ وہ موقوف ہیں علم پر تو جو موقوف پر ثمرہ ملتا ہے وہ بلحاظ موقوف علیہ کے ملتا ہے کیونکہ اس کے بدوں موقوف کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ پس عمل کا اجر ہی موقوف ہوا۔ پس عقلاً بھی علم کی فضیلت ثابت ہو گئی اور اسی سے علماء کے لئے زیادت اجر کا ملنا عقلاً معلوم ہو گیا۔

شریعت اور سائنس

اب میں نو تعلیم یافتہ جماعت کی ایک نعلطی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شریعت میں جو علم کی فضیلت وارد ہے اس میں علم سائنس و علم و معاشیات وغیرہ داخل نہیں۔ بلکہ علوم احکام مراد ہیں جو قرآن و حدیث و فقہ میں منحصر ہے بعض احادیث و نصوص میں جو علم کا لفظ مطلق وارد ہوا ہے تو اس مطلق سے یہ مقید ہی مراد ہے اس سے ایسا عموم سمجھنا جس میں سائنس وغیرہ سب داخل ہو جائیں ایسا ہے جیسا کوئی شخص کہے کہ تعلیم حاصل کرو اس کا مطلب بیان کیا جائے کہ پاخانہ کمانا بھی سیکھو ہر چند کہ پاخانہ اٹھانا بھی واقعہ میں تعلیم کا ایک شعبہ ہے مگر عرفاً تعلیم حاصل کرنے سے ہرگز ہرگز کوئی شخص یہ نہ سمجھے گا کہ پاخانہ اٹھانے کی بھی تعلیم مراد ہے۔ پس اسی طرح قرآن و حدیث میں جو علم کی فضیلت مذکور ہوئی ہے۔ اس علم میں سائنس وغیرہ ہرگز داخل نہیں بلکہ یہ علم تو بمقابلہ علم احکام کے بحکم جہل ہے دیکھئے قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے یہود کے متعلق اول تو لقد علموا فرمایا۔ اس سے ان کا اہل علم ہونا ظاہر فرمایا ہے اور اس کے بعد لو کانوا یعلمون فرمایا جس میں انہی سے علم کی نفی فرماتے ہیں تو یہاں نفی علم سے مراد علم مع العمل کی نفی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ شریعت میں جہاں علم کی فضیلت کا ذکر ہے وہاں علم سے وہ مراد ہے جس کو عمل میں بھی دخل ہو بلکہ اس کے ساتھ عمل موجود بھی ہو پس بتلائے کہ سائنس کو عمل شرعی میں کیا دخل ہے جو اس کو اطلاق شرع میں داخل کیا جائے۔ اس دعویٰ کی دوسری

دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے ان الانبیاء لم یورثوا دینار اولاد رہما ولكن ورثوا العلم۔ پس اس سے روز روشن کی طرح ظاہر اور واضح ہو گیا کہ شریعت میں علم سے مراد علم دینار اور درہم نہیں۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو علوم ذرائع کسب بھی عطا فرمائے تھے مگر حضورؐ نے نہ ان کو علم سے تعبیر فرمایا اور نہ ان میں وراثت جاری ہوئی کہ جو کسب ایک نبی کو عطا فرمایا تھا وہ وراثتہ ان کی اولاد در اولاد چلا ہو جب یہ امر منقح اور طے ہو گیا کہ علم سے مراد ایسے ذرائع و طرق کسب بھی نہیں۔ جو بعض انبیاء کو عطا فرمائے گئے تھے جیسا داؤد علیہ السلام کو زہرہ بنانا سکھلایا اور ان کے ہاتھوں میں لوہے کو موم بنا دیا گیا۔ والناله الحدید در کف داؤد آہن موم کرد اور اس قسم کے کسب انبیاء علیہم السلام کو بھی عطا فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ زکریا علیہ السلام نجار تھے۔ نیز انبیاء کے لئے ہوا کو مسخر فرما دیا۔ مگر ان سب امور سے انبیاء کسی ایسے امر کے لئے مبعوث نہیں ہوئے اور نہ انبیاء کی وراثت بجز علم شرعی کے کسی اور چیز میں جاری ہوئی سو جب یہ مفید علوم بھی نصوص فضیلت میں داخل نہیں تو پھر سائنس اور جغرافیہ جو طرق کسب میں سے بھی نہیں علم انبیاء میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ انبیاء کے کلام میں علم سے مراد علم نبوت ہے نہ کہ علم کسب اور نہ علم طبیعیات وغیرہ الغرض اس ذی فضیلت علم سے دین کا علم مراد ہے اور اہل علم کی فضیلت اسی علم کی وجہ سے ہے۔

حال و قال

اب ان فضائل کے بعد چونکہ یہاں علماء کے ناز کا موقع تھا کہ ہم اہل علم ہیں اور ہمارا عمل عوام سے بڑھا ہوا ہے تو ان لوگوں کی تنبیہ کے لئے فرماتے ہیں واللہ بما تعملون خبیر اے علیہم باطن الامور یعنی خدا تعالیٰ کو عمل کے ساتھ باطن کی بھی خبر ہے۔ وہ سب کے باطن کو بھی دیکھ رہے ہیں کہ کس میں اخلاص ہے کس میں نہیں محض علم پر ناز نہ کرنا کیونکہ یہ علم تو شیطان اور بلعم باعور کو بھی حاصل تھا۔ شیطان بقول مشہور معلم ملائکہ بھی تھا اور بلعم باعور اپنی قوم کا داعظ بھی تھا۔ اور دونوں شخص علم کے ساتھ عمل ظاہر کے بھی جامع تھے۔ بڑے عابد اور جفاکش مجاہدہ کرنے والے تھے۔ مگر ان کے باطن میں اخلاص اور خدا تعالیٰ کی محبت و معرفت پوری نہ تھی اس لئے یہ علم و عمل سب بے کار ہو گیا۔ پس عمل کے ساتھ بھی سب بے کار ہو گیا۔ پس عمل کے ساتھ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہوئی جس کا نام حال باطنی ہے بدوں حال کے علم و عمل قابل اعتبار نہیں اور یہ حال کتب بینی سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ کسی صاحب حال کی جو تیاں سیدھی کرنے سے نصیب ہوتا ہے۔ غرض اس جگہ آیت میں باختلاف وجوہ دلالت تین چیزیں مذکور ہوئیں علم و عمل و حال اور ان تینوں کی تحصیل ضروری ٹھہری اور محض علم و عمل حاصل ہو گیا مگر حال نہ ہو تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے واللہ بما تعملون خبیر جیسا قریب ہی

مذکور ہوا۔ یعنی خدا باطن کو بھی دیکھتے ہیں۔ نرے ظاہری علم و عمل کو نہیں دیکھتے، عارف رومی فرماتے ہیں۔

مابروں رائنکریم وقال را مادروں رائنکریم وحال را

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِ مُوَابِقِينَ

يَدِي نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ

ترجمہ: یعنی اے ایمان والو جب تم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوشیدہ بات کرنا چاہو تو پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔

تفسیری نکات

اعمال صالحہ کی توفیق پر صدقہ کا حکم

مناجات رسول ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں سے ہے۔ پس اس کے ارادہ پر صدقہ دینے کا حکم ہوا۔ اور سبحان اللہ کیا بلاغت ہے یوں نہیں فرمایا۔ فقد موابین یدیکم نفقة اس لئے کہ اس میں کسی تلخ کو یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ ان کے رسول نے بھی اپنی کمائی کے بھی خوب ڈھنگ نکال رکھے تھے۔ اب یہ شبہ ہی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ صدقات واجبہ کا مال جیسا کہ صیغہ امر سے اس صدقہ کا وجوب معلوم ہوتا ہے حضور اور حضور کی اولاد کے لئے بلکہ مطلق بنی ہاشم کے لئے حرام تھا۔ اس لئے کہ صدقہ کو اوساخ الناس فرمایا ہے۔ ہاں صدقات نافلہ بنی ہاشم کے لئے جائز ہیں اور آپ کے لئے وہ بھی حرام تھے۔

جب یہ قانون ہوا تو لوگ ڈر گئے اس لئے کہ بعضوں کے پاس روپیہ تھا اور بعضوں کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اور حضور سے باتیں کرنے کے سبب دلدادہ اور شیفہ تھے۔ اس قانون پر صرف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عمل کرنے پائے تھے کہ فوراً دوسری آیت اس کی ناسخ نازل ہوئی۔ ء اشفقتم ان تقدموا بین یدی نجواکم صدقات فاذلم تفعلوا و تاب اللہ علیکم الخ یعنی کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی سرگوشی سے پہلے صدقات پیش کرو۔ پس جب تم نے نہ کیا (بوجہ غیر مستطیع ہونے کے) اور اللہ تعالیٰ نے تم پر رجوع فرما لیا (یعنی اس حکم کو منسوخ کرنے سے تم پر رحمت فرمائی الخ) سبحان اللہ قرآن شریف کی کیا بلاغت ہے اول آیت میں تو صدقہ لفظ مفرد سے فرمایا اور دوسری آیت میں صدقات کو جمع کے صیغے سے لائے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ ہمارے بندے ہمارے رسول کے ایسے چاہنے والے ہیں کہ ان کو بغیر رسول سے بات کئے

ہوئے چین نہ آوے گا اور بہت سے صدقات دینے پڑیں گے۔ خیر میری غرض اس آیت اور اس کے شان نزول کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ اعمال صالحہ کی توفیق ہونے کا مقتضی تو یہ ہے کہ اس پر کچھ خرچ کرنا چاہیے چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سورہ بقرہ ختم ہوئی ہے تو انہوں نے ایسی اونٹنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ذبح کی تھی جس کی انگوٹیں سوا شرفیاں ملتی تھیں۔ آج تو سارا قرآن شریف یاد ہونے پر اگر حافظ جی کو پانچ روپیہ دیدے تو گویا حافظ جی کو خرید لیا۔ اس زمانہ میں مولویوں اور معلم قرآن اور مساجد کے موزنوں کی کچھ قدر نہیں۔ خیر مولویوں کی تو کچھ تھوڑی بہت ہے بھی لیکن قرآن شریف پڑھانے والوں کی تو کچھ بھی نہیں ہے بہت سے بہت تنخواہ حافظ کی مقرر کریں گے تو چار یا پانچ روپیہ۔

موزن کی فضیلت

اور بے چارے موزنوں کو تو کون پوچھتا ہے ان کو تو بہت ذلیل اور اپنا خادم سمجھتے ہیں۔ سب کام موزنوں کے ہی ذمہ ہے پانی گرم کرنے کے لئے گوبر اور کوڑا لانا بھی اسی کے ذمہ ہے اور محلہ بھر کے گھروں کا کام کرنا بھی اس کے ذمہ سمجھا جاتا ہے۔ صاحبو! موزنوں کی حدیث شریف میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ ان کی قدر کرنا چاہیے یہ سرکاری آدمی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِنْهُ.

ترجمہ: یعنی نہیں پائیں گے آپ اے محمد ایسی قوم کو جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہوں کہ وہ دوستی کریں ان لوگوں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کریں اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا گھرانے والے یہ لوگ (یعنی مومنین) وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ایمان جمادیا ہے۔ اور ان کی اپنے پاس سے روحانی تائید کی ہے۔ (الحشر آیت ۲۲)

ایمان کا تقاضا

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کا مقتضی یہ ہے کہ اللہ و رسول کے مخالفین کے ساتھ دوستی نہ ہو اور نیز اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوستی سے بچنا دو چیزوں پر موقوف ہے اول تصحیح عقائد اور دوسری بات وہ ہے جس کو روح فرمایا ہے روح کہتے ہیں حیات کو اس سے مراد نسبت مع اللہ ہے جس سے قلب کی حیات ہے۔ (الرغیۃ المطلوبہ)

سُورَةُ الْحَشْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ

هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے اللہ سے بے پرواہی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جان سے ان کو بے پرواہ بنا دیا یہی لوگ نافرمان ہیں۔

تفسیری نکات

اللہ تعالیٰ کو بالکل فراموش کرنے والا کون ہے؟

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جاؤ۔ جو اللہ کو بھول گئے ہیں۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ کیسا لحاظ فرماتے ہیں کہ یوں نہیں فرمایا۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ جَسَاسًا كَمَا تَرجمہ یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں۔ کیونکہ آیت کے مخاطب مسلمان ہیں (اور خدا کے بھولنے والے کافر ہیں) حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس طرح خطاب کرنا گوارا نہیں فرمایا۔ کہ تم خدا کے بھولنے والے نہ بن جانا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ دیکھو بھولنے والوں کے مشابہ نہ ہو جانا۔ اس میں جس قدر عنایت و لطف ہے ظاہر ہے کیونکہ اس کا یہ مطلب ہوا کہ خدا کو بھول جانا تو تمہاری محبت سے بعید ہے ہاں بھولنے والوں کی طرح ہو سکتے ہو۔ تو ہم تم سے کہتے ہیں کہ تم ایسے بھی نہ ہونا۔ اس لئے لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فرمایا دوسرے یہ بھی اس میں نکتہ ہو سکتا ہے۔ کہ خدا کا بالکل بھولنے والا کافر ہے۔ اور آیت کے مخاطب مسلمان ہیں اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کو لَا تَكُونُوا مِنَ الَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ کے ساتھ خطاب ہو بھی نہیں سکتا بلکہ ان

کو تو لاتکونوا کالذین نسوا اللہ ہی سے خطاب ہو سکتا ہے۔ (ایضاً ص ۳۴)

اور اس میں بہ نسبت نکتہ اولیٰ کے زیادہ مبالغہ ہوا (کیونکہ اس نکتہ اولیٰ کا حاصل یہ تھا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا بعید ہی سہی لیکن بھول سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے پھر بھی عنایت و شفقت کی بناء پر یہ نہیں فرمایا کہ تم ہم کو بھولنا مت بلکہ یہ فرمایا کہ بھولنے والے کی طرح نہ ہونا اور دوسرے نکتہ کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا ممکن ہی نہیں کیونکہ بالکل بھول جانا کافر کا کام ہے اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا۔ (ایضاً ص ۴۰)

آگے ارشاد ہے فانسہم انفسہم کہ جب وہ خدا کو بھول گئے تو خدا تعالیٰ نے ان کے نفسوں کو بھی ان کو بھلا دیا یہاں ایک نکتہ ہے گو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر خیر دل میں آئی ہوئی بات کو کیوں روکوں شاید کسی کو نفع ہو جائے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے ونحن اقرب الیہ من جبل الوریث کہ ہم انسان کی جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ تو جو شخص جان سے زیادہ قریب کو بھول جائے تو ممکن نہیں کہ وہ اپنے کو یاد رکھے حقیقت میں خدا کو بھولنے والا اپنے آپ کو بھی بھولا ہوا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جو اپنے آپ کو بھی بھول گیا اس کو تو مقام فنا حاصل ہوا تو جواب یہ ہے کہ لعنت ہے ایسی فنا پر فنا کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی یاد میں اتنا مستغرق ہو کہ اپنے کو بھول جائے۔ نہ یہ کہ خدا کو بھلا کر اپنے آپ کو بھولے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کو بھول کر ہم اپنے کو کہاں بھولتے ہیں اپنی یاد تو پھر بھی رہتی ہے تو پہلے یہ سمجھو کہ یاد کے معنی کیا ہیں۔ یاد مطلوب وہ ہے جو نافع ہو اور جو محبت کے ساتھ ہو چنانچہ یہ محاورہ بھی تو ہے کہ دوستوں سے کہا کرتے ہیں کہ بھائی ہم کو یاد رکھنا اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ محبت سے یاد رکھنا یہ کسی کا مطلب نہیں ہوتا کہ بس جس طرح سے بھی ہو یاد رکھنا خواہ روزانہ دو چار لپڑ ہی لگا دیا کرنا اور اگر وہ آ کر دو چار لپڑ لگا دیا کرے اور یہ کہے کہ تم نے یاد کرنے کو کہا تھا میں یاد ہی تو کرتا ہوں تو اس کو ہرگز یاد نہیں کہا جاسکتا۔ غرض محاورہ میں بھی محبت ہی کی یاد کو یاد کہتے ہیں۔ دشمن اور ضرر رسانی کی یاد کو یاد نہیں کہا کرتے۔ اب سمجھئے کہ جس وقت کسی نے اپنے خدا کو بھلا دیا تو اس نے اپنے تمام مصالح کو فوت کر دیا۔

اب اس کو یہ یاد نہیں رہا کہ میرے نفس کی فلاح کا طریقہ کیا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے کو بھول گیا اور اب اس کو اپنی یاد ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کو روزانہ دو چار جوتے مار کر یہ کہے کہ میں تجھ کو یاد کرتا ہوں غرض جو شخص خدا تعالیٰ کو بھولے گا وہ اپنے کو بھی ضرور بھول جائے گا اسی طرح جو خدا کو یاد رکھے گا وہ اپنے کو بھی یاد رکھے گا۔ مگر مستقلاً نہیں بلکہ اس طرح کہ میں خدا کی چیز ہوں خدا تعالیٰ کے ساتھ مجھے تعلق ہے اور جو کچھ میرے پاس ہے سب خدا کی امانت ہے وہ کسی چیز کو بلا واسطہ خدا تعالیٰ کے یاد نہ کرے گا بلکہ جیسے عاشق کو محبوب کی سب چیزیں یاد رہتی ہیں اور ان کی یاد حقیقت میں محبوب ہی کی یاد ہوتی ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا رتبہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا رتبہ تو یہاں تک ہے کہ ان سے پوچھا گیا اہل عرفت ربک بمحمد ام عرفت محمد بر بک کہ آپ نے حق تعالیٰ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے پہچانا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے پہچانا تو فرمایا عرفت محمداً بر بى کہ میں نے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے پہچانا اگر آج کوئی شخص یہ بات کہہ دے تو بس کافر ہو گیا بجائے قدر کرنے کے غریب پر چار طرف سے کفر کے فتوے لگیں گے کیونکہ حقیقت شناس دنیا سے اٹھ گئے چنانچہ ایک شخص نے میرے ایک دوست سے کہا کہ تم جو توحید کے مضامین زیادہ بیان کرتے ہو (کہ حق تعالیٰ کے افعال میں نہ کسی ولی کو دخل ہے نہ نبی کو وہاں کوئی دخل کار نہیں ہے وغیرہ وغیرہ) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعظیسی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا تو یہ تو یہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعظیم سے تھوڑا ہی روکتے ہیں بلکہ خدا کی توہین سے روکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ حق تعالیٰ کو گھٹا دو غور کر کے دیکھا جائے تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صفات الوہیت ثابت کرتے ہیں حقیقت میں وہ آپ کی بے تعظیسی کرتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ صفات الوہیت درجہ کمال میں تو آپ کے لئے ثابت کر نہیں سکتے لامحالہ درجہ نقصان میں ثابت کریں گے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقص قرار دیا اور ہم آپ کے لئے صفات الہی کو ثابت نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی نفی کر کے صرف صفات بشریہ اور کمالات نبوت کو آپ کے لئے ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے ہر صفت کو درجہ کمال میں ثابت کرتے ہیں تو ہم آپ کو بشر کامل و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کامل کہتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہو گے تو ناقص خدا کہو گے اور ہم انسان کہتے ہیں مگر کامل انسان تو بتلاؤ بے تعظیسی کس نے کی بے ادب وہ ہے جو آپ کو ناقص کہے یا وہ جو کامل کہے اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے گھٹانا بھی بے ادبی ہے تو پھر حضرت صدیق اکبر کو کیا کہئے گا جو یوں کہتے ہیں کہ میں نے اول خدا کو جانا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے خدا کو نہیں پہچانا غرض یہ ثابت ہو گیا کہ عارف کی نظر اول خدا پر پڑتی ہے۔ پھر اپنے پر تو معلوم ہوا کہ خدا قریب ہے اور نفس دور ہے۔ (اگر خدا تعالیٰ نفس سے قریب تر نہ ہوتے تو کسی کی نظر بھی اول ان پر نہ پڑ سکتی ۱۲) تو لازم آ گیا کہ جو خدا کو بھول گیا وہ اپنے نفس کو بھی بھول گیا اسی کا بیان ہے فانسہم انفسہم پس وہ اپنے نفسوں کو بھول گئے)

ہماری بد حالی کا سبب

آگے فرماتے ہیں اولنک ہم الفاسقون یہ ہے جزو مقصود جس سے مجھ کو بد حالی مذکور سابقاً کا علاج

مستحب کرنا ہے ترجمہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں حکم سے نکل جانے والے اس میں اولئک اسم اشارہ ہے جس کے لئے فاسقون کا حکم ثابت کیا گیا ہے اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ اسم اشارہ میں مشار الیہ کا مع صفات مذکورہ کے اعادہ ہوتا ہے اور حکم کی بناء انہی صفات پر ہوتی ہے جو پہلے مذکور تھیں۔ اولئک علی ہدیٰ من ربہم و اولئک ہم المفلحون (یہی لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کو اللہ کی جانب سے ملی اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے) کی تفسیر میں مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے کہ اسم اشارہ سے اس جگہ یہ بات بتلائی گئی ہے کہ ہدایت و فلاح کا حکم صفات مذکورہ ایمان بالغیب و اقامۃ الصلوٰۃ کتب منزلہ و انفاق مال وغیرہ پر مبنی ہے۔ اور ان صفات کو حکم فلاح میں دخل ہے (۱۲) اس قاعدے کی بناء پر یہاں بھی اولئک میں صفت نسیان کا اعادہ ہوگا۔ جو پہلے الذین نسوا اللہ (جو لوگ اللہ کو بھول گئے ہیں) میں مذکور ہو چکی ہے اور حکم فسق کی بناء اسی صفت پر ہو گی خلاصہ یہ کہ آیت میں نسیان خدا پر فسق کو مرتب کیا گیا ہے تو یہ سبب ہو فسق کا یعنی حکم سے نکل جانے اور حکم سے نکل جانا یہی حقیقت ہے معصیت کی جس میں ہم مبتلا ہیں تو الحمد للہ آیت سے صاف طور پر سبب مرض کی تشخیص ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ ہماری بد حالی کا سبب یہ ہے کہ ہم خدا کو بھول گئے ہیں۔

ذکر اللہ مرض نسیان کا علاج ہے

اور طبعی قاعدہ ہے العلاج بالضد (علاج ضد کے ساتھ ہونا چاہیے) اور نسیان کی ضد ذکر ہے تو معصیت کا علاج ذکر اللہ ہو یا یوں کہئے کہ ہر مرض کا علاج رفع سبب سے ہوتا ہے (خواہ ضد کے ذریعہ سے رفع کیا جائے یا مثل کے ذریعہ سے مگر ازالہ مرض کے لئے رفع سبب سب کے نزدیک ضروری ہے ۱۲) اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرض عصیاں کا سبب نسیان ہے تو اس کا علاج یہ ہوا کہ نسیان کو اٹھا دو اور رفع نسیان مستلزم ہے وجود ذکر کو (کیونکہ ارتقاغ نقیضین محال ہے تو حاصل پھر وہی ہوا کہ معصیت کا علاج خدا کو یاد رکھنا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اس آیت میں اولئک ہم الفاسقون نسوا اللہ پر مرتب کیا گیا ہے جس سے اس نسیان کا سبب فسق و معصیت ہونا ظاہر ہوا اور مرض کا علاج سبب کے ازالہ سے ہوتا ہے تو معصیت کا علاج نسیان ہوا اور ازالہ نسیان ذکر سے ہوتا ہے اس لئے گناہوں سے بچنے کے واسطے ذکر اللہ لازم ہوا۔ (ذم النسیان)

لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا

مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ

ترجمہ: کہ اگر یہ قرآن پہاڑ پر نازل ہوتا کہ وہ بھی حق تعالیٰ کی ایک توجہ ہے تو وہ خوف الہی سے پست ہو جاتا۔ اور پھٹ جاتا۔

تفسیری نکات

مقصود نزول آیت

یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ جب قرآن میں یہ اثر ہے تو انسان پر یہ اثر کیوں ظاہر نہیں ہوتا اگر یہ کہا جائے کہ انسان میں تاثر کی استعداد نہیں تو اس صورت میں اس کا عذر تو ظاہر ہے مگر سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون انسان کو غیرت دلانے کے لئے سنایا گیا ہے کہ تم ایسے سنگدل ہو کہ قرآن سن کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ اگر پہاڑ پر نازل ہوتا تو اس کی یہ حالت ہو جاتی تو اگر انسان میں تاثر کی استعداد نہیں تو اس حالت میں غیرت دلانا بے کار ہوگا۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھ میں یہ استعداد ہوتی تو میری بھی وہی حالت ہوتی۔ اور اگر انسان میں استعداد تاثر ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس پر یہ اثر کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔

جواب یہ ہے کہ انسان میں تاثر کی استعداد موجود ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس میں تحمل کی قوت بھی پہاڑ سے زیادہ ہے۔ اگر پہاڑ پر حق تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا تو اس میں خشوع تاثر کے ساتھ انشقاق و تصدع بھی ہوتا۔ کیونکہ اس میں قوت تحمل نہیں ہے تم میں اگر بوجہ تحمل کے انشقاق و تصدع نہیں ہے تو کم از کم تاثر و خشوع تو ہونا چاہیے تو شکایت اس کی نہیں کہ قرآن سن کر تمہارے دل پھٹ کیوں نہیں گئے بلکہ شکایت اس کی ہے کہ خشوع کیوں نہیں پیدا ہوا۔

اور انسان میں قوت تحمل کا جبال سے زائد ہونا دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

انَا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا
وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا

اسی کو عارف اسی طرح فرماتے ہیں

آسماں بار امانت نتوانست کشید

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(جس بار امانت کو زمین و آسمان نہ اٹھا سکا اس کا قرعہ میرے جیسے دیوانہ کے نام نکل آیا)

سُورَةُ الْمُمتَحِنَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ

إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَاءٌ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ

دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ

أَبَدًا حَتَّى تُوَفِّيُوا بِاللَّهِ وَحَدَّاهُ

ترجمہ: تمہارے لئے ابراہیم علیہ السلام میں اور ان لوگوں میں جو ایمان و طاعت میں ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں بغض اور عداوت ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

تفسیری نکات

حدود اتفاق

لوگ آج کل اتفاق اتفاق تو پکارتے ہیں مگر اس کی حدود کی رعایت نہیں کرتے بس اتنا یاد کر لیا ہے کہ قرآن میں حکم ہے لا تفرقوا افتراق نہ کرو۔ مگر اس سے پہلا جملہ نہیں دیکھتے و اعتصموا بحبل اللہ جمیعاً کہ اس میں اللہ کے راستہ پر قائم رہنے کا پہلے حکم ہے اس کے بعد ارشاد ہے کہ حبل اللہ پر متفق ہو کر اس سے تفرق نہ کرو تو اب مجرم وہ ہے جو حبل اللہ سے الگ ہو اور جو حبل اللہ پر قائم ہے وہ ہرگز مجرم نہیں گواہل باطل

سے اس کو ضرور اختلاف ہوگا۔ پس یاد رکھو کہ نہ اختلاف مطلقاً نہ موم ہے جیسا کہ ابھی ثابت کیا گیا اور نہ اتفاق مطلقاً محمود ہے بلکہ اتفاق محمود وہ ہے جو جبل اللہ کے اعتصام پر ہو ورنہ کفار نے بھی توبت پرستی پر اتفاق کیا تھا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں وَقَالَ انما اتخذتم من دون الله اوثانا مودة بينكم في الحياة الدنيا کہ تم لوگوں نے حیات دنیا میں اتحاد اور دوستی قائم کر کے چند بتوں کو معبود بنا لیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کفار میں اتحاد و اتفاق تھا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس اتفاق کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ دوسرے مقام پر اس کا بھی ذکر ہے قد كانت لكم اسوة حسنة في ابراهيم والذين معه اذ قالوا القوم هم انا براء وامنكم ومما تعبدون من دون الله كفرنا بكم وبدابيننا وبينكم العداوة والبغضاء ابراهيم عليه السلام نے اس اتفاق کی جڑیں اکھاڑ دیں اور اہل باطل سے صاف صاف بیزاری کا اعلان کر دیا اور فرما دیا کہ قیامت تک کے لئے ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت بغض قائم ہو گیا معلوم ہوا کہ اہل باطل کے ساتھ اس طرح اتفاق کرنا محمود نہیں کہ وہ اپنے باطل پر جے رہیں اور اسی حالت میں ہم ان سے اتفاق کر لیں۔ بلکہ اس صورت میں تو ان سے بیزاری اور اختلاف و عداوت رکھنا ہی مطلوب ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اتباع نے کیا اور انہی کی اقتداء کا حق تعالیٰ ہم کو حکم فرما رہے ہیں۔

نمونہ دینے سے کیا غرض ہوتی ہے یہی کہ اس کے موافق دوسری چیز تیار ہو۔ میں نے ایک بزرگ محقق کا اس کے متعلق ایک لطیف مضمون سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے درزی کو ایک اچکن سینے کو دی اور نمونہ کے لئے ایک سلی ہوئی اچکن بھی دی کہ اس ناپ اور نمونہ کی اچکن سی لاؤ درزی نے ساری اچکن نمونہ کے موافق تیار کی غرض طول بھی برابر سلائی بھی یکساں غرض کہیں قصور نہیں کیا۔ فرق کیا تو صرف یہ کیا کہ ایک آستین ایک بالشت چھوٹی بنا دی جب وہ اچکن لے کر مالک کے پاس پہنچے گا تو مالک اسے کیا کہے گا وہ اچکن خوش ہو کر لے گیا اس کے سر پر مارے گا۔

اگر درزی جواب میں یہ کہے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے صرف ایک آستین میں ذرا سی کمی ہے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ مالک اس کو پسند کرے گا ہرگز نہیں اس سارے کپڑے کی قیمت رکھوائے گا۔

خوب یاد رکھئے کہ حق تعالیٰ نے احکام نازل کئے جو بالکل مکمل قانون ہے اور ان کا عملی نمونہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا سو اگر آپ کے اعمال نمونے کے موافق ہیں تو صحیح ہیں ورنہ غلط ہیں اگر نماز آپ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے موافق ہے تو نماز ہے ورنہ کچھ بھی نہیں اگر ذکر آپ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے موافق ہے تو ذکر ہے ورنہ الٹی معصیت ہے دیکھئے نماز میں کوئی بجائے دو کے ایک سجدہ کر لے تو وہ

نماز نہ رہی دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔

کوئی قرآن شریف بحالت جنابت پڑھے تو بجائے ثواب کے الٹا گناہ ہوتا ہے۔ (اسی قبیل سے یہ بھی ہے کہ اسمائے الہی توقیفی ہیں اپنی طرف سے کوئی نام رکھنا جائز نہیں) اگر آپ روزہ رکھیں تو وہی روزہ صحیح ہوگا جو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہوگی ہذا حج وہی صحیح ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے موافق ہو اگر حج میں کوئی احرام نہ باندھے تو وہ حج حج نہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ وہی صحیح ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ہو اور کوئی سارا مال خلاف تعلیم خرچ کر دے تو زکوٰۃ سے فارغ نہیں ہو سکتا۔

یہ ارکان اسلام ظاہری ہوئے اسی طرح اعمال باطنی کو سمجھ لیجئے اور معاملات اور طرز معاشرت سب میں یہی حکم ہے حق تعالیٰ نے ہمارے پاس کسی فرشتہ کو رسول بنا کر نہیں بھیجا اس میں حکمت یہی ہے کہ اگر فرشتہ آتا تو وہ ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتا تھا اس کو نہ کھانے کی ضرورت ہوتی نہ پہننے کی نہ ازدواج کی نہ معاشرت کی ان چیزوں کے احکام میں صرف یہ کرتا کہ ہم کو پڑھ کر سنا دیتا یہ کام صرف کتاب کے بھیج دینے سے بھی نکل سکتا تھا کہ ایک کتاب ہمارے اوپر اتر آتی اس میں سب احکام لکھے ہوتے اس میں آپ پڑھ لیتے اور عمل کر لیتے فرشتے کے اترنے سے اس سے زیادہ کوئی بات نہ پیدا ہوتی جو کتاب سے ہو سکتی تھی۔

حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہماری جنس میں سے پیغمبر بنائے کہ وہ ہماری طرح کھاتے پیتے بھی ہیں؛ ازدواج اور تعلقات بھی رکھتے ہیں۔ تمدن اور معاشرت کے بھی خوگر ہیں اور ان کے ساتھ کتابیں بھیجیں تاکہ کتاب میں احکام ہوں اور وہ خود بنفس نفیس ان کی تعمیل کر کے دکھادیں تاکہ ہم کو سہولت ہو اسی واسطے فرمایا ہے۔

وما ارسلنا قبلك من المرسلین الا انهم لیاكلون الطعام ويمشون فی الاسواق
ترجمہ: یعنی ہم نے جس قدر پیغمبر بھیجے وہ اور آدمیوں کی طرح کھانے پینے والے اور معاشرت رکھنے والے بھیجے دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلاً

یعنی اگر ہم فرشتہ کو احکام لے کر بھیجتے تب بھی یہ ہوتا کہ وہ انسان کی صورت میں آتا ورنہ انسان کو اس سے ہدایت نہ ہو سکتی کیونکہ وہ نمونہ نہ بن سکتا۔ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات فرشتوں سے بھی زیادہ ہیں لیکن حکمت الہی اسی کی مقتضی ہوئی کہ آپ نسل انسان سے پیدا ہوں تاکہ تمام افعال انسانی میں نمونہ بن سکیں دیکھ لیجئے کہ جتنی باتیں انسان کو پیش آتی ہیں سب آپ کو پیش آئیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیبیاں رکھیں اور اپنی اولاد کا نکاح کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں غمی کی تقریبیں بھی ہوئیں کئی صاحبزادوں نے انتقال کیا جو حالات ہم کو پیش آتے ہیں وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں نکلے تاکہ ہمارے لئے پورا ایک دستور العمل بن جائے۔

اب آپ دیکھ لیجئے کہ کونسا فعل ہمارا نمونہ کے موافق ہے کوئی تقریب خوشی کی ہوتی ہے تو ہم نہیں دیکھتے اور کوئی تقریب غمی کی ہوتی ہے تب ہم نہیں دیکھتے کہ دستور العمل میں کیا ہے اس درزی کی مثال کو یاد رکھئے ایک بالشت کپڑا کم کر دینے سے اچکن منہ پر ماری جاتی ہے اور اگر وہ بجائے سینے کے کپڑے کی دھجیاں کر کے مالک کے سامنے جا کر رکھے تو وہ کس سزا کا مستوجب ہے جبکہ مالک قادر بھی ہو۔

واللہ باللہ ہمارے اعمال کی حالت یہ ہی ہوگئی ہے کہ جو طریقہ ان کا بتلایا گیا تھا وہ تو کوسوں دوران اعمال کو تباہ کر کے اور دھجیاں اڑا کے ہم حق تعالیٰ کے سامنے رکھ دیتے ہیں یہ کچھ مبالغہ آمیز الفاظ نہیں ہیں دیکھ لیجئے کہ جیسے اچکن سینے کے واسطے کپڑے کا اپنی اصل پر رہنا شرط ہے اور دھجیاں کرنے والا اس کو اس اصل سے نکال دیتا ہے کہ جس سے اچکن تو کیسی کپڑے کی کوئی غرض بھی اس سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح تمام اعمال کے صحیح ہونے کے واسطے ایمان کا ہونا شرط ہے کوئی چاہے کہ ایمان کھو کر کوئی عمل کرے تو وہ ایسے ہی بے کار ہوگا جیسے کوئی کپڑے کی دھجیاں کر کے اچکن سینا چاہے۔

تسبیحات سیدنا فاطمہؑ کا شان وارو

حدیث شریف میں قصہ وارد ہوا ہے کہ سیدنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دست مبارک میں چکی پینے سے چھالے پڑ گئے تھے ان سے کہا گیا کہ حضورؐ کے ہاں غلام باندی بہت آتے ہیں ایک آپ بھی مانگ لیں۔ چنانچہ وہ حضورؐ کی خدمت میں تشریف لے گئیں لیکن حضورؐ دولت خانہ میں اس وقت تشریف نہ رکھتے تھے۔ جب حضور تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت صاحبزادی صاحبہ کا تشریف لانا ذکر فرمایا۔ حضور خود ان کے یہاں تشریف لے گئے۔ وہ اس وقت لیٹی تھیں۔ اٹھنے لگیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم اسی حالت سے رہو۔ فرمایا اے فاطمہ تم لونڈی غلام کی درخواست کرتی ہو کیا میں تم کو اس سے اچھی اور بہتر شے نہ بتاؤں۔ جب تم سونے لگو تو سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۳ بار پڑھ لیا کرو۔ یہ لونڈی غلام سے بہتر ہے سیدۃ المؤمنین اس پر راضی ہو گئیں تو حضورؐ نے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے متمتع اور دنیا کو مطلقاً پسند نہیں فرمایا۔ چہ جائیکہ صدقات واجبہ وہ تو حرام تھے ہی اس لئے آیت میں لفظ صدقہ فرمایا جس کا صرف کرنا اپنے لئے آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو جائز ہی نہ تھا تا کہ یہ شبہ ہی بالکل زائل ہو جاوے کہ حضورؐ نے نعوذ باللہ اپنے لئے آمدنی کا طریقہ نکالا تھا اس لئے کہ صدقہ کا قانون اور ایک معلوم ہے کہ وہ رقم حضور کے یہاں نہ آوے گی پس قرآن میں بھی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ یا ایہا الذین امنوا قوا انفسکم و اہلیکم ناراً اس میں ایمان والوں کو صاف حکم ہے کہ جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی تو اس کا بھی وہی مطلب ہو گیا جو

ارجل راع علی اهل بیت کا تھا کہ مرد اپنے گھر والوں کی اصلاح کا ذمہ دار ہے بلکہ قرآن میں جن لفظوں سے اس مضمون کو بیان فرمایا ہے اس میں رجال کی بھی تخصیص نہیں بلکہ یا ایہا الذین امنوا میں تبلیغاً عورتیں بھی داخل ہیں جیسا کہ قرآن میں تمام جگہ یہی طرز ہے کہ عورتوں کو مستقلاً خطاب نہیں کیا جاتا بلکہ مردوں کے ساتھ تبعاً ان کو بھی خطاب ہوتا ہے تو یہاں بھی اس قاعدہ کے موافق یہ خطاب مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہے تو عورتوں کے لئے بھی یہ بات ضروری ہوئی کہ وہ اپنے خاوند اور اولاد کو جہنم کی آگ سے بچاویں اور ان کو خلاف شرع امور سے روکنے میں کوشش کریں۔ قرآن میں تو یہ مضمون عورتوں کے متعلق اجمالاً ہے اور حدیث میں اجمالاً بھی ہے اور تفصیلاً بھی بہر حال خواہ اجمالاً ہو خواہ تفصیلاً قرآن و حدیث دونوں بتلا رہے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کے متعلق کچھ حقوق ہیں جن کے متعلق ان سے باز پرس ہوگی۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم اپنی حالت میں غور کریں کہ ہم لوگ ان احکام کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ آیا ان کا امتثال کرتے ہیں یا نہیں۔

سُورَةُ الصَّاف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُولُوا

مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ

ترجمہ: کہ وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں خدا کے نزدیک نہایت مبغوض ہے کہ جو کام خود نہ کروا سکو۔

تفسیری نکات

شان نزول

اس کا سبب نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی عبادت سب سے زیادہ خدا کو پسند ہے تو ہم دل و جان سے اس کو خوب بجالائیں اس پر ارشاد ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ خدا کو بہت پسند ہے بس یہ سن کر بعضوں کا خون خشک ہو گیا ان لوگوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسی باتوں کا دعویٰ یا وعدہ کیوں کرتے ہو جنہیں تم پورا نہیں کر سکتے۔

یہ آیت دعوت و تبلیغ سے متعلق نہیں

تو یہاں لم تقولون سے لم تنصحون غیر کم یا قول امری وانشائی مراد نہیں ہے بلکہ قول خبری و ادعائی مراد ہے حاصل یہ کہ یہ آیت دعویٰ کے باب میں ہے دعوت کے بارے میں نہیں اس آیت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کچھ بھی مس نہیں۔

اپنی اصلاح ضرورت میں مقدم ہے

غرض واجب تو دوسرے کی اصلاح بھی ہے مگر اپنی اصلاح اس پر ضرورت میں مقدم ہے اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہیے اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے۔

مگر کوئی اس سے یہ نہ سمجھے کہ اگر اپنی اصلاح نہ ہوئی ہو تو دوسرے کو تنبیہ نہ کرے دراصل یہ دو کام (اپنی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر) الگ الگ ہیں ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں ایک کو بھی ترک کرے گا تو اس کے ترک کا گناہ ہوگا اور دوسرے کے ترک کا گناہ ہوگا۔ دونوں کو ترک کرے گا تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا۔ (ضرورت تبلیغ ملحقہ دعوت و تبلیغ ص ۳۰۱ تا ۲۹۹)

یہ آیت دعوت کے بارے میں ہے

دراصل یہ لوگ محض ترجمہ دیکھنے سے دعو کے میں پڑ گئے۔ ترجمہ سے یہ سمجھے کہ مطلب یہ ہے کہ جو کام خود نہ کرے وہ دوسروں کو بھی کرنے کو نہ کہے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے تفسیر میں اسباب نزول سے آیات کے صحیح مطلب کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی عبادت سب سے زیادہ خدا کو پسند ہے۔ تو ہم دل و جان سے اس کو خوب بجالاتیں۔

اس پر ارشاد ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ خدا کو بہت پسند ہے۔ بس یہ سن کر بعضوں کا خون خشک ہو گیا۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسی باتوں کا دعویٰ یا وعدہ کیوں کرتے ہو جنہیں تم پورا نہیں کر سکتے۔ تو یہاں پر لم تقولون سے لم تنصحنون غیر کم یا قول امری و انشائی مراد نہیں ہے۔ بلکہ قول خبری و ادعائی مراد ہے۔ حاصل یہ کہ یہ آیت دعویٰ کے باب میں ہے دعوت کے باب میں نہیں۔ اس کے شان نزول معلوم ہو جانے کے بعد سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس آیت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ممانعت سے کچھ بھی مس نہیں۔ (ضرورت تبلیغ)

لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون ایک دوسری آیت میں ہے جو اس سے بھی صاف ہے اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم۔

شان نزول

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو کیوں کہتے ہو۔ وہ جو کرتے نہیں خدا کے نزدیک یہ نہایت مبغوض

و ناپسند ہے کہ وہ کہو جو نہ کرو۔ ایک تو اس آیت سے تمسک ہے اور دوسری آیت میں تو ظاہراً نصیحت بلا عمل ہی پر تصریحاً انکار ہے۔ اس لئے اگر اس سے شبہ پڑ جائے تو کچھ بعید نہیں۔ مگر پہلی آیت یعنی لَمْ تَقُولُوا لَنْ نَكْفُرَ بِكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ لِقَاءَ رَبِّكُمْ کی تو یہ تفسیر ہی نہیں۔ یہ محض ترجمہ دیکھنے سے بناء الفاسد علی الفاسد پیدا ہوتی ہے ابھی میں اس کی تفسیر اور شان نزول بتاتا ہوں۔ مگر اول اس آیت کو سمجھ لیجئے۔ جس میں ظاہراً اس کا صریح ذکر ہے مگر اس کے بھی یہ معنی نہیں ہیں کہ ناسی نفس یعنی بد عمل کو وعظ کہنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ بلکہ داعظ کو نسیان نفس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وعظ تو کہو۔ مگر بد عمل مت بنو۔ بلکہ جو نصیحت دوسروں کو کرتے ہو۔ وہ اپنے نفس کو بھی کہو اور اس سے بھی عمل کراؤ۔ اب رہا یہ شبہ کہ ہمزہ استفہام انکاری تا مرون پر داخل ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسی نفس کو امر بالبر یعنی وعظ کی ممانعت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اہل علم جانتے ہیں کہ دخول ہمزہ کا مجموعہ دونوں جملوں کا ہے۔ تو مراد یہ ہے کہ امر بالمعروف اور بد عملی کو جمع نہ کرو۔ تو با احتمال عقلی اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ امر بالمعروف تو کرو۔ مگر بد عملی نہ کرو ایک یہ کہ اگر بد عملی کا وقوع ہو تو پھر امر بالمعروف نہ کرو تو لوگوں نے اس کا مطلب اسی دوسری صورت کو سمجھا کہ عمل بد میں مبتلا ہو تو وعظ چھوڑ دو۔ مگر یہ اس لئے غلط ہے کہ قواعد شرعیہ کے خلاف ہے۔ اگر تم یہ کہو کہ آیت میں اس کا احتمال تو ہے تو ہم کہیں گے کہ اول تو دوسرے دلائل سے اس کا احتمال نہیں رہا باقی ہم اس سے استدلال نہیں کرتے جو ہم کو دوسرا احتمال ہے۔ تو تمہارا تو استدلال اس سے جاتا رہا۔ باقی ہم اس سے استدلال نہیں کرتے جو ہم کو دوسرا احتمال مضر ہے۔ ہمارے پاس ہمارے مدعا کے دوسرے مستقل دلائل موجود ہیں۔ اب رہی پہلی آیت یعنی لَمْ تَقُولُوا لَنْ نَكْفُرَ بِكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ لِقَاءَ رَبِّكُمْ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اصل میں قول کے دو معنی ہیں یا یہ کہو کہ قول کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قول انشائی۔ ایک قول خبری۔ قول خبری تو یہ کہ تم بذریعہ قول کے کس بات کی خبر دیتے ہو۔ ماضی کی یا مستقبل کی۔ اور قول انشائی یہ کہ خبر نہیں۔ بلکہ کسی اور بات کا امر و نہی کرتے ہو۔ تو یہاں قول پر انشائی مراد نہیں۔ قول خبری یعنی ایک دعویٰ مراد ہے۔ چنانچہ شان نزول اس کا یہ ہے کہ لوگوں نے کہا تھا کہ ہم کو اگر کوئی عمل ایسا معلوم ہو جاوے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک احب و افضل ہو تو ہم ایسی ایسی کوشش کریں پھر قال نازل ہونے پر بعض جان بچانے لگے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ پس اس دعوے کے متعلق ارشاد ہے کہ ایسی بات کہتے ہی کیوں ہو جو کرتے نہیں۔ تو اس آیت میں دعوے کا قول مراد ہے۔ نصیحت کا قول مراد نہیں۔ چنانچہ ان آیتوں میں اس کا قرینہ بھی ہے۔ ان اللہ یحب الدین یقاتلون فی سبیلہ ہے۔ بہر حال بلا عمل کے وعظ کہنے کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ اس شخص کو عمل کی کوشش کرنی چاہیے اور وعظ کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ البتہ ایسے شخص کا وعظ جو کہ بد عمل ہو تو وہ برکت سے ضرور خالی ہوگا (الدعوة الی اللہ ص ۲۰)

تقریر ثانی

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ یا ایہا الذین امنوا لم تقولون ما لا تفعلون۔ اس آیت میں حرف استفہام لم خود تقولون پر داخل ہے جس سے صاف یہی سمجھا جاتا ہے کہ دوسروں کو کیوں کہتے ہو وہ بات جو خود نہیں کرتے اما مردون الناس میں تو یہ بھی گنجائش تھی کہ ہمزہ استفہام کو باعتبار مجموع کے تسون پر داخل مانیں۔ یہاں تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ سو اس سے تو صاف یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اگر خود عمل نہ کرے تو دوسرے کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں ہے یہ ایک بہت باریکی غلطی ہے لیکن شان نزول معلوم ہونے سے یہ اشکال حل ہو جاتا ہے۔ شان نزول اس کا یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے کہا تھا کہ اگر ہم کو خبر ہو جاوے کہ فلاں عمل کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں تو ہم اس کے اندر جدوجہد کریں گے چونکہ یہ ایک صورت ہے دعویٰ کی یہ ناپسند ہوئی۔ اس لئے ان کو تادیب کی جاتی ہے کہ ایسی بات زبان سے کیوں نکالتے ہو جو کہ نہ کر سکو۔ پس تقولون میں قول اخباری ہے انشائی نہیں یعنی دوسرے کو نصیحت کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اپنے کمالات کا دعویٰ کرنا مراد ہے۔ چنانچہ آگے ارشاد ہے۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانہم بنیان مرصوص۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے بڑے عمل کرنے والے اور ہماری پسندیدگی کے طالب ہو تو لو ہم بتاتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو دوست رکھتے ہیں جو اللہ کے راستہ میں ایسا عمل شاق کرتے ہیں۔ اگر ہماری محبت سے تو اس پر عمل کرو ورنہ دعویٰ نہ کرو پس اس آیت میں امر بالمعروف کا ذکر ہی نہیں کہ جو باعث شبہ کا ہو ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ فن کے نہ جاننے سے اب انصاف فرمائیے کہ جو حضرات صرف ترجمے کا مطالعہ کرتے ہیں اور ترجمہ بھی کون سا جو امیر ترجمہ ہو۔ غریب ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

یہ آیت واعظ غیر عامل کے بارے میں ہے لیکن اس میں انکار صرف جزو اخیر پر ہے۔ یعنی نسیان نفس پر ہر چیز پر انکار نہیں پس آیت میں واعظ کے غیر کامل ہونے پر انکار ہے۔ غیر عامل کے واعظ ہونے پر انکار نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ واعظ کو جملائے معصیت ہونا حرام ہے اور جملائے معصیت کو وعظ کہنا حرام نہیں۔ خوب سمجھ لو اور دوسری آیت کو تو وعظ پر حمل کرنا ہی صحیح نہیں کیونکہ ”لم تقولون“ سے قول انشائی مراد نہیں بلکہ قول خبر ہی مراد ہے یعنی دعویٰ مراد ہے دعوت مراد نہیں کیونکہ جس معاملہ کے متعلق اس کا نزول ہوا ہے اس میں لے چوڑے دعوے ہوئے تھے کہ اگر ہم کو احب الاعمال کا علم ہو جائے تو ایسا ایسا مجاہدہ کریں جب ایک واقعہ میں ترغیب ہوئی اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسے دعوے کس لئے کرتے ہو جن کو پورا نہیں کر سکتے تو یہاں دراصل دعویٰ سے احکام اسلامیہ پر عمل کرنے کا حکم کیا جاتا ہے اور نواجی سے منع کیا جاتا ہے جس کا حاصل

دعوت ہے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اس لئے وعظ گوئی اس آیت میں داخل نہیں مگر چونکہ کبھی کلام انشائی بھی متضمن خبر ہو جاتا ہے۔ جیسے منافقین کا نشہد انک لرسول اللہ کہنا واقع میں تو انشاء ہے کہ ہم آپ کی رسالت کی تصدیق کرتے ہیں مگر ضمناً اس میں یہ دعویٰ بھی ہے کہ ہم سچے اور مخلص مسلمان ہیں منافق نہیں ہیں۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے آگے فرمایا۔ واللہ یشہد ان المنفقین لکذبون۔ جس میں ان کو اس کلام میں کاذب فرمایا گیا اور یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ کلام انشائی کے قائل کو صادق کاذب کہہ نہیں سکتے تو یہاں ان کو کاذب کیسے کہا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ کلام انشائی ایک کلام خبری کو متضمن ہے اس متضمن کے اعتبار سے ان کو کاذب کہا گیا ہے اسی طرح ہر چند کہ وعظ کلام انشائی ہے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر لیکن صورتہ اس میں ایک قسم کا دعویٰ بھی ہے کہ ہم خود بھی اس پر عامل ہیں اس دعویٰ ضمنی کے اعتبار سے باحیاء آدمی کو وعظ کہتے ہوئے طبعاً لم تقولون مالا تفعلون پیش نظر رہے گا گواصل میں یہ آیت وعظ کے متعلق نہیں مگر وہ متضمن خبر کی وجہ سے اپنے کو اس کا مصداق سمجھ کر شرماتا ہے اور جلد اصلاح کر لیتا ہے۔

سُورَةُ الْجُمُعَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ

النَّاسِ فَتَمَتُّوا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَكَ

أَبَدًا إِيْمًا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اے یہودیو! اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم بلا شرکت غیرے اللہ کے مقبول ہو تو تم موت کی تمنا کرو اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو۔ اور وہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے بوجہ ان اعمال کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں کی۔

تفسیری نکات

یہود کے دعویٰ حقانیت کا امتحان

خداوند تعالیٰ نے ان آیات میں یہود کے دعویٰ حقانیت کا ایک امتحان مقرر کیا ہے جس امتحان کے متعلق پیشین گوئی بھی کی گئی ہے۔ امتحان یہ کہ یہود یہ دعویٰ کرتے تھے کہ آخرت ہمارا حصہ ہے۔ ان آیات میں جناب باری تعالیٰ نے اس پر گفتگو کی ہے ایسے طرز سے جس کی ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ مناظرہ کا یہ طریقہ ہے آج کل مناظرہ کا طرز عجیب ہے کہ تمام عمر اسی قیل و قال میں گزر جاتی ہے۔

نصاریٰ سے احتجاج

ایک آیت میں نصاریٰ سے احتجاج ہے جبکہ انہوں نے کوئی دلیل نہیں مانی تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

فمن حاجك فيه من بعد ما جاءك من العلم یعنی بعد دلائل کے بھی جو شخص کج بحثی کرے اس سے خاص طور پر قسم قسمی کر لو اور اس آیت میں یہودی مخاطب ہیں یعنی ان زعمتم انکم اولیاء للہ یعنی اگر تم حق پر ہو اور آخرت تمہارے لئے ہے تو موت سے ڈرو موت کیونکہ موت نعمائے آخرت میں داخل ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لئے اگر تم اپنے کو واقعی حق پر سمجھتے ہو تو موت کی تمنا کرو چنانچہ اس امتحان میں یہودنا کامیاب رہے اور ان کے سکوت سے میدان خالی ہو گیا۔ مدعی پسپا ہوئے اور اب تبلیغ عام کا خوب موقع ملا۔ چنانچہ اس مقام پر بھی خدا نے بتلایا ہے ولا یتمنونه ابد یعنی وہ موت کی تمنا نہ کر سکیں گے اور علت اس کی یہ ہے کہ بما قدمت ایدیہم یعنی جو کچھ انہوں نے کیا ہے اور اپنی زندگی میں برے کام کئے ہیں اور مشاغل کو بڑھا رکھا ہے۔ وہ ان کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کر سکیں گے۔ پس غور کرنے سے معلوم ہو گیا کہ موت کی تمنا نہ کرنے کا باعث اور سبب یعنی ارشاد ہوا کہ اعمال سیئہ کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کریں گے۔ قرآن شریف یہ بتلاتا ہے کہ موت کی عدم تمنا کا سبب اعمال سیئہ ہیں۔ مگر معاصی و تمنا جمع نہیں ہو سکتیں۔ جب اعمال سیئہ ہوں گے تو موت سے انس نہ ہوگا۔ اس مقابلہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جیسے اعمال سیئہ میں یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان موت سے نفرت کرتا اور متوحش ہے اسی طرح اعمال صالحہ میں موت سے وحشت نہیں ہوتی ایک حکم نصاب ثابت ہوا یعنی اعمال سیئہ میں موت سے نفرت و وحشت اور دوسرا حکم یعنی اعمال صالحہ میں موت کی تمنا اور خواہش استنباطاً۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم لوگ موت کو کیسا سمجھتے ہیں ذرا اپنے قلوب کو ٹٹول لیں اور دیکھیں کہ ہم میں موت سے نفرت پائی جاتی ہے یا موت کی تمنا اور یہ دوسرے نہ ہو کہ اس آیت میں ہم کو خطاب ہی نہیں پھر اس سے ہم کیوں فکر میں پڑیں۔ سو سمجھ لینا چاہیے کہ گو خطاب خاص ہے مگر مضمون عام ہے اور یہ خداوند تبارک و تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دوسروں کی حکایت میں ہماری تشبیہ مقصود ہے اور دوسروں کے واقعات بتلا کر ہم کو بتلایا جاتا ہے کہ ایسے خطرات سے بچو تا کہ تم بھی محفوظ رہ سکو۔ پس یہ ہماری رعایت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت خداوند تعالیٰ کو ہمارے ساتھ منظور ہے جیسا کہا گیا ہے۔

گفتہ آید در حدیث دیگران

خوشتر آں باشد کہ سر دلبران

کیا ہی اچھی بات ہے کہ ہمارے دل کی بات دوسروں کی حکایت میں کہہ دیجائے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ قرآن مجید میں ایسی رعایت رکھی گئی قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے دوسری امت کے ذکر میں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے بڑی بڑی قیمتی ہدایات بیان فرمائی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہم تدبر نہیں کرتے اور نہیں خیال کرتے کہ خداوند تعالیٰ نے ہمارے واسطے کیا کیا مفید باتیں بیان فرمائی ہیں۔ افلا یتدبرون القرآن کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے (لآیۃ) لیکن تدبر میں صرف مطالعہ ترجمہ قرآن اور اپنی

رائے پر اکتفانہ کریں لوگ سخت غلطی کرتے ہیں کیونکہ قرآن مجید کا خود اردو ترجمہ دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے اردو ترجمے دیکھ کر کبھی ایک اردو داں شخص قرآن مجید کو اچھی طرح سے نہیں سمجھ سکتا۔ البتہ قرآن مجید کے سمجھنے اس میں تدبیر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ علوم درسیہ کو حاصل کیا جائے لیکن یہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو فارغ ہیں اور علوم درسیہ کے حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس وقت ہو۔ اس لئے جو لوگ غیر فارغ ہیں ان کے لئے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان کو سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ترجمہ کو حرفاً حرفاً کسی مولوی صاحب سے پڑھے اور سمجھے۔ خود پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرنا لا حاصل ہے۔ کیونکہ اس میں بڑی غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ کا کچھ لوگ سمجھ لیتے ہیں۔ تجربات سے ان کو بہت کچھ نقصانات معلوم ہوئے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ

فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ

كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ① فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي

الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا

لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ②

ترجمہ: اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لئے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز و خطبہ) کی طرف فوراً چل پڑا کرو اور خرید و فروخت (اسی طرح دوسرے مشاغل جو چلنے سے مانع ہوں) چھوڑ دیا کرو۔ یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو کچھ سمجھ ہو (کیونکہ اس کا نفع باقی ہے بیع وغیرہ کا فانی) پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو اس وقت تم کو اجازت ہے تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی کو تلاش کرو اور اس میں بھی اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو تا کہ تم کو فلاح ہو۔

تفسیری نکات

حرمت بیع جمعہ کی اذان اول سے ہو جاتی ہے

فرمایا۔ اذا نودی للصلاة من یوم الجمعة الخ (جب جمعہ کی اذان ہو تو خرید و فروخت بند کر دو)

پر اشکال یہ ہوا کہ اول اذان ثانی تھی اور یہی اذان بعد میں ہوئی تو اب ترک بیع اذان ثانی سے ہونی چاہیے۔ حالانکہ فقہاء کہتے ہیں کہ حرمت بیع کی اذان اول سے ہو جاتی ہے۔ بعض نے جواب دیا عموم الفاظ کا اعتبار ہے مگر میرے نزدیک عموم وہ معتبر ہے جو مراد متکلم سے متجاوز نہ ہو جیسا لیس من البر الصیام فی السفر سفر میں روزہ رکھنا سنی نہیں۔ تو یہ وجہ تو درست نہ ہوئی وجہ یہ ہے کہ اذان ثانی تو مدلول ہے اور بوجہ اشتراک علت کے وہ بھی داخل آیت ہے اور علت سعی الی ذکر اللہ ہے۔ خوب سمجھ لو (الکلام الحسن حصہ دوم)

فضل سے رزق مراد ہے

میں رزق کو فضل فرمایا ہے کیونکہ اسی آیت میں فانتشروا فی الارض بھی ہے اور انتشار فی الارض پر جس فضل کی طلب مرتب ہوتی ہے ظاہر ہے کہ وہ طلب رزق ہی ہے لیکن سب افراد فضل کے برابر نہیں اسی لئے اس امر کو یعنی وابتغوا من فضل اللہ کو مفسرین نے اباحت پر محمول کیا ہے۔ کیونکہ اس کے اوپر ہے وابتغوا من فضل اللہ کو مفسرین نے ترک بیع کا امر مستمر ہو پس فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ سے بتلا دیا گیا کہ بعد فراغ صلوٰۃ کے وہ اب جائز ہو گیا ہے کیونکہ امر بعد الخطر اباحت کے لئے ہوتا ہے غرض یہاں سب کے نزدیک تفسیر فضل کی رزق ہی ہے اس لئے اس کے بعد یوں بھی فرمادیا کہ واذکروا اللہ کہ خدا کی بھی یاد رکھو یہ نہ ہو کہ رزق کو فضل مقصود بالذات سمجھ کر اس کی تلاش میں خدا کو بھول جاؤ۔ نہیں بلکہ دنیا غالب نہ ہو اور یہاں سے ایک مسئلہ تمدن کا بھی نکلتا ہے جس کو استطراداً ذکر کرتا ہے۔

اجتماع صالحین کی دو صورتیں

وہ یہ کہ مجمع کی دو قسمیں ہیں ایک اجتماع مفسدین کا اور یہ اکثر تو بیشک موجب خطر ہے دوسرا اجتماع صالحین کا اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ کسی ضرورت سے ہو دوسرے یہ کہ کام کچھ نہیں ویسے ہی اجتماع ہو گیا تو اس صورت میں تجربہ ہے کہ نفس خود کوئی کام اپنے لئے تجویز کر لے گا اور ظاہر ہے کہ نفس کا میلان الی الشر زیادہ ہے اس لئے غالباً وہ شر ہی کو تجویز کرے گا اور جس شر کو مجمع تجویز کرے گا اس کا اثر بھی بہت شدید ہوگا اگرچہ تنہائی میں بھی نفس اپنے لئے شر تجویز کرے گا مگر وہ بہت کم متعدی ہوگا مثلاً تنہائی میں تو یہ سوچتا رہے گا کہ کسی کی ٹمٹم لے لو کسی کا لڑکا اچھا ہے اور اسے گھور لو کوئی عورت اچھی ہے اسے تاکو اور مجلس میں جو شر تجویز ہوگا وہ آج کل کی اصطلاح کے موافق تبادلہ خیالات سے تجویز ہوگا۔ خدا جانے یہ تبادلہ کون سا صیغہ ہے خیر میں بھی انہی کے الفاظ میں کہتا ہوں جس میں سمجھنے میں آسانی ہو تو تبادلہ خیالات سے ایک جوش اور ہیجان پیدا ہوگا کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ دوسرا سوچے گا کہ اس کی تجویز میں ہمارے خلاف جو اجزاء ہیں انہیں رد کرنا چاہیے۔ ورنہ

سکوت و خاموشی تسلیم و رضا لازم آئے گا۔ پس اول تو دونوں راد بنے کہ ایک نے دوسرے کے قول کو رد کیا پھر دونوں مردود ہو گئے کہ کچھ انہوں نے انکار کر دیا اور کچھ انہوں نے اور یہی فساد ہے اس لئے اس صورت میں عقل یہ حکم کرتی ہے کہ جب مجمع ناجائز ہو تو منتشر کر دو چنانچہ اس حکم عقلی کے موافق تمام حکومتوں نے قانون بنایا ہے لیکن اس میں ایک کسر تھی کہ اسی حالت میں منتشر کرنے کا حکم دیا جب غرض ناجائز کے لئے اجتماع ہوا ہو اور شریعت نے اس کسر کو اپنے یہاں نہیں رکھا بلکہ مجمع ناجائز اسے بھی قرار دیا جو طاعت میں مشغول نہ ہو اگرچہ وہ ناجائز غرض سے جمع نہ ہوا ہو جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا تو اب جب نماز ختم ہو گئی تو مسجد میں خالی بیٹھ کر کیا ہوگا ایک ایک کی غیبت ہوگی اور پھر رد و قدح ہوگا اور اس سے فساد برپا ہوگا اس لئے حکم ہوا کہ ذکر و طاعت میں مشغول ہو تو مسجد میں ٹھہرو ورنہ چلے جاؤ اور چونکہ وعظ بھی ذکر ہے اس لئے بعد نماز جمعہ اگر وعظ کے لئے اجتماع باقی رہے تو جائز ہے۔

اردو میں خطبہ پڑھنا جائز نہیں

اور اس مقام پر ایک مسئلہ فاسعوالی ذکر اللہ سے مستحب ہو اس کو بھی استطراداً ذکر کرتا ہوں وہ یہ کہ خطبہ اردو میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں وہ استنباط یہ ہے کہ قرآن سے خطبہ کا نام ذکر اللہ رکھا ہے چنانچہ فاسعوالی ذکر اللہ فرمایا ہے جب خطبہ ذکر ہے تذکیر نہیں تو خطبہ کو اردو میں نہ پڑھیں گے جیسے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ خطبہ سے مقصود تذکیر ہے اور تذکیر موقوف ہے فہم پر اس لئے مادری زبان میں پڑھنا چاہیے تو اس سے اس کا جواب ہو گیا کہ قرآن نے خطبہ کو ذکر فرمایا ہے جس کی غرض فہم پر موقوف نہیں تذکیر نہیں بلکہ قرآن مجید کو جا بجا ذکر کرنا بمعنی تذکیر فرمایا گیا ہے مگر پھر بھی کسی کے نزدیک نماز میں وہ مادری زبان میں نہیں پڑھا جاتا تو خطبہ کیلئے تو بدرجہ اولیٰ یہ حکم ثابت ہوگا۔ تو فاسعوالی ذکر اللہ سے یہ مسئلہ مستحب ہو اور یہ تبرع ہے ورنہ اگر اس سے یہ نہ بھی مستحب ہو تب بھی فتویٰ اس پر موقوف نہیں فتویٰ تو فقہاء کے قول پر ہے کہ انہوں نے اس پر نہایت قوی استدلال کیا ہے کہ صحابہ نے کبھی غیر عربی زبان میں خطبہ نہیں پڑھا حالانکہ وہ فارس میں روم میں برابر رہے اور صحابہ وہاں کی فارسی اور ترکی زبان کے ماہر بھی تھے مگر خطبہ کبھی ترکی یا فارسی زبان میں نہیں پڑھا بس ہمارے لئے فقہاء کا یہ کہہ دینا کافی ہے خیر میں نے نکتہ اور لطیفہ کے طور پر آیت سے بھی اس کو مستحب کر دیا جیسے فسانتسروا سے تمدن کا مسئلہ ذکر کر دیا تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ نماز کے بعد اگر وعظ میں مشغول ہو گئے یا کسی اور طاعت میں لگ گئے تو اس کے لئے اجتماع جائز ہے کیونکہ اس کے لئے بھی تو جمع ہی کئے گئے ہیں لیکن اگر کوئی کام نہیں ہے تو اپنے اپنے کام کو جاؤ خالی مت بیٹھو کہ فساد کا اندیشہ ہے۔ فسانتسروا کا بھی حاصل ہے اب اگر اس تقریر پر فسانتسروا کو بجائے اباحت کے استہات کے لئے کہہ دیا جاوے تو کوئی حرج نہیں ہے

اگرچہ کوئی جزئی اس علت کے سبب امر کو جو ب کے لئے بھی کہہ سکتا ہے مگر یہ وجوب لغیرہ ہوگا بعینہ نہ ہوگا اس کے بعد ارشاد ہے وابتغوا من فضل اللہ یعنی منتشر ہونے کے بعد رزق تلاش کرو یہ نہیں کہ لہو و لعب میں مشغول ہو جاؤ۔ بعضے اہل ہوی صرف اسی آخر کے ٹکڑے کو لے لیتے ہیں کہ قرآن میں تلاش رزق کا حکم ہے بس رات دن اسی میں مشغول رہنا چاہیے گویا تمام قرآن میں ان کو یہی حکم پسند آیا جیسے کوئی شخص روزہ تو رکھتا نہ تھا مگر افطاری و سحری میں شریک ہو جاتا تھا کسی نے کہا کہ روزہ تو رکھتا نہیں سحری و افطاری کیوں کھاتا ہے کہنے لگا کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ بالکل ہی کافر ہو جاؤں چونکہ روزہ میں مشقت تھی اس لئے اس نے روزہ چھوڑ دیا اور افطاری سحری میں چکوتھیاں ملتی تھیں کہ مسجد میں دس گھر کی افطاری جمع ہوتی ہے اسے پسند کر لیا ایسے ہی انہیں بھی اوپر کی آیات کے احکام و ذروا البیع اور فاسعوا الی ذکر اللہ تو پسند نہیں آئے صرف آخر میں وابتغوا من فضل اللہ پسند آیا یہ نفس بڑا اپنے مطلب کا ہے انتخاب اعمال میں اس نفس کا یہی خاصہ ہے ایسے ہی لوگوں کی بابت میں شیخ نے کہا ہے

نہ سنت نہ بینی در ایشان اثر
مگر خواب پیشین و نان سحر

(یعنی سوائے قیلولہ اور سحری کی روٹیوں کے ان میں سنت کا کوئی اثر نہ پائے)

یعنی ان کو سنتوں میں صرف دو سنتیں پسند آئیں ایک قیلولہ اور ایک سحری کی روٹیاں ایسے ہی ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس سے پوچھا گیا تم کو احکام میں سے کیا پسند ہے کہنے لگا کلو و اشربوا کھاؤ پیو۔ پھر پوچھا گیا دعاؤں میں کون سی دعا پسند ہے کہنے لگا ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء اے اللہ ہمارے لئے آسمان پر سے دسترخوان نازل فرما دیجئے بہر حال حق تعالیٰ نے محض فانتشروا فی الارض پر تو اکتفا نہیں فرمایا کیونکہ محض مسجد سے نکل جانا ہی مقصود نہیں کیونکہ وہاں تو نمازی تھے اور یہاں بازار میں اہل بازی ہیں اور نہ محض ابتغاء رزق پر اکتفا فرمایا بلکہ اسی کے ساتھ واذکروا اللہ کثیراً بھی فرمایا پھر اس وابتغوا میں بھی ایک قید لگائی یعنی رزق کو جو فضل سے تعبیر فرمایا تو اس کو اللہ کی طرف مضاف فرمایا یعنی اس طرح فرمایا۔

عجیب بلاغت

وابتغوا من فضل اللہ جس میں عجیب بلاغت ہے کہ خالی فضل نہیں فرمایا بلکہ فضل اللہ فرمایا یعنی رزق کو رزق سمجھ کر حاصل نہ کرو بلکہ خدا کا فضل سمجھ کر حاصل کرو کہ اس میں بھی خدا سے تعلق رکھو۔ سبحان اللہ کیا تعلیم ہے کہ دنیا طلبی میں بھی خدا سے تعلق رکھو۔ محض دنیا کا قصد نہ رکھو بلکہ اس کے ساتھ خدا کے تعلق کو بھی ملا لو یہی عارفین کی تعلیم کا بھی خلاصہ ہے وہ یہی چاہتے ہیں کہ ہر امر میں خدا سے تعلق صحیح باقی رہے اور اس تعلق کے

سبب عارف کو نعمت سے جتنی محبت ہوتی ہے اتنی غیر عارف کو نہیں ہوتی کہ عارف یہ سمجھتا ہے کہ اسے محبوب سے تعلق ہے اور اسی اصل پر طالب کو شیخ سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ ماں باپ سے بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ موصل الی اللہ ہے اور اسی حیثیت سے عارف کو اپنے ہاتھ پاؤں سے بھی محبت ہوتی ہے اور وہ ان کی بہت حفاظت کرتا ہے کہ حلوے کھا رہا ہے گھی کھا رہا ہے کیونکہ یہ سب سرکاری چیزیں ہیں اس حیثیت سے ان کی حفاظت ضروری ہے جیسے سرکاری مشین کا نوکر مشین کو اس حیثیت سے تیل دیا کرتا ہے اس پر شاید کوئی نفس پرست کہے کہ اچھا اب سے ہم بھی یہی سمجھ کر خوب حلوے اور مٹھائیاں کھایا کریں گے۔ صاحب خوب سمجھ لو یہ بات کہیں محض سمجھنے سے تھوڑا ہی ہوتی ہے بلکہ وہ تو ایک حال ہے کہ یہ سرکاری چیزیں ہیں اور اس کا معیار یہ ہے کہ جو ارجح نافرمانی میں مشغول نہ ہوں۔ کیونکہ سرکاری چیزیں خلاف قانون استعمال نہیں کی جاتیں تو جب یہ حال ہو جائے تو ایسا شخص جو کچھ کھائے گا وہ عبادت ہے۔ (اشرف العلوم)

تمدن اور قیام سلطنت کا بڑا مسئلہ

فرمایا کہ تمدن اور قیام سلطنت کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بلا ضرورت عام کا اجتماع نہ ہونے پائے تمام سلطنتوں کو اس کا خاص اہتمام ہے۔ سو کلام مجید سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں وہ موجود ہے۔ فاذا قضیت الصلوة فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیر العلکم تفلحون کیونکہ انتشار کا حکم اس وجہ سے ہوا کہ ضرورت اجتماع باقی نہیں رہی۔ اگر مختلف الطبع لوگ بلا ضرورت ایک جگہ رہیں گے تو فساد و نزاع کا احتمال ہے اور اسی لئے انتشار کے بعد یہ بھی فرمادیا کہ ابتغوا من فضل اللہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد سے نکل کر بھی آوارہ نہ پھرو بلکہ خدا کے رزق کی طلب میں مشغول ہو جاؤ آگے اس شغل بالدنیا کے مفاسد کا علاج فرماتے ہیں۔ کہ اذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون تو ہر پہلو کو کیسا معتدل کیا ہے اور یہی اعتدال وہ چیز ہے کہ قرآنی تعلیم کے سوا کسی دوسری جگہ اس مرتبہ میں میسر نہیں ہو سکتی۔ (مقالات حکمت)

انسانی طبیعت

فاذا قضیت الصلوة فانتشروا فی الارض یعنی جب نماز ادا کر لی جائے تو زمین میں متفرق ہو جاؤ۔ ہم لوگ خود ایسے تھے کہ نماز کے بعد خود ہی بھاگتے لیکن حکم بھی فرمادیا۔ اس میں بھی مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے اور یہی وجہ تشبیہ ہے مگر یہ حکم و جوبی نہیں اور نیز ایسے دلدادہ بھی تھے جو مسجد میں رہ جاتے ہیں۔ بقول امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ

باشد کہ از بہر خدا سوائے غریباں بنگری

خسرو غریب ست گدا افتادہ در کوائے شام

ان کے لئے بھی انتشار فی الارض کو مصلحت سمجھا اور اس میں بھی بڑی مصلحت یہ ہے کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک کام سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور نیز طبائع اکثر ضعیف ہیں۔ جب زیادہ پابندی ہوتی ہے اور اس سے ہرج معاش ہوتا ہے اور حاجت ستاتی ہے تو ساری محبت رکھی رہ جاتی ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ یعنی زمین میں متفرق ہو جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق طلب کرو۔ علاوہ اس کے اس میں ایک تمدنی و سیاسی مصلحت بھی ہے جس کو میں نے ایک مرتبہ کراچی میں وعظ کے اندر بیان کیا تھا اس طرح جیسے کہ تمدن کے مسائل جیسے قرآن مجید سے ثابت ہوتے ہیں ایسے دوسری جگہ سے نہیں ہوتے چنانچہ اس آیت سے بھی ایک مسئلہ مستنبط ہوا کہ بلا ضرورت اجتماع نہ ہونا چاہیے اگر بضرورت ہو تو رفع ضرورت کے بعد فوراً منتشر ہو جانا چاہیے۔ یہی وہ مضمون ہے جو تمام اہل سیاست مانے ہوئے ہیں کہ ناجائز مجمع کو منتشر کر دیا جاوے۔ قرآن مجید میں اس مجمع کے ناجائز بننے سے پہلے ہی محض اس احتمال پر کہ اب ان کو کوئی کام تو رہا نہیں یہ ناجائز مجمع نہ بن جاوے سب کو منتشر کر دیا گیا۔ التہذیب)

خطبہ جمعہ ذکر ہے تذکیر نہیں

امام صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سبحان اللہ یا الحمد للہ کہنے سے خطبہ ادا ہو جائے گا اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ ذکر ہے تذکیر (احکام پہنچانا) نہیں اور دوسری زبان میں پڑھنے کا مشورہ دینے والے زیادہ تر اسی سے استدلال کرتے ہیں کہ عربی زبان کو مخاطبین سمجھتے نہیں پھر کیا فائدہ اس کا جواب ظاہر ہو گیا کہ جب وہ تذکیر نہیں تو سمجھنے کی بھی ضرورت نہیں اس استدلال کے ہوتے ہوئے ہم کو کسی اور استدلال کی ضرورت بھی نہ تھی اس کے قبل یہ میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا اور اس کا ذکر ہونا خود قرآن شریف سے ثابت ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع اس کو ذکر فرمایا ہے ذکر یعنی تذکیر نہیں فرمایا جیسے قرآن مجید کے متعلق فرمایا ہے۔ وما هو الا ذکر للعلمین پس خطبہ امر تعبدی ہے جیسے نماز میں قراءت اس میں قیاس کا کچھ دخل نہیں اس لئے اس میں یہ قیاس بھی نہیں چلتا کہ مقصود اس سے تفہیم ہے سو یہ مقصود جس طرح حاصل ہو جاوے اور فقہاء نے جو خطبہ کے متعلق لکھ دیا ہے کہ اس میں احکام کی تعلیم کی جاوے وہ حکمت ہے علت نہیں۔ (ملفوظات جلد ۴)

اذان اول سے حرمت بیع پر ایک اشکال اور اس کا جواب

اور ایک اشکال ہے اذان اول سے حرمت بیع کے ثبوت آیت سے تو نہیں پھر کیسے لکھتے ہیں۔ کتابوں

میں لقولہ تعالیٰ 'اذانو دی للصلوة الخ' اگر کہا جائے عموم الفاظ کا اعتبار ہے۔ مورد کا لحاظ نہیں تو اس میں تو اس میں بہت پرانا شبہ ہے عموم میں یہ قید ہونا چاہیے کہ مراد متکلم سے متجاوز نہ ہو۔ جیسے "لیس من البر الصیام فی السفر" علماء اس کو عام نہیں لیتے ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ہر سفر نہیں بلکہ جہاں مشقت ہو، میں ایک دفعہ مراد آبا د گیا وہاں بیان ہوا اس میں بات کو بھی ذکر کیا بیان میں شاہ صاحب مفتی صاحب بھی تھے اس کے بعد شوکت باغ گیا۔ مولوی قدرت اللہ صاحب نے اس قاعدہ کے متعلق سوال کیا۔ شاہ صاحب نے کہا ابھی تم نے سنا نہیں اس قاعدہ کی تحقیق اس میں یہ قید ہے پھر تو اور کسی کی موافقت کی ضرورت نہیں۔ اور اصولین نے لکھا کہ اصول فروع سے نکلا یا گیا تو جب اذان یہی (ثانی) تھی نزول کے وقت تو ذوق تو یہی ہے کہ ثانی مراد ہے لہذا اس سے استدلال کرنا حرمت بیع پہلے اذان سے ثابت ہے اس آیت سے ٹھیک نہیں۔ پس جواب یہ ہے کہ استدلال دو قسم کے ہیں یعنی آیت سے استدلال کرتے ایک تو بواسطہ اور ایک بلا واسطہ ثانی اذان میں تو بلا واسطہ ہے اور اذان اول میں دراصل قیاس کیا گیا۔ ثانی اذان پر بوجہ اشتراک علت کے یہ جواب جب سے سمجھ میں آیا بہت جی خوش ہوا۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۹۱)

سُورَةُ الْمُنَافِقُونَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

كَانَهُمْ خُشْبٌ مَّسْنَدَةٌ

ترجمہ: گویا وہ لکڑیاں جو در دیوار کے سہارے لگائی ہوئی کھڑی ہیں۔

تفسیری نکات

منافقین کی تشبیہ

حق تعالیٰ ایک تشبیہ میں فرماتے ہیں کانہم خشب مسندہ یہ منافقین کی تشبیہ ہے اور کیا غضب کی بلاغت ہے کہ منافقین ظاہر میں بہت چکنے چڑے اور لسان ہوتے تھے اور باطن میں خبیث تھے تو حق تعالیٰ نے دونوں باتوں کی رعایت کر کے کیا عجیب تشبیہ دی ہے کانہم خشب مسندہ یعنی وہ ایسے ہیں جیسے لکڑیاں لیکن باندھ کر رکھی ہوئی۔ لکڑیوں کو تراشنے کے بعد ہی لیکن باندھ کر رکھتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ چونکہ ظاہر میں یہ منافق بہت شائستہ ہیں اس لئے ان کو کندہ تراش تو نہ کہو۔ ہیں کندہ تراشیدہ مگر ہیں لکڑیاں ہی۔ یعنی عقل و شعور سے خالی جماد محض ہیں۔

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَيَّ مِنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ
 حَتَّى يَنْفَضُوا وَيَلَهُ خَزَائِنُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ
 الْمُنْفِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ۗ يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ
 لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۗ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ
 وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنْفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ

ترجمہ: وہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر خرچ مت کرو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جاویں اور اللہ ہی کے لئے ہیں۔ خزانے آسمانوں اور زمین کے لئے منافقین نہیں سمجھتے (اور) یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں لوٹ کر گئے تو ہم میں جو عزت والا ہے (یعنی ہم) وہ ذلت والے کو (یعنی صحابہ کو) نکال دیگا اور اللہ ہی کے لئے ہے عزت اور اس کے رسول کے لئے اور اہل ایمان کے لئے لیکن منافقین نہیں جانتے۔

تفسیری نکات

شان نزول

قصہ یوں ہوا تھا کہ ایک غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین اور انصار وغیرہ سب تھے اور غزوہ (جہاد) اور لڑائیوں میں منافقین بھی اکثر ساتھ جایا کرتے تھے اور ان کی غرض کبھی تو یہ ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے اسرار (بھید) معلوم کر کے کفار کو اطلاع دیں جیسے جاسوس کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک سمعون لہم۔ یعنی تم میں ان کے کچھ جاسوس موجود ہیں۔

قرآن مجید میں موجود ہے اور کبھی غنیمت میں حصہ لینے کو جاتے تھے کیونکہ ظاہری اسلام کے سبب سال غنیمت میں ان کو بھی حصہ ملتا تھا اور حکمت اس کی یہ کہ لڑائی لڑنے والے اپنی کمک کی قوت پر لڑا کرتے ہیں تو چونکہ یہ لوگ ظاہر میں بطور کمک کے جاتے تھے ان کو بھی مال غنیمت میں حصہ ملتا تھا اور ان سے معاملہ مسلمانوں کا سا کیا جاتا تھا اور وہ جانتے بھی تھے کہ مسلمان ہم سے یہ برتاؤ کریں گے اور بعض مرتبہ دونوں طرف سے لیتے تھے کہ کفار سے جا کر کہتے تھے کہ ہم نے تمہارے بھلے کی یہ رائے دی تھی۔ تو غرض یہ ہے کہ منافقین بھی جایا

کرتے تھے۔ تو اس غزوہ میں بھی یہ لوگ شریک تھے اور جہاں مختلف طبائع کے لوگ ہوتے ہیں وہاں اختلاف ہو ہی جاتا ہے۔ بلکہ اچھوں میں بھی ہو جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اچھوں کو اس پر اصرار نہیں ہوتا تو اتفاق سے دو شخصوں میں کچھ گفتگو بڑھ گئی۔ ایک مہاجر تھے اور ایک انصاری۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایک گندی بات ہے۔ تو وہ جوش ان لوگوں کا فوراً کم ہو گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری کی پیشکش

مکہ میں ایک مرتبہ کفار نے باہم مشورہ کر کے ایک شخص کو پیام دے کر بھیجا اور یہ درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں کو براندہ کہئے۔ تو آپ جو کچھ کہیں اس کے لئے ہم موجود ہیں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کی تمنا ہو تو جن عورتوں کو آپ پسند فرمائیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہو تو جس قدر چاہیں ہم سے مال لے لیں اور اگر آپ سرداری چاہیں تو ہم آپ کو سردار بنانے کے لئے موجود ہیں اور اس رائے میں تمام بڑے بڑے کفار ابو جہل وغیرہ بھی شریک تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کی اس درخواست کو نہایت تحمل سے سنتے رہے گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگوار ہوا۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال خوش اخلاقی بھی ثابت ہوتی ہے۔ آج ذرا سی بات خلاف مزاج ہو تو تحمل نہیں ہو سکتا۔ جب کفار کہہ چکے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ پڑھ کر یہ آیتیں شروع کیں۔

او جحدوا بہا و استیقنتھا انفسہم ظلماً و علواً (النمل آیت ۱۴)

اور ظلم اور تکبر کی راہ سے ان کے منکر ہو گئے۔ حالانکہ ان دلوں نے ان کا یقین کر لیا گیا

فرمایا آیت سورہ یونس سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے تکلم بکلمۃ الایمان کیا جو تصدیق پر کوئی کلمہ دال نہیں۔ سو اس سے عند اللہ اس ایمان کا مقبول ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر مان لیا جاوے کہ تصدیق بھی تھی تو یہ تصدیق اضطراری تھی جو کہ اکثر کفار کو حاصل ہے کما قال اللہ تعالیٰ یعرفونہ کما یعرفون ابناء ہم اور خود فرعون کو بھی قبل سے تھی و جحدوا بہا و استیقنتھا انفسہم ظلماً و علواً مگر فرق اتنا تھا کہ اس سے پہلے تکلم نہیں کیا تھا۔ اس وقت تکلم کیا سو یہ تکلم ممکن ہے کہ عذاب غرق سے بچنے کے لئے ہونہ انقیاد و تسلیم کے طور پر جس طرح اس کی نظیر پہلے بھی ہوئی تھی۔ قالو یا موسیٰ ادع لنا ربک بما عہد عندک لنن کشفنا عننا الرجز لنؤمنن لک ولنرسلن معک بنی اسرائیل المرء الآخرہ اور ایمان مامور باور مقبول وہ ہے جس میں تصدیق اختیاری ہو اور تکلم انقیادی ہو اس لئے اس آیت سے اس کا مومن مقبول الایمان ہونا ثابت نہیں ہوتا اور جو قول حضرت شیخ اکبر قدس اللہ سرہ کی طرف منسوب ہے حسب تحقیق شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ جیسا کہ ایواقیت والجبواہرین

ہے وہ شیخ اکبر کے کلام میں مدسوس ہے دوسرے نصوص سے اس کا ناری ہونا صاف ثابت ہوتا ہے جس میں تاویلات کی گنجائش نہیں ہے اور خود شیخ کی آخر تصنیفات میں فرعون کا ناری ابدی ہونا درج ہے جیسا کہ ایواقیت میں ہے اور ایسے احتمالات و تاویلات سے تو کوئی کلام خالی نہیں۔ (مقالات حکمت ص ۳۸)

حکم تنزیل من الرحمن الرحیم کتاب فصلت آیتہ قرانا عربیا لقوم یعلمون ترجمہ: ہم یہ کلام رحمان و رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے۔ ایسے لوگوں کے واسطے مفید ہے جو دانشمند ہیں۔ جب اس آیت پر حضور پہنچے۔

فان اعرضوا فقل انذرتکم صنعة مثل صنعة عاد و ثمود یعنی پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے بچاتا ہوں جیسے عاد اور ثمود پر آفت آئی تھی۔ تو وہ شخص گھبرا گیا اور کہا بس کیجئے اور وہاں سے بھاگا اور اس کمیٹی میں پہنچا تو ابو جہل اتنا عاقل تھا کہ اس شخص کو دور سے دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ گیا تھا اور چہرہ سے اور آ رہا ہے اور چہرہ سے۔ اس کا تو خیال بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے آ کر بیان کیا کہ بھائیو قرآن سن کر میری تو حالت بدلنے لگی۔ خصوص اس آیت پر تو مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ایک بجلی گری اور میرا کام تمام ہوا۔ بڑی مشکل سے وہاں سے نکلا۔

آیت کریمہ کا شان نزول

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو یہ جواب دیا تھا پس نہ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداری کی درخواست کی اور نہ مدینہ میں مگر بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو بڑا بنا لیں اس کو کون چھوٹا کر سکتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری کی تمنا نہ تھی مگر آپ کی تشریف آوری پر لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سردار بنا لیا۔ تو عبد اللہ بن ابی جہل مرا کہ میری سرداری آپ کی بدولت گئی اور کیوں نہ ہوتی۔

طلعت الشمس ما یغنیک عن زحل

یعنی سورج کے طلوع ہونے سے زحل سے بے پروائی برتی جاتی ہے۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ عبد اللہ بن ابی جہل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وجہ سے سخت حسد تھا اور ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا تو اس واقعہ سے اس کو سخت ناگواری ہوئی کہ شہری لوگوں کے مقابلہ میں ان پر دیسیوں کو اتنی دلیری ہو گئی تو اس نے اپنی جماعت میں کہا کہ تم ہی نے تو ان کو جری کیا۔ تو اب مدینہ چل کر معاملہ کو بدل ڈالو اور اس کی یہ صورت بتلائی کہ جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ پس اس کا پہلا مقولہ ہے کہ ہم الذین یقولون لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ حتی ینفقوا یعنی کچھ خرچ مت کرو رسول اللہ

کے ساتھیوں پر کہ سب متفرق ہو جاویں کیونکہ یہ سب روٹیاں کھانے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور جب یہی نہ رہیں گی تو سب منتشر ہو جاویں گے۔ ایک مقولہ تو یہ تھا اور دوسرا یہ تھا کہ لیخرجن الاعز منها الاذل کہ مدینہ چل کر معزز ذلیل کو نکال دیں گے اور معزز اپنے کو سمجھتے ہیں۔

تو یہ عبداللہ بن ابی نے کہا اور آہستہ اپنی جماعت میں کہا۔ مگر زید بن ارقم نے یہ سن لیا اور جوش بیتابی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً عبداللہ بن ابی کو بلایا اور پوچھا تو اس نے آ کر قسم کھالی کہ غلط ہے میں نے ہرگز نہیں کہا۔ اسی کو تو کہتے ہیں کہ

اذا جاءك المنافقون قالو نشهد انك لرسول الله یعنی جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیشک اللہ کے رسول ہیں۔

زید بن ارقم کے چچا نے ان کو ملامت کی کہ تم کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا۔ یہ مارے رنج کے گھر میں بیٹھ رہے کہ اب کیا منہ دکھلاؤں۔ اللہ اکبر کیا غیرت تھی حق تعالیٰ کو ان کی یہ حالت رنج کی گوارا نہ ہوئی اور اس وجہ سے یہ سورت نازل فرمائی۔ حالانکہ صرف ایک شخص کا قصہ تھا مگر مقبول ہونا یہ ہے کہ ایک شخص کے لئے ایک سورت نازل فرمائی جو کہ قیامت تک کے لئے نمازوں میں پڑھی جاوے گی اور عبداللہ بن ابی کا وہ مقولہ بالتصریح (ظاہر طور سے) نقل فرمایا کہ اس نے ضرور یہ کہا ہے تا کہ زید بن ارقم کی راست بیانی اچھی طرح ثابت ہو جاوے۔ چنانچہ یہاں اس قصہ سے مقصود ایک علم ہے جو ساتھ ہی مذکور ہے۔ چنانچہ منافقین کے پہلے مقولہ کے ساتھ فرمایا کہ ولله خزائن السموات والارض کہ حق تعالیٰ ہی کے لئے سب خزانے آسمانوں اور زمین کے ہیں۔

اور ان کے دوسرے مقولہ کے ساتھ فرمایا۔ ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين کہ عزت تو اصل میں حق تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کی ہے۔ ان دونوں آیتوں کے مضمون میں غور کرنے سے مفہوم ہوگا کہ مقصود کیا ہے۔

منافقین کے دعویٰ مال و عزت کی تردید

تو پہلی آیت میں تو مقصود ہے مال کے ایک اثر کو بیان کرنا اور پھر اس کو رد کرنا اور دوسری آیت میں مقصود ہے عزت کے اثر کو بیان کرنا اور پھر اس کو رد کرنا۔ کیونکہ پہلی آیت میں منافقین کو مال کا دعویٰ تھا حق تعالیٰ نے اس کو رد فرمایا کہ منافقین مال کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کا دعویٰ غلط ہے کیونکہ آسمان و زمین کے سارے خزانے تو حق تعالیٰ کے پاس ہیں۔ اور دوسری آیت میں منافقین کو عزت کا دعویٰ تھا وہ اپنے آپ کو معزز خیال کر کے کہتے تھے کہ لیخرجن الاعز منها الاذل یعنی مدینہ چل کر معزز ذلیل کو نکال دیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس کو بھی رد فرمایا کہ عزت تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے ہے تو خلاصہ ان دونوں آیتوں کے مضمون کا یہ ہوا کہ ایک آیت یعنی پہلی مال کے متعلق ہے اور دوسری جاہ کے متعلق ہے۔

محبوب ترین چیزیں

تو دنیا میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں مال اور جاہ اور یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ہر ایک کو محبوب ہیں۔ چنانچہ کیسا جو ہر ایک کو ایسی محبوب ہے کہ اگر کسی کو بتلائی جاوے تو اہل اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں کہ اس سے انکار کرے۔ تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اس میں مال و جاہ دونوں جمع ہیں اور اس کے سوا دنیا میں بہت کم ذرائع ایسے ہیں کہ اس میں مال اور جاہ دونوں جمع ہوں۔ اکثر جاہ بدوں مال کے تلف کئے ہوئے نہیں ملتا اور اس میں مال و جاہ دونوں جمع ہیں۔ اس لئے یہ اس درجہ کی محبوب ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ دونوں چیزیں نہایت ہی محبوب ہیں اور انہیں کا نام دنیا بھی ہے۔ تو اب میرا یہ کہنا کہ دنیا مطلوب ہے یا نہیں اس میں مال و جاہ دونوں آگئے تو اب دنیا سے مراد ان دونوں کا مجموعہ ہوگا۔ پس حاصل یہ ہوا کہ مال و جاہ مطلوب ہیں یا نہیں حق تعالیٰ نے اس کا فیصلہ ان آیات میں فرمایا ہے پس منافقین کے اول مقولہ کے بعد فرماتے ہیں۔ ولله خزائن السموات والارض یعنی اللہ ہی کے ہیں تمام خزانے آسمانوں کے اور زمینوں کے۔

اس سے تو احکام مال کے بتلانا مقصود ہیں۔ اور دوسرے مقولہ کے بعد فرماتے ہیں ولله العزة ولرسوله وللمؤمنین یعنی اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی۔ اس سے احکام جاہ کے بتلانا مقصود ہیں۔

پس اب اس میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سو غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ مال فی نفسہ محمود ہے دوسرے یہ کہ مال سے اگر کوئی مفسدہ مرتب ہونے لگے تو مذموم ہے۔ مال کافی نفسہ محمود ہوتا تو اس لئے معلوم ہوا کہ اپنے کو مالک الاموال (سب مالوں کا مالک) فرما رہے ہیں چنانچہ ارشاد ہے ولله خزائن السموات والارض یعنی آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کی ملک میں ہیں۔ پس اگر مال فی نفسہ کوئی بری اور معیوب چیز ہوتی تو جس طرح سے مخصوص کے ساتھ اپنے کو خالق الکلاب والخنزیر نہیں فرمایا اسی طرح اپنے کو مخصوص کے ساتھ مالک الخزائن (خزانوں کے مالک) نہ فرماتے۔ اور اس میں نقد عروض (روپیہ و اسباب) سب داخل ہو گئے اور مال کا باعتبار عارض کے مذموم ہونا اس سے معلوم ہوا کہ مال سے ان کو یہ ضرر ہوا کہ انہوں نے اس کو بے موقع استعمال کیا۔ چنانچہ کہا کہ لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوں ان پر کچھ مت خرچ کرو۔

سواپنے تمول کو وہ اس طرح کام میں لائے کہ مسلمانوں پر خرچ کرنا موقوف کر دیا جس سے ان کو تکلیف پہنچی۔ تو یہ سوء (برا) استعمال ہو مال کا پس حق تعالیٰ نے اس پر رد فرمایا کہ تم کیا چیز ہو۔ خزانے تو سارے ہمارے پاس ہیں پس ان کی یہ مذمت سوء استعمال کی وجہ سے کی گئی پس اس سے دوسری بات بھی ثابت ہو گئی کہ جب مال کے ساتھ سوء استعمال ہو تو وہ مذموم ہے اسی طرح دوسرے مقولہ کے بعد فرمایا وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ یعنی عزت اللہ ہی کی ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مسلمانوں کی۔ تو یہاں بھی بتلادیا کہ جاہ فی نفسہ مذموم نہیں مگر سوء استعمال کی وجہ سے مذموم ہو جاتا ہے۔ پس اس سے بھی دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جاہ فی نفسہ محمود ہے دوسرے یہ کہ جب سوء استعمال ہو تو مذموم ہے جاہ کافی نفسہ محمود ہونا تو اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے وَاللّٰهِ الْعِزَّةُ - لآیہ فرمایا تو اپنے لئے عزت ثابت فرمائی۔ اگر جاہ کوئی بری چیز ہوتی تو اپنے لئے ثابت نہ فرماتے۔

اب اگر یہ شبہ ہو کہ جاہ اچھی چیز تو ہے لیکن یہ ممکنات کے لئے نہیں بلکہ حق تعالیٰ کے لئے ہے تو سمجھو کہ آگے وَلِلْمُؤْمِنِينَ (اور مسلمانوں کی) بھی تو ہے تو پس مسلمانوں کا ذی عزت ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے تو یہ شبہ نہ رہا کہ شاید ممکنات کے لئے محمود نہ ہو اور جاہ کا مذموم ہونا اس سے معلوم ہوا کہ ساتھ ہی ساتھ منافقین کی اس بات پر مذمت بھی فرمائی ہے کہ انہوں نے اس کا بے موقع استعمال کیا چنانچہ انہوں نے کہا کہ لیسخر جن الاعز منها الاذل یعنی جو عزت والا ہے وہ مدینہ سے ذلت والے کو نکال دے گا۔

تو ان کا یہ کہنا سوء استعمال ہو جاہ کا کہ ذریعہ بنایا جاہ کو مسلمانوں کے ضرر کا۔ اس پر حق تعالیٰ نے رد فرمایا کہ تم ہو کیا چیز معزز تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم و مسلمان ہیں۔ پس ان کی یہ مذمت سوء استعمال کی وجہ سے کی گئی۔ پس ان دونوں آیتوں سے چار مسئلے ثابت ہوئے۔

ایک یہ کہ مال اچھی چیز ہے۔

دوسرا یہ کہ جاہ اچھی چیز ہے۔

تیسرا یہ کہ مال کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

چوتھا یہ کہ جاہ کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

حقیقت حب

ایک تو ہے مال اور ایک ہے حب مال اسی طرح ایک ہے جاہ اور ایک ہے حب جاہ۔ تو مذمت مال کی نہیں ہے بلکہ حب مال کی ہے۔ جس سے برے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ تو مذموم دو چیزیں ہوئیں حب مال اور

حب جاہ باقی رہے مال اور جاہ سو یہ دونوں مذموم نہیں کیونکہ حق تعالیٰ امتنان (نعمت دینا) کے طور پر فرماتے ہیں ان الذین امنوا و عملوا الصلحت سیجعل لهم الرحمن ودا کہ ہم مومنین اہل عمل صالح کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے اور محبوبیت ہی کا نام جاہ ہے۔ لوگ جاہ کے معنی بھی غلط سمجھتے ہیں کہ لوگ ہمارے خوف کی وجہ سے ہماری تعظیم کریں حالانکہ جاہ کی حقیقت ہے ملک القلوب (یعنی دلوں کا مالک ہونا) پس ملک المال (مال کا مالک ہونا) تو تمہول ہے اور ملک القلوب (دلوں کا مالک ہونا) جاہ ہے اور خوف اور ہیبت ہو تو وہ صورت جاہ ہے حقیقت جاہ نہیں اور یہ خود ہی اپنے کو معزز سمجھتے ہیں ورنہ لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی ان کی عزت نہیں ہوتی چنانچہ ان کے پیچھے لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ بعضے لوگ اپنی نظر میں برے ہوتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کلاب اور خنازیر (کتے اور سور) سے بدتر ہوتے ہیں اور ان کے سامنے خوف کی وجہ سے لوگ تعظیم کرتے ہیں۔ تو یہ کوئی عزت نہیں ہے کیونکہ ایسی عزت تو سانپ کی بھی ہے تو جسموں کا شاہ ہونا جاہ نہیں ہے بلکہ دلوں کا شاہ ہونا جاہ ہے اور یہ بات محبوبیت سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ پس محبوبیت ہی اعلیٰ درجہ کی جاہ ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں سیجعل لهم الرحمن ودا اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ جاہ بری چیز نہیں بلکہ یہ تو اچھی چیز ہے کہ حق تعالیٰ بطور امتنان (نعمت) اپنے صالح بندوں کو عنایت فرمانا بتلا رہے ہیں اسی طرح مال کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ نعم المال الصالح للرجال الصالح نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے۔

پس مال اور جاہ مذموم خود نہیں ہیں بلکہ مذموم حب مال اور حب جاہ ہیں۔ جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ما ذنبان جانعان ارسلنا فی غنم بافسد لها من حب المال والشرف لدين المرء یعنی حب مال اور حب شرف آدمی کے دین کو ایسا تباہ کرتی ہے کہ اگر دو بھیڑیے بھوکے بھی بکریوں کے گلے میں چھوڑ دیئے جاویں تو وہ بھی بکریوں کو اس قدر تباہ نہیں کر سکتے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حب کا لفظ تصریحاً فرما دیا تو حب بری چیز ہے اب جہاں مال کی مذمت آوے اور اس کے ساتھ حب کی قید نہ ہو تو سمجھ لیں کہ اس سے مراد وہی حب کا درجہ ہوگا کیونکہ بعض قرآن ایسے موجود ہیں جن سے وہ قید معلوم ہو جاتی ہے اور اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تو چونکہ غالب عادت یہی ہے کہ جب مال ہوتا ہے تو حب مال بھی ہوتی ہے پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ مال سے مراد وہی ہے جو حب کے درجے میں ہو۔

حب کے دو درجے قرار دیئے اس میں سے صرف ایک درجہ کی ممانعت کی اور دوسرے درجہ کی ممانعت نہیں کی اور یہ ایک آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے وہ آیت یہ ہے قل ان كان آباؤكم و ابناءؤكم

واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم و اموال واقترفتموها وتجارة تخشون کسادها ومسکن
ترضونها احب الیکم من الله ورسوله و جهاد فی سبیلہ (یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ
دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور وہ تجارت جس میں نکاحی
نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس
کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب بھیج دیں)

حاصل یہ ہے کہ اگر دنیا کی چیزیں اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے احکام سے زیادہ محبوب ہوں
تو عذاب کیلئے تیار ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان چیزوں کی احب ہونے پر وعید فرمائی اور محبوب
ہونے پر نہیں فرمائی پس اس سے معلوم ہوا کہ نفس محبوبیت بھی مذموم نہیں ہے اور اس سے اس حب دنیا کی بھی
تفسیر کر دی جس کی حدیث حب الدنیا راس کل خطیئة (یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے)
وغیرہ میں مذمت فرمائی ہے کہ اس سے مراد اجنبیت (زیادہ محبوب ہونا) کا درجہ ہے اس آیت میں تو یہ بات
مصرح ہے کہ نفس حب مذموم نہیں اور ایک دوسری آیت سے بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو استنباط
کیا ہے وہ یہ ہے زین للناس حب الشهوات من النساء والبنین والقناطر المقنطرة من
الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث ذلك متاع الحیوة الدنیا واللہ عنده
حسن المآب (یعنی خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے لگے
ہوئے ڈھیر ہوئے سونے چاندی کے نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی یہ
دنیاوی زندگی کی استعمال کی چیزیں ہیں اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ حضرت عمرؓ کے پاس جب
سامان کسریٰ کا آیا تو کروڑوں روپے کا سامان تھا آپ نے دیکھ کر یہ آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ
لوگوں کے دلوں میں ان چیزوں کی محبت مزین کر دی گئی ہے یعنی محبت ان کی طبعی امر ہے اور یہ سب حیات دنیا
کا سامان ہے سو دنیا کی محبت کو امر طبعی فرمایا۔ بس حضرت عمرؓ نے اس آیت کو پڑھ کر یہ دعا کی کہ اے اللہ اس پر تو
ہم قادر نہیں کہ دنیا کی محبت نہ رہے کیونکہ وہ امر طبعی ہے لیکن اے اللہ ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ یہ محبت آپ
کی محبت کی معین ہو جاوے مزام نہ ہو۔ پس اس میں فیصلہ کر دیا کہ اجنبیت (زیادہ محبوب ہونا) مذموم ہے نہ کہ
نفس محبوبیت اور اجنبیت کی تفسیر بھی کر دی کہ جو تیری محبت کے معارض ہو پس نتیجہ یہ نکلا کہ مال بھی اچھا اس کا
کمانا بھی اچھا اس کی محبت بھی اچھی اسی طرح جاہ بھی مگر ان کی اجنبیت بری ہے۔ یعنی دنیا کو خدا اور رسول صلی اللہ
علیہ وسلم سے زیادہ محبوب نہ سمجھو اور اس کی علامت یہ ہے کہ دین پر دنیا کو ترجیح نہ دو اگر کسی صورت میں دنیا کے
حاصل کرنے سے دین کا کوئی حرج ہوتا ہو اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہوتا ہو تو اس

صورت کو چھوڑ دو چاہے دنیا کا کتنا ہی نقصان ہو کیونکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی حقیقت کیا ہے یہی تو ہے کہ ہر فعل و ہر قول میں اس کی خوشی کو مقدم اور مطلوب سمجھیں اور اس کا نام محبت نہیں ہے کہ کسی مضمون کو سن کر رونے لگے۔ صرف رونے سے کیا ہوتا ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدی وصال صد سال سے تو اں بہت نا گریستن

مال و جاہ سے متعلق عجیب تفسیری نکتہ

صرف آیت کے بعض اجزاء کا حل رہ گیا ہے وہ بھی عرض کرتا ہوں کہ مال کے قصہ میں تو منافقین کے ان اقوال کے جواب کے ختم میں لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ حتی ینفصوا (یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہیں ان پر مت خرچ کرو یہاں تک کہ وہ آپ منتشر ہو جائیں گے) لا یفقیہون (وہ سمجھتے نہیں ہیں) فرمایا اور آگے جاہ کے قصہ میں ان کے جواب کے خاتمہ میں لا یعلمون (وہ جانتے نہیں ہیں) فرمایا اس میں ایک نکتہ ہے کہ فقہ خاص ہے علم سے فقہ تو خاص ہے امور خفیہ کے ساتھ اور علم عام ہے جلی کے لئے بھی پس اب اس کی وجہ سمجھ میں آگئی ہوگی کیونکہ مال کے قصہ میں ارشاد فرمایا ہے وللسہ خزائن السموات والارض یعنی آسمان اور زمین کے تمام خزانے خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں سو اس کے لئے تو سمجھ کی ضرورت ہے کیونکہ بظاہر تو وہ ہمارے ہاتھوں میں ہے پس یہاں تامل کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر ہمارے ہاتھوں میں ہونے کے اسباب کس کے ہاتھ میں ہیں پس چونکہ یہ ذرا خفی اور استدلال کا محتاج تھا اس لئے یہاں لا یفقیہون فرمایا اور جاہ کے قصہ میں ارشاد فرمایا ہے ولله العزة و لرسوله و للمؤمنین (یعنی عزت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین ہی کیلئے ہے) اور یہ بالکل ظاہر تھا خدا تعالیٰ کے لئے عزت ہونا تو اس لئے کہ عالم کے اندر جو تصرفات ہوتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہمارے اختیار میں نہیں مثلاً زلزلہ ہے اور بارش ہے اب اگر کہئے کہ یہ سب کچھ صورت نوعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس بات کو تو وہ خود ہی تسلیم کرتے ہیں کہ طبیعت اور نیچر ذی شعور نہیں تو میں کہتا ہوں کہ طبیعت کو قائل قرار دینے کی مثال ایسی ہوگی جیسے کہ دو شخصوں نے ایک خوبصورت گھڑی دیکھی اس پر تو دونوں کو اتفاق ہوا کہ اس کو کسی نے بنایا ہے لیکن اس میں اختلاف ہوا کہ کس نے بنایا ہے ایک نے تو یہ کہا کہ ایک بالکل اندھے لٹے لٹکڑے بے شعور نے بنایا ہے اور ایک نے یہ کہا کہ کسی بڑے عقلمند اور کامل گھڑی ساز نے بنایا ہے تو ظاہر بات ہے کہ یہ دوسرا شخص حق کہتا ہے تو جیسا ان دونوں میں فرق ہے ایسا ہی مسلمان اور اہل سائنس میں فرق ہے کہ اہل اسلام تو ان تمام مصنوعات عجیبہ کا اللہ تعالیٰ کو قائل کہتے ہیں اور اہل سائنس طبیعت کو جس کو کچھ شعور تک بھی نہیں وہ

خدا کے قائل نہیں اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہم خدا کے بھی قائل ہیں اور طبیعت کے بھی تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا تعالیٰ کو فاعل مانتے ہیں تو اس کے ساتھ طبیعت کے فاعل ماننے کی ضرورت ہی نہیں ورنہ اس کی مثال ایسی ہوگی کہ کوئی کہے کہ اس گھڑی کو ایک کامل اور ایک اندھے نے مل کر بنایا ہے تو اس احمق سے کہا جاوے گا کہ کامل کے ساتھ اس اندھے کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پس ایک شخص جمع نہیں کر سکتا خدا اور سائنس کو پس خدا کا غلبہ تو اس سے ثابت ہو گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سے ظاہر ہے باقی وللمؤمنین یعنی مؤمنین کا غلبہ تو اس کا جب چاہے تجربہ کر لیجئے کہ جتنا ایمان ہوگا اتنی ہی عزت بھی ہوگی۔ چنانچہ صحابہ کرام اس کا نمونہ ہیں۔ ان کے ایمان کی حالت تو یہ تھی کہ حق تعالیٰ ان کے حق میں ارشاد فرماتے ہیں - الذین ان مکنہم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ (یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں) اور ان کے غلبہ کی یہ حالت تھی کہ تمام قومیں اس کی قائل ہیں کہ ان کی برابر کوئی قوم ترقی یافتہ نہیں ہوئی اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ نمونے بہت پرانے ہو گئے ہیں تو اب بھی دیکھ لیجئے کہ جو مسلمان اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں ان کی کتنی عزت ہے خیر خواہان ترقی کی نگاہ میں بھی وہ مخفی نہیں ہے اور وجہ یہ ہے کہ اصل تو خدا کی عزت ہے پھر جو لوگ ان کے ساتھ وابستہ ہوں گے ان کی بھی عزت ضرور ہوگی ہاں اگر کسی کو خدا ہی کی عزت کی خبر نہ ہو تو دوسری بات ہے۔

مال و جاہ کا حکم

تو خلاصہ یہ ہوا کہ مالک الاموال ہونا چونکہ کسی قدر مخفی تھا اس لئے وہاں لایفقہون (وہ سمجھتے نہیں) فرمایا اور صاحب عزت ہونا ظاہر تھا اس لئے وہاں لایعلمون (وہ جانتے نہیں) فرمایا نیز اس سے ایک اور مسئلہ ثابت ہوا کہ مال تو اس واسطے ہے کہ اس سے انتفاع حاصل کیا جاوے اور جاہ اس واسطے ہے کہ اس کے ذریعہ سے اپنے کو صبر سے بچایا جاوے نہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں پر دباؤ ڈال کر انتفاع حاصل کیا جاوے اول کی تو یہ دلیل ہے کہ جب منافقین نے کہا کہ مسلمانوں پر خرچ مت کرو تا کہ جب کھانے کو نہ ملے گا خود منتشر ہو جاویں گے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ رد فرمایا کہ خزانہ کے مالک تو ہم ہیں تم اپنے مالوں سے ان کو مستضع نہ کرو گے تو ہم اپنے خزانہ سے ان کو دیں گے تا کہ وہ اس سے مستضع ہوں اس سے معلوم ہو گیا کہ مال انتفاع کے لئے ہے اور دوسری تردید کی یہ دلیل ہے کہ منافقین نے اپنے جاہ سے مسلمانوں کو ضرر پہنچانا چاہا تھا تو حق تعالیٰ نے اس پر رد فرمایا کہ عزت تو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کے لئے ہے۔ یعنی چونکہ ہم نے ان کو جاہ عنایت کی ہے اس لئے تم ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتے مؤمنین اس جاہ سے تمہارے ضرر کو دفع کر

دیں گے اس سے ثابت ہوا کہ جاہ دفع ضرر کے لئے ہے (المال والجاہ)

مناط عزت صرف مسلمان کو حاصل ہے

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين سے کہاں کی عزت مراد ہے اور کیا اس کا مفہوم سابقین ہی پر ختم ہو گیا فرمایا کہ مناط عزت تو مسلمان ہی کو حاصل ہے اور وہ عزت آخرت کی ہے اس لئے کہ یہاں پر تو خلاف کا وقوع بھی ہوتا رہتا ہے جس عزت کو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں وہ عزت آخرت ہی کی ہے کہ وہاں کمال عزت کا درجہ مسلمانوں ہی کو عطا فرمایا جاوے گا اور کفار کو انتہائی ذلت کا سامنا ہوگا۔ (ملفوظات جلد ۱)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ

ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اے ایمان والو تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پاویں اور جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں۔

تفسیری نکات

معصیت کا سبب اکثر مال و اولاد کا تعلق ہوتا ہے

اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے مسلمانوں کو مال و اولاد کی وجہ سے غفلت میں پڑ جانے سے منع فرمایا ہے اور اس بات پر آگاہ فرمایا ہے کہ جو لوگ ان چیزوں کی وجہ سے غفلت میں پڑ جائیں گے وہ خسارہ میں ہیں۔ اب آپ اپنی حالت میں غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ معصیت کا زیادہ سبب اکثر مال و اولاد ہی کا تعلق ہوتا ہے حق تعالیٰ اسی سے روکتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ مال و اولاد تمہارے لئے ذکر اللہ سے غفلت کا سبب ہو جاویں۔

یہاں ذکر اللہ سے مراد طاعت اللہ ہے چونکہ طاعات کی وضع ذکر اللہ ہی کے لئے ہے اس لئے ذکر بول کر طاعت مراد لی جاتی ہے (اور کنایہ میں نکتہ یہ ہے کہ جس طرح معصیت کا سبب غفلت ہے جس پر لا تلہکم میں دلالت ہے اور غفلت کا سبب دنیا کے ساتھ قلب کا تعلق ہوتا ہے جس پر اموالکم و اولادکم دلالت کر رہا ہے۔ جس سے مراد مجموعہ دنیا ہے اور ان دونوں کی تخصیص لفظی کی یہ وجہ ہے کہ یہ دونوں دنیا کے اعظم افراد ہیں

اسی طرح طاعت کی بجائے ذکر اللہ کہنے میں اس پر دلالت ہے کہ طاعات کا سبب غفلت کا مقابل ہے یعنی ذکر اور ذکر کا سبب خدا کے ساتھ دل کا متعلق ہونا ہے جس پر اضافت ذکر الی اللہ سے دلالت ہو رہی ہے) تو اس سے یہ بات مفہوم ہوئی ہے کہ مال و اولاد اکثر طاعت سے غفلت کا سبب ہوا کرتے ہیں۔ اور جب طاعت سے غفلت ہوگی تو وہ معصیت ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معصیت کا زیادہ سبب مال و اولاد کا تعلق ہے اور جب یہ زیادہ تر معصیت کا سبب تھے جیسی تو حق تعالیٰ نے ان کی وجہ سے غفلت میں پڑنے کی ممانعت فرمائی کیونکہ حق تعالیٰ حکیم ہیں اور حکیم کا کوئی کلام حشو و زائد نہیں ہوتا۔ پس دنیا بھر کی چیزوں میں سے اموال و اولاد کو خاص طور پر ذکر فرمانا اس کی صاف دلیل ہے کہ ان دونوں کو غفلت عن الطاعات یعنی صدور معاصی میں زیادہ دخل ہے۔

تو حق تعالیٰ کا اموال و اولاد کی وجہ سے غفلت میں پڑنے کی ممانعت فرمانا ہی اس کی دلیل ہے کہ یہ زیادہ تر معصیت کا سبب ہوتے ہیں خود کلام اللہ بھی اس کو بتلا رہا ہے اور مشاہدہ بھی چنانچہ اپنی حالت میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مال و اولاد کی وجہ سے کتنے گناہ ہوتے ہیں۔

مال و اولاد کے درجے

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مال میں عمل کے دو مرتبے ہیں۔ ایک درجہ حاصل کرنے کا اور ایک اس کو محفوظ رکھنے کا اسی طرح اولاد میں بھی یہ دو مرتبے ہیں ایک اولاد حاصل کرنے کا دوسرے ان کی حفاظت کا اور ایک تیسرا مرتبہ اور ہے لیکن یہ مرتبہ اموال و اولاد میں دونوں کے لئے جدا جدا ہے پہلے دو مرتبوں کی طرح مشترک نہیں ہے چنانچہ مال میں تو تیسرا مرتبہ صرف کرنے کا ہے اور اولاد میں تیسرا مرتبہ ان کے لئے آئندہ کی فکر کرنے کا ہے۔

غرض تین درجے عمل کے مال میں ہیں اور تین درجے اولاد میں ہیں۔ مال میں تو تین عمل یہ ہیں۔

۱۔ مال کا پیدا کرنا۔ ۲۔ مال کی حفاظت کرنا۔ ۳۔ مال کا صرف کرنا۔

اور اولاد میں تین درجے عمل کے یہ ہیں۔

۱۔ اولاد کا حاصل کرنا ۲۔ پھر اس کی حفاظت کرنا۔ ۳۔ پھر اس کے لئے آئندہ کی فکر کرنا۔

تو کل چھ مرتبے ہوئے جو کہ حقیقت میں اعمال کے درجے ہیں اب ان چھ مرتبوں میں بہت مختصر انداز سے اپنی حالت کو دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ہمارا برتاؤ کیا ہے اور ان میں ہم کتنے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مثلاً مال میں تین مرتبے تھے ایک حاصل کرنا دوسرے حفاظت کرنا تیسرے صرف کرنا اب دیکھئے یہ مال کتنے ناچ نچاتا ہے۔

اہل خسارہ

یہاں کیا اچھا لفظ ارشاد فرمایا ہے فاولئک ہم الخسرون جس میں جیسا کہ ابھی مذکور ہوتا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ ایسا شخص نفع کی چیز میں ٹوٹا اٹھانے والا ہوگا۔ جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ مال و اولاد فی نفسہ ضرر کی چیز نہیں بلکہ اگر معصیت کا سبب نہ بنے تو واقع میں نفع کی چیز ہے اور یہ اشارہ اس وجہ سے ہے کہ خسارہ مطلق نقصان کو نہیں کہتے بلکہ نفع کی چیز میں نقصان کو خسارہ کہا کرتے ہیں۔ بہر حال ایسے لوگ خسارہ میں ہیں اور زیاں کار ہیں۔

اطلاق خسارہ سے اس پر بھی دلالت ہے کہ صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی یہ لوگ خسارہ ہی کے اندر ہیں کیونکہ مال و اولاد کی ایسی محبت و بال جان ہو جاتی ہے اور مال و اولاد ایسے ہی شخص کے لئے معصیت کا سبب ہو جاتے ہیں جس کو ان سے ایسی محبت ہو سو محبت مال کا وبال جان ہونا تو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کو اسی کی فکر رہتی ہے کہ آج اتنے روپے ہیں تو کل کو اتنے ہو جائیں۔ چنانچہ اپنی جان پر مصیبت ڈال ڈال کر روپیہ جوڑا جاتا ہے پھر رات کو اسے بار بار دیکھا جاتا ہے کہ اپنی جگہ پر ہے بھی یا نہیں چوروں کے کھٹکے سے راتوں کی نینداڑ جاتی ہے اور اولاد کا وبال جان ہونا آپ کو اس حکایت سے معلوم ہو جائے گا کہ میں نے ایک والی ملک کی بیٹی کو دیکھا ہے کہ ان کو اپنے بیٹوں سے اس قدر محبت تھی کہ رات کو وہ سب کو ساتھ لے کر لیتی تھیں۔ جدا کر کے ان کو چین ہی نہ آتا تھا پھر جب بچے زیادہ ہو گئے اور ایک پلنگ پر نہ آسکے تو انہوں نے پلنگ پر سونا چھوڑ دیا سب کو لے کر نیچے زمین کے فرش پر سویا کرتی تھیں اور اس پر بھی اعتبار نہ آیا بلکہ کسی پر ہاتھ رکھ لیتیں اور کسی پر پیر اور رات کو بار بار آنکھ کھلتی اور بچوں کو شول کر دیکھ لیا کرتیں۔

واقعی یہ محبت تو عذاب ہی ہے پھر اگر ایمان بھی نہ ہو تو دونوں عالم میں معذب ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولا تعجبک اموالہم ولا اولادہم انما یرید اللہ ان یعذبہم بہا فی الدنیا و تزہق انفسہم و ہم کافرون کیونکہ ان کو نہ دنیا میں چین ملانے آخرت میں اور اگر ایمان ہو تو خیر دنیا ہی بے لذت ہوئی آخرت انجام کار ان شاء اللہ پر لطف ہو جائے گی۔ غرض ثابت ہو گیا کہ محبت مال و اولاد کبھی معصیت کا سبب ہو جاتی ہے اور اس سے دنیا و آخرت دونوں کا خسارہ ہو جاتا ہے خواہ خسارہ محدود ہو یا غیر محدود البتہ جو لوگ اعتدال کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور حقوق الہیہ کو غالب رکھتے ہیں ضائع نہیں کرتے وہ ہر وقت لطف میں ہیں بس اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ ہم کو اپنی یاد سے غافل نہ فرمائیں اور مال و اولاد کو ہمارے لئے سبب فتنہ نہ بنائیں۔ آمین۔

وَأَنْفِقُوا مِنْ تَمَارِزِقْنَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَقْتُ وَأَكُنُ
مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا
وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ: اور (مجملہ طاعات کے ایک طاعت مالیہ کا حکم کیا جاتا ہے) کہ ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے (حقوق واجبہ) اس سے پہلے پہلے خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کی موت آکھڑی ہو پھر وہ بطور (تمنا و حسرت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو تھوڑے دنوں کیوں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا۔ اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبکہ اس کی میعاد (عمر کی ختم ہونے پر) آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور اللہ کو سب کاموں کی پوری خبر ہے ایسی ہی جزا کے مستحق ہوں گے۔

تفسیری نکات

حب دنیا کا علاج

اوردیکھئے خدا تعالیٰ نے ہمارا زقنکم فرمایا کہ بتلادیا کہ ہم نے ہی تو دیا ہے پھر بخل کیوں کرتے ہو نیز لفظ من تبغیضہ فرما کر یہ بھی تسلی فرمادی کہ ہم سب سارا مال نہیں مانتے۔ آگے فرماتے ہیں من قبل ان یاتئ احدکم الموت (اس سے پہلے کہ تمہیں موت آجائے) یہ وہ تعلیم ہے کہ اگر روز پندرہ بیس منٹ بھی اس کو سوچ لیں تو دنیا کی محبت بالکل جاتی رہے یعنی یہ سوچ لیا کریں کہ ایک دن ہم کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد ہم سے ہر بات کے متعلق ایک دن سوال ہوگا۔ میزان عدل قائم کی جائے گی اگر ہماری نیکیاں غالب آگئیں تو فیہا ورنہ قعر جہنم ہے اور ہم ہیں اور وہاں یہ حالت ہوگی لا یموت فیہا ولا یحیی (نہ تو موت ہی ہونہ کچھ زندگی) آگے فرماتے ہیں کہ اگر خرچ نہ کرو گے تو یہ کہو گے لولا اخرتئی الی اجل قریب فاصدق و اکن من الصالحین اگر مجھے تھوڑی سی مہلت دیدی جاتی تو میں خوب خیرات کرتا اور اچھے لوگوں میں سے ہو جاتا) دوسری آیت اس طلب مہلت کے جواب میں ہے کہ ولن یؤخر اللہ نفساً اذا جاء اجلها یعنی جب موت کا

وقت آجائے گا تو ہرگز مہلت نہ ملے گی اس کے بعد غفلت پر وعید ہے۔ واللہ خبیر بما تعملون لفظ خبیر فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو دل تک کی خبر ہے اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ دین یہ ہے کہ باطن بھی درست کرو حاصل یہ ہے کہ آیات میں ہم کو حب دنیا کے مرض پر جتایا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ۔

غم دیں خور کہ غم غم دین ست ہمہ غمہا فرو تراز ایں ست

(دین کی فکر میں رہو کیونکہ اصل فکر دین ہی کی فکر ہے اور تمام فکریں اس سے کم درجہ کی ہیں)

خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل بخشیں (اس وعظ میں حضرت حکیم الامت دینی مدرسہ قائم کرنے یا کسی عالم واعظ کو احکام مسائل ہفتہ وار بیان کرنے کے لئے تعینات کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس عالم واعظ کی تنخواہ مقرر کر کے دینا وانفقوا میں داخل ہے۔

سُورَةُ التَّغَابُنِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِیْبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ

تَرْجَمَةٌ: کوئی مصیبت بدون حکم خدا کے نہیں آتی۔

تفسیری نکات

دو چیزیں حضرت حق سے مانع ہیں

الحاصل دو چیزیں حضرت حق سے مانع ثابت ہوئیں۔ نعمت اور مصیبت پھر ان کی اور بہت سی جزئیات ہیں۔ پس ان میں سے اہمات جزئیات کی فہرست ان آیات میں ارشاد فرماتے ہیں ارشاد ہے مَا أَصَابَ مِنْ مُصِیْبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ یعنی کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر اللہ کے حکم سے یہ علاج ہے مصیبت کے مانع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم مالک اور محبوب ہیں اور مصیبت ہمارے ہی حکم سے آتی ہے تو تم کو اس پر اعتراض اور چون و چرا کا حق نہیں ہے اگر حق تعالیٰ کی مالکیت اور محبوبیت اور اس کا اعتقاد کہ مصیبت اسی کے حکم سے آتی ہے قلب میں راسخ ہو جاوے تو مصیبت کی شدت الم قلب کو ہرگز از جا رفته نہ کرے گی یہ نسخہ کیمیا کا اثر رکھتا ہے آگے ارشاد ہے وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَاءُ لَعَلَّ یُفْعَلُ یعنی جو شخص اللہ کے ساتھ ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اس علاج کی ہدایت فرماتا ہے۔

یہ جواب ہے ایک سوال کا جو جملہ اولیٰ کو سن کر ناشی ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے علاج تو بتلا دیا اور ہمارا اس پر ایمان بھی ہے کہ مصیبت اسی کے حکم سے آتی ہے لیکن قلب میں اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا تو اس کا جواب ارشاد ہے کہ تمہاری طرف سے ایمان اور ایقان ہونا چاہیے کام تم شروع کرو یعنی یقین پختہ تم کر لو باقی ہدایت اور اثر تو ہم دیں گے۔

اسی طریق پر یہاں ارشاد ہے کہ تم کام کرو جب تم کام کرو گے تو تمہارے قلب کو ہم ہدایت کریں گے۔ آگے ارشاد ہے واللہ بكل شیء علیم ”یعنی اللہ ہر شے کو جانتا ہے“ پس یہ بھی جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں سعی کرنے والا ہے اور کون نہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہیے کہ مریض کو جو مرض پیش آتا ہے اس کا ایک علاج تو خاص اسی مرض کا ہوتا ہے اور اسی کا خاص پرہیز ہوتا ہے، مثلاً مرض اگر غلط سوداء کے سبب سے ہے تو اسی کا خاص علاج اور خاص پرہیز کرایا جاتا ہے کہ نسخہ بھی اسی کا اور جو چیزیں سوداء کے بڑھانے والی ہیں انہی سے بچنا بھی اور ایک عام علاج اور عام پرہیز ہے کہ جس کو تمام امراض میں پیش نظر رکھنا مریض کو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو چیزیں عامۃ مضعف (کمزور کرنے والی) اور کلیۃ منافی طبیعت ہیں ان سے بچنا چاہیے یہاں تک تو حق تعالیٰ نے اس مرض یعنی مصیبت کے مانع عن الطریق (راہ سے روکنے والا) ہونے کا خاص نسخہ کہ جو ایک خاص مراقبہ ہے کہ ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ارشاد فرمایا تھا آگے ایک عام نسخہ کہ جس کا تمام اوقات میں ہر شخص کو التزام کرنا چاہیے ارشاد فرماتے ہیں اس لئے کہ اگر خاص مرض کے لئے خاص نسخہ کا استعمال کیا اور قواعد عامہ صحت کی رعایت نہ رکھی تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع مرتب نہ ہوگا۔

وہ عام علاج یہ ہے کہ جس میں تندرست اور مریض سب شریک ہیں۔ یعنی واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول یعنی ہم نے جو خاص علاج خاص مرض کے لئے تم کو تعلیم کیا ہے اسی پر اکتفا نہ کرو کہ یہ مراقبہ تو کر لیا اور دیگر احکام شرعیہ میں اخلاص کیا، بلکہ اس کے ساتھ اللہ ورسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمام امور میں اطاعت کرو اور یہی وجہ ہے کہ اطیعوا کا متعلق ذکر نہیں فرمایا، جس سے بقاعدہ بلاغت عموم مستفاد ہوتا ہے یعنی اگر تم نے صرف خاص اسی نسخہ کو استعمال کیا اور عام قواعد کی رعایت نہ کی مثلاً احکام کی پابندی نہ کی اور معاصی کا ارتکاب کرتے رہے تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع معتد بہ تم کو نہ ہوگا۔

اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے جس مضمون کو ارشاد فرمایا ہے اس کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔

اصلاح کے لئے علاج ضروری ہے توجہ شیخ کافی نہیں

اس کے بعد سمجھو کہ بعض مریض ایسے ست اور کاہل یا کنجوس یا بد پرہیز ہوتے ہیں کہ طبیب سے نسخہ لکھواتا اور دو آخریدنا پھر اس کو پکا کر پینا اور پرہیز کرنا ان کو نہایت شاق اور پہاڑ معلوم ہوتا ہے ہاں مرض کی شکایت کیا کرتے ہیں اور یہ کہا کرتے ہیں کہ دو ادارو تو صاحب ہم سے ہوتی نہیں، کوئی شخص ایسا ملے کہ چھو کر دے اور مرض جاتا رہے ایسے ہی روحانی مرض کے مریض بھی دیکھے جاتے ہیں بلکہ ایسے لوگ بکثرت ہیں کہ جو مجاہدہ

ریاضت تو اختیار کرتے نہیں ہاں یہ سوچتے ہیں کہ کوئی بزرگ توجہ ڈال دیں اور ہمارا مرض جاتا رہے ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے حالانکہ محض توجہ سے بغیر اپنے کئے کچھ نہیں ہوتا تو ایسے مریضوں کے لئے ارشاد ہے فان تولیتم فانما علی رسولنا البلاغ المبین ” یعنی ہم نے جو تمہارے مرض کا علاج اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ارشاد فرمایا ہے اگر تم اس نسخہ کے استعمال کرنے اور اس کا جو خاص اور عام علاج و پرہیز ہے اس سے اعراض کرو تو یاد رکھو کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ تم کو علی الاعلان دوا اور پرہیز بتلا دیں کہ جو طبیب کا منصب ہے کیا طبیب کا یہ تھوڑا احسان ہے کہ تم کو دیکھ کر وہ دوا بتلا دے اس کے ذمہ یہ نہیں ہے اور نہ اس کے بس میں ہے کہ شفاء اور صحت تمہارے منہ میں زبردستی ٹھونس دے اگر تم کو اپنی صحت مد نظر ہے تو جو دوا بتلائی گئی ہے ہمت سے اس کا استعمال کرو ورنہ تم جانو اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ انبیاء اور اولیاء کی توجہ میں برکت نہیں بیشک برکت ہے لیکن وہ توجہ مشروط ہے اس کے ساتھ کہ تم بھی خود کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ ورنہ محض توجہ موثر نہیں ہوگی اور نہ اس کے متوجہ کرنے کا یہ طریق ہے۔

یہ بیان تو ان لوگوں کا تھا جو کام میں لگے ہی نہیں۔ اب ایک وہ ہیں جو کام کرتے ہیں اور ان کو اس کے کچھ ثمرات بھی حاصل ہوئے مگر ان میں ایک اور مرض پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ جہل اور کمی بصیرت سے یہ سمجھے کہ یہ ثمرات ہمارے کام سے مرتب ہوئے اور اس پر ان کو ایک ناز اور عجب پیدا ہو گیا تو ان کو اس مرض کے دفعیہ کے لئے یہ ارشاد ہے اللہ لا الہ الا هو و علی اللہ فلیتوکل المؤمنون مطلب یہ ہے کہ تم کو حضرت حق اور موجود حقیقی کے سامنے اپنے وجود کا دعویٰ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ ارے یاد رکھو کہ ماسوا اس کے کوئی موجود حقیقی نہیں ہے پس ناز چہ معنی (ناز سے کیا مطلب) مؤمنین کو چاہئے کہ اسی ایک ذات پر بھروسہ رکھیں اور غیر کو کہ جس میں اپنا وجود بھی ہے فانی محض اور ہالک محض سمجھیں نہ کہ اپنے وجود کا دعویٰ کریں تم کچھ بھی نہیں ہو اور نہ کچھ کر سکتے ہو یہ ہمارا ہی کام تھا کہ تم کو کام کی توفیق دی اور اس کے اسباب مہیا کر دیئے اور پھر اس میں کامیابی عطا فرمائی۔

یہاں تک مصیبت کے متعلق بیان تھا جو مانع عن الطریق ہوتی ہے اب دوسرا مانع نعمتہ ہے کہ جو اپنی زیادہ گوارائی کے سبب مانع عن الطریق (راستہ سے روکنے والی) اور ہمارے لئے رہزن بن جاتی ہے آگے اس کے متعلق ارشاد ہے یا ایہا الذین امنوا ان من ازواجکم و اولادکم عدو الکم فاخذروہم ” یعنی اے ایمان والو تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن بھی ہیں تو تم ان سے احتیاط رکھو ایسا نہ ہو کہ یہ تم کو اپنے اندر مشغول کر کے راہ حق سے ہٹادیں اور گونہمتیں تو بہت ہیں لیکن دنیا میں اولاد اور ازواج انسان کو بہت محبوب ہوتی ہیں اس لئے بالخصوص ان کا ذکر فرما کر ان سے تھذیر فرماتے ہیں اور اس آیت میں جو ازواج اور اولاد کو حق تعالیٰ نے مانع عن الطریق فرمایا ہے تو ان کا مانع ہونا دو طریق سے ہے۔

اول طریق تو یہ ہے کہ اولاد اور ازواج ایسی فرمائش کریں کہ جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہیں اور یہ مغلوب ہو کر ان کا ارتکاب کرے دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ تو کچھ نہیں کہتے مگر یہ خود ان کی محبت میں ایسا مستغرق ہے کہ وہ محبت اس کو مانع بن رہی ہے پہلی صورت میں مانعیت اختیاری ہوگی یعنی وہ مانعیت اولاد اور ازواج کے اختیار میں ہے اور دوسری غیر اختیاری ہر چند کہ ظاہر نظر میں یہ جملہ دونوں طریق کو عام معلوم ہوتا ہے لیکن آگے جو ارشاد ہے **وَان تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا وَافَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا** (اگر تم معاف کر دو اور سزا سے درگزر کرو اور ان کا گذشتہ قصور معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے (رحم والا ہے) وہ قرینہ اس کا ہے کہ یہاں مانعیت اختیاری ہی مراد لی جاوے جس پر غصہ متحمل ہونے کے بعد عفو و صفح کی ترغیب واقع ہوئی چنانچہ شان نزول سے بھی اس مراد کی تعیین ہوتی ہے۔

شان نزول

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باہر کے کچھ مسلمان علوم سیکھنے کے لئے آ کر رہنا چاہتے تھے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ جو شخص کسی گھر میں بڑا ہوتا ہے وہ اگر کہیں چلا جاتا ہے تو گھر بے رونق ہو جاتا ہے کبھی بعضی کلفتوں کا بھی خیال ہوا کرتا ہے اس لئے گھر کی بیبیاں بچے یہی چاہا کرتے ہیں کہ یہ کہیں نہ جاویں چنانچہ ان کو بھی اسی طرح روکا مگر بعد چندے جب یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ جو صحابہ ان سے پہلے آئے ہوئے تھے وہ اور مسائل میں بہت دور نکل گئے ان کو بڑی حسرت اور ندامت ہوئی کہ ہم بیوی بچوں ہی میں رہے اور دوسرے لوگ بہت دور نکل گئے اور ہم سے بہت زیادہ بڑھ گئے۔ یہ سوچ کر ان کو اپنی اولاد اور ازواج پر غصہ آیا اور یہ ارادہ کیا کہ گھر جا کر ان کو خوب ماریں گے کہ وہ ہم کو راہ حق سے مانع ہوئے تو جس وقت انہوں نے روکا تھا اس وقت تو جزو اول آیت کا یعنی **فَاَحْذَرُوْهُمْ** (پس ان سے احتیاط رکھو) تک نازل ہوا اور جب انہوں نے ان کے مارنے کوٹنے کا ارادہ کیا تو **وَان تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا** الخ نازل ہوا مطلب یہ ہے کہ اگر تم معاف کر دو اور سزا سے درگزر کرو اور ان کا گذشتہ قصور معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم والا ہے تمہارے گناہ بھی بخش دے گا اور تمہارے حال پر رحم فرمائے گا۔

پس یہ قصہ اور یہ جزو قرینہ اس کا ہے کہ یہاں اختیاری طریق مراد ہے اور دوسری صورت اس سے مستحب ہوتی ہے گو وہ مدلول مطابقی نہیں ہے لیکن مدلول التزامی ضرور ہے یا یوں کہو کہ مدلول نصی نہیں تو مدلول بدلالة النص ضرور ہے اور اس صورت میں ان کو عداکم فرمانا اس معنی کے اعتبار سے ہوگا کہ گو وہ مانعیت اور عداوت

کے مباشر نہیں ہیں لیکن سبب تو ہیں پس ان کو عدو فرمانا جو کہ مشعر زم ہے درجہ سبب میں ہو گا نہ یہ کہ اس عداوت میں عاصی ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص ایک کبوتر کے پیچھے بھاگا جاتا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان يتبع شیطانہ ایک شیطان ایک شیطانہ کے پیچھے جا رہا ہے اس کو شیطانہ اس لئے فرمایا کہ اس کے حق میں تو اس نے شیطان ہی کا کام دیا کہ اس کو ذکر اللہ سے غافل کر دیا پس ایسے ہی وہ اولاد اور ازواج اس محبت کے حق میں بلا قصد عدو بن گئے کہ وہ ان کی محبت میں ایسا منہمک ہوا کہ اپنے اصلی کام کو بھول گیا پس اصل مانع اور مدار منع انہماک فی المحبت (محبت میں منہمک ہونے سے منع) ہوا اور اسی مدار کے اعتبار سے کہ محبوب کو عام ہو سکتا ہے یہ مضمون جیسا کہ اولاد اور ازواج کو شامل ہے غیر اولاد اور غیر ازواج کو بھی جس شے کی محبت میں بھی یہ اپنے مولیٰ کو بھول جاوے عام ہو گیا جس کو صوفیہ نے اس عبارت سے ادا کیا ما شغلك عن الحق فهو طاغوتک ”کہ جو چیز بھی تجھ کو حق سے مانع ہو جاوے تیرا بت ہے حکیم ثانی اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

بہر چہ از دوست و امانی چہ کفر آں حرف و چہ ایمان بہر چہ از یار دور رفتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا
”یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ بھی ہو“

اور اس شعر میں ایمان سے مراد ایمان حقیقی نہیں اس لئے کہ وہ تو عین مطلوب ہے نہ کہ مانع عن المطلوب بلکہ یہ ایسا ہے جیسے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں قل بنسما یا امرکم بہ ایمانکم (بری ہے وہ چیز جس کو تمہارے ایمان حکم دیتے ہیں اور اگر زیادہ کیا جاوے تو یہ مانعیت غیر اختیاری بھی آیت کا مدلول مطابقی بن سکتا ہے تعفوا الخ اس پر بھی منطبق ہو جاوے گا۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جیسے مباشرت مانعیت پر غصہ آتا ہے۔ بسبب مانعیت بھی موجب غیظ ہو جاتا ہے کہ اس شے کی محبت ہم کو ہمارے مقصود میں مانع ہوئی ہے اس کو ہی اڑانا چاہئے باقی رہا شان نزول تو اس کا جواب یہ ہے کہ العبرة لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد (عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ خصوص الفاظ کا پس اس صورت میں آیت مانعیت کی دونوں طریق کو دلالت مطابقی سے شامل ہو جاوے گی اور تعفوا و تصفحوا الخ بھی بلا تکلف دونوں پر منطبق ہو جاوے گا یہ دو طریق تو مانعیت کے ازواج اور اولاد کی حیات میں تھے کہ یا تو اولاد اور ازواج نے اس کو خود روکا تھا یا یہ خود ان کی محبت میں اس قدر مغلوب تھا کہ اللہ کی یاد سے رک گیا تھا تیسری صورت ان کی مانعیت کی ایک اور ہے کہ اولاد یا ازواج مر گئے یہاں مصیبت اور محبت دونوں مانع جمع ہو گئے محبت تو مقتضی ہے یاد کو کہ اس کی وجہ سے یہ سب اشغال سے معطل ہو گیا اور محبوب کے فقدان کے الم کا مصیبت ہونا ظاہر ہی ہے اور وہ بھی شاغل عن الحق (اللہ کے ذکر سے روکنے والا) ہو رہا ہے اور جاننا چاہئے کہ حیات محبوب میں جو مانعیت ہے

اور ممت محبوب میں جو مانعیت ہے یہ دونوں مانع نفس مانعیت میں تو مشترک ہیں لیکن ان میں ایک فرق ہے جس پر نظر کر کے بعد ممت والی مانعیت زیادہ عجیب اور فہم سلیم سے زیادہ بعید ہے وہ یہ کہ محبوب کی حیات کی صورت میں تو فی الجملہ گو حقیقتہً نہ سہی مگر ظاہراً بہ نسبت حالت ممت کے یہ شخص کسی قدر معذور بھی ہے کہ محبوب مجازی کا کچھ قرب ہے کچھ مشاہدہ ہے یا امید مشاہدہ ہے یہ محرک ہو گیا ہے اس کی محبت میں ایسا مبتلا رہنے کا کہ وہ محبت اس کو محبوب حقیقی سے مانع ہو گئی مگر اسکے فقدان و ممت کی صورت میں تو کوئی عذر نہیں ہے اس لئے کہ اس سے مفارقت بھی ہو گئی اور اس کی محبت کا کوئی محرک بھی نہ رہا ادھر دوسرا محبوب یعنی محبوب حقیقی موجود ہے اور اس سے تسلی کرنا ممکن بھی ہے تعجب ہے کہ جو محبوب اس کے پاس موجود ہو اس میں تو مشغول ہو کر تسلی نہ پائے اور محبوب مجازی جو کہ سامنے موجود بھی نہیں اس میں گھلے۔ واقعی یہ شخص معذور نہیں اور یہ ساری خرابی غیر اللہ کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق بڑھانے کی ہے اور یہ محبت بعض مرتبہ شرک کے درجے میں پہنچ جاتی ہے۔

یہ تمام تر کلام محبت کے بارہ میں تھا تیسرا مانع کہ وہ بھی فرد نعمت کا حب مال ہے اس لئے آگے اس کو ارشاد فرماتے ہیں انما اموالکم و اولادکم فتنۃ واللہ عنده اجر عظیم ”یعنی تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں اور اللہ کے نزدیک اجر عظیم ہے“ چونکہ اولاد کا فتنہ زیادہ سخت ہے اس لئے یہاں اس کو مکرر ارشاد فرمایا اور نیز اس لئے کہ اموال کے ساتھ محبت کا ایک منشاء اولاد کی محبت بھی ہے اس لئے بھی اولاد کو مکرر ذکر فرمایا اور مال کی محبت کے بھی دو درجے ہیں ایک تو بضرورت حدود شرعیہ کے اندر یہ مذموم اور مانع نہیں اور ایک وہ محبت جس کے غلبہ میں حقوق شرعی فوت ہوتے ہیں چنانچہ آج کل یہ بلا بھی عام ہے جو کہ حب مال کا شعبہ ہے وہ یہ کہ حقوق العباد میں بہت کوتاہی کرتے ہیں اس زمانہ میں وہ لوگ بڑے باہمت ہیں جو ڈھونڈھ موٹ کر اہل حقوق کو حقوق پہنچاتے ہیں۔

آج کل بڑے بڑے دینداروں کی یہ کیفیت ہے کہ نمازیں بہت پڑھیں گے حتیٰ کہ نوافل اور تسبیح و ذکر و شغل کے پابند لیکن حقوق کے ادا کرنے میں تساہل حتیٰ کہ بعض علماء کا یہ حال ہے کہ کسی مردہ کے ورثاء اس کا مال ان کے مدرسہ یا مسجد میں لا دیں گے تو بے تکلف لے لیتے ہیں نہ اس کی تحقیق کرتے ہیں کہ اس شخص کے کتنے وارث ہیں اور سب کی رضامندی ہے یا نہیں کوئی ان میں نابالغ تو نہیں ہے اس بلا میں باستثناء خاص خاص بندوں کے سب ہی مبتلا ہیں خصوصاً مدارس میں تو اس چندہ کا قصہ بڑا نازک ہے۔

وَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ ۗ

ترجمہ: کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت کر دیتے ہیں۔

تفسیری نکات

ازالہ غم کی ہدایت

یہ تو ترجمہ ہے مگر اصطلاحی لفظوں میں اس کا حاصل یہی ہے کہ تصحیح عقائد سے ہدایت ہو جاتی ہے کیونکہ ایمان کے یہی معنی ہیں اب رہا یہ کہ اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ تصحیح عقائد سے غم زائل ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں ازالہ غم کا کوئی ذکر نہیں صرف ہدایت کا ذکر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ بیشک صرف ہدایت کا ذکر ہے مگر ہدایت کے لئے مفعول کی ضرورت ہے جو اس جملہ میں مذکور نہیں۔ تو سیاق و سباق میں تامل کر کے مفعول مقدر کرنا چاہئے سو اس سے پہلے ارشاد ہے۔ ما اصاب من مصيبة الا باذن اللہ کہ کوئی مصیبت بدوں اذن خداوندی کے نہیں پہنچتی۔ اس کے بعد ہے۔ ومن یؤمن باللہ یهد قلبہ کہ جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اس کے دل کو ہدایت ہو جاتی ہے۔ یعنی اس مضمون سابق کی کہ وہ مسئلہ قدر ہے اس کو ہدایت ہو جاتی ہے اس طرح سے اس کو مسئلہ تقدیر پر جزم و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے یا یوں کہو کہ اس کو ازالہ غم کی ہدایت ہو جاتی ہے کیونکہ ما اصاب من مصيبة الا باذن اللہ کا مضمون ہی ایسا ہے جس کے استحضار سے مصیبت و غم زائل ہو جاتا ہے تو مضمون مذکور اور ازالہ غم کی ہدایت گویا دونوں مترادف ہیں اور اس کی بڑی دلیل مشاہدہ ہے۔ جو لوگ اس مضمون پر جازم و مطمئن ہیں ان کی حالت کو دیکھ لیا جائے کہ وہ مصائب و حوادث میں کیسے مستقل و صابر و شاکر رہتے ہیں۔ غرض تصحیح عقیدہ کو ازالہ غم میں بڑا دخل ہے۔

محل مصائب

مگر ازالہ سے مراد تسہیل و تخفیف ہے اور یہی مطلوب ہے۔ زوال کلی مراد نہیں۔ کیونکہ طبعی غم کا زوال مقصود نہیں بلکہ اس کی خفت مطلوب ہے۔ ہاں اس خفت کے لئے لازم یا مثل لازم کے زوال ہے اور مثل لازم اس لئے کہا کہ بعض ضعیف طبائع کو عمر بھر بھی خفیف سا غم یا کلفت رہتی ہے مگر اس کا ازالہ خود مطلوب ہی نہیں کیونکہ اس سے زیادہ اذیت نہیں ہوتی اور تھوڑی بہت کلفت تو کھانے میں بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے خصوصاً آرام طلب لوگوں کو تو منہ میں لقمہ لے جانا ہی بارگراں ہے۔

یہ تقریر تو اس تقدیر پر تھی کہ یہ دل قلبہ کے لئے مفعول مقدر کیا جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ مقطوع عن المفعول ہو اور معنی یہ ہوں۔ من یومن باللہ یحصل لہ الہدایۃ ای الوصول الی المطلوب کہ جس شخص کے عقائد صحیح ہوں اس کے دل کو ہدایت ہو جاتی ہے یعنی وہ ان مصائب وحوادث کے حکم و اسرار سے باخبر ہوتا ہے اس لئے اس کی مصیبت مصیبت نہیں رہتی کیونکہ کوئی مصیبت اپنی ذات سے مصیبت نہیں بلکہ محل کے اعتبار سے مصیبت ہے ممکن ہے کہ جو چیز ایک محل میں مصیبت ہو دوسرے محل میں مصیبت نہ ہو چنانچہ قطع جلد تندرست کے لئے مصیبت ہے مگر مریض محتاج اپریشن کے لئے صحت ہے۔ فاقہ تندرست کو مصیبت ہے اور مریض بدبھضمی کے لئے راحت و صحت ہے و علیٰ ہذا۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ

ترجمہ: تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے۔

تفسیری نکات

آلہ امتحان

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ نکاح کے تاکد میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ النکاح من سنتی اور نکاح سے اولاد ہونا ظاہر ہے مگر اولاد کے لئے آیت شریفہ ہے انما اموالکم و اولادکم فتنۃ تو پھر سنت پر عمل کر کے فتنہ سے کیونکر بچاؤ ہو سکتا ہے مولانا نے جواب میں فرمایا کہ فتنہ کے معنی آزمائش کے ہیں۔ مضرت کے نہیں۔ پس یہ آلہ ہے امتحان کا جس کا انجام بعض کے لئے یعنی مطیع کے لئے اچھا اور بعض کے لئے یعنی عاصی کے لئے برا۔

مال و اولاد کے فتنہ کا مفہوم

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ایک صوفی ملے اموال کی مذمت اور اولاد کی مذمت کرنے لگے اور استدلال میں یہ آیت پڑھی انما اموالکم و اولادکم فتنۃ میں نے کہا فتنہ کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے جو آپ کا ہے کہ یہ چیزیں ہر حال میں مضرت ہیں۔ دوسرے اس سے پہلے قرآن میں یہ بھی تو ہے ان من ازواجکم و اولادکم عدو الکم فاحذروہم تو بیوی کو علی الاطلاق مذموم کیوں نہیں سمجھتے حسین ہی کیوں تلاش کیجاتی ہے جیسی بھی مل جائے اندھی ہو کانی ہو چڑیل ہو سڑیل چپک منہ داغ ہو اس پر راضی رہنا چاہیے یہ غیر محقق لوگ

ایسی ہی باتیں لئے پھرتے ہیں محقق کا تو یہ مشرب ہے کہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرتے ہیں اور اذان شرعی کے بعد اس سے استغناء و اعراض نہیں کرتے۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَأَسْمِعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْتَقُوا خَيْرًا

لِأَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: سو ڈرو اللہ سے جہاں تک ہو سکے اور سنو اور مانو اور خرچ کرو اپنے بھلے کو اور جس کو بچا دیا اپنے جی کے لالچ سے سو وہ لوگ وہی مراد کو پہنچے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

تفسیری نکات

اجر عظیم

اس کے قبل فرمایا تھا واللہ عندہ اجر عظیم اس سے یہ آیت مرتبط ہے اور ضرورت ارتباط یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں (ف) ہے جس کا ترجمہ ہے پس اور لفظ پس یا لفظ تو ایسے مقام پر آتا ہے کہ مرتبط ہو ماقبل سے اور یہاں ماقبل سے ربط کے لئے تو سب سے پہل جزو واللہ عندہ اجر عظیم ہے۔ یعنی جب اللہ کے یہاں بہت بڑا اجر ہے تو تم کو چاہیے کہ اس پر نظر کر کے خدا سے ڈرا کرو کیونکہ اس کا اجر عظیم ہونا مقتضی اس کا ہے کہ تم وہ برتاؤ کرو کہ اس اجر کے مستحق ہو جاؤ یعنی استحقاق بسبب وعدہ خداوندی کے نہ اس لئے کہ اس کے ذمہ کسی کا حق واجب ہے اور کیونکہ کسی کا حق ہو سکتا ہے اگر حق ہوتا عمل کے سبب ہوتا اور عمل کی کیفیت یہ ہے کہ وہ محض بظاہر آپ کی طرف منسوب ہے ورنہ حقیقت میں وہ آپ کا عمل ہی نہیں کیونکہ تمام آلات ہاتھ پیر جن سے عمل ہوتا ہے سب اسی کے دیئے ہوئے ہیں۔

نیا و دم از خانہ چیزے نخت تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

اس میں چند صیغے امر کے فرمائے جس سے معلوم ہوا کہ ان میں ہر مامور بہ ضروری ہے۔

فاتقوا اللہ ما استطعتم الخ پس اس میں ایک امر تو یہ ہے کہ خدا سے ڈرو جتنا تم سے ہو سکے دوسرا امر فرمایا ہے کہ سنو اور تیسرا امر ہے اطاعت کرو اور چوتھا یہ ہے کہ خرچ کرو تمہارے لئے بہتر ہوگا اور یہ یا تو اخیر کے ساتھ ہے یا سب کے ساتھ ہے پس یہ چار امر ہیں اور ظاہر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اوامر سب الگ الگ ہیں تو اگر ایسا ہوتا بھی تو بھی مضافتہ نہیں تھا لیکن واقع میں اس میں ربط بھی ہے اور اس سبب مجموعہ سے مقصود

ایک ہی چیز ہے جو کہ اصل ہے یعنی اطاعت اور یہ دوسرے اوامر اس کے طرق ہیں۔
تفصیل اطاعت کی یہ ہے کہ اول دیکھا جاوے کہ ہماری ترکیب کتنے اجزاء سے ہے تو انسان میں دو چیزیں ہیں ایک جوارح ایک قلب یا ایک ظاہر اور ایک باطن تو خدا نے اس اطاعت کی تفصیل فرمائی کہ اول اتقوا اللہ فرمایا ہے یہ تو قلب کے متعلق ہے۔

تقویٰ کی حقیقت

سو تقویٰ حقیقت میں یہ نہیں جس کو لوگوں نے تجویز کیا ہے تقویٰ وہ ہے کہ جو حدیث میں ہے الا ان التقویٰ ههنا و اشار الی صدره ہاں ظاہری درستی بھی اس پر مرتب ہوتی ہے تو اصل لغت میں اس کی حقیقت ہے۔ ڈرنا اور شریعت میں ایک مضاف الیہ کی تخصیص ہے کہ خدا سے ڈرنا پس تقویٰ تو افعال قلوب سے ہے تو فاتقوا اللہ میں تو یہ فرمایا کہ قلب کو درست کرو جو کہ قلب کی اطاعت ہے اس کے بعد فرمایا ہے و اسمعوا یہ جوارح کا فعل اور اس کی اطاعت ہے بس حاصل یہ ہوا کہ تم ظاہر اور باطن دونوں کو اطاعت میں مشغول کرو۔ یہ ہے اصلاح تو خدا تعالیٰ نے ہم کو دو عملے دیئے ہیں ایک ظاہر ایک باطن تو اطاعت میں سب ہی مقید ہیں چنانچہ خداوند جل جلالہ نے اتقوا کے ساتھ اسمعوا فرمادیا کہ دونوں ہی درست ہوں اور اسی میں مقائسہ کے طور پر سارے جوارح لے لئے کیونکہ جارحہ سمع و دیگر جوارح میں کوئی وجہ فرق کی نہیں پھر اس کے بعد اطیعوا فرمادیا کہ کوئی کسی خاص عمل کی تخصیص نہ سمجھ جاوے اور اطیعوا میں ایک بات ہے طالب علموں کے سمجھنے کی وہ یہ کہ اطاعت مشتق طوع سے ہے اور طوع کہتے ہیں رغبت کو تو ترجمہ اس کا یہ ہے کہ خوشی سے کہنا مانو اور خوشی قلب میں ہوتی ہے اور کہنا ماننا جوارح کو بھی عام ہے پس اس میں بھی جمع بین الظاہر و الباطن ہو گیا۔

اطاعت کی اقسام

آگے ارشاد ہے انفقوا خیر الانفسکم اس میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ طاعات دو قسم کی ہیں ایک مالی ایک بدنی۔

ہر چند کہ اطیعوا میں سب آگئے ہیں لیکن چونکہ حرص ہم میں غالب ہے تو خدا تعالیٰ نے اتقوا سے پرہیز بتلایا ہے کہ یہ پرہیز کرو۔

اکثر طبائع میں یہ حب غیر برنگ حب مال زیادہ ظاہر ہوا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے ایک لطیف طریقہ بتلایا ہے اس کے نکلنے کا کہ خرچ کیا کرو واللہ العظیم کوئی بتلا نہیں سکتا کیا خبر ہو سکتی ہے کسی کو معافی کے خواص کی صاحبو! حکماء صرف خواص اجسام کو دریافت کر سکے مگر انبیاء علیہم السلام نے خدا کے بتلانے سے معافی کے خواص

کو بتلایا ہے مثلاً حب مال کے خاصہ کو دیکھ کر اس کا علاج بتلایا ہے کہ خرچ کیا کرو اور علاج بھی کیسا آسان کہ جس میں نہ محنت ہو نہ مشقت ہر شخص کر سکے۔

محققین کے یہاں ہر شخص کو اس کی حالت کے موافق تعلیم دی جاتی ہے قوی کو اس کے موافق ضعیف کو اس کے موافق جب اس میں اس قدر سہولت ہے تو یہ دولت اصلاح باطن ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ حب دنیا کو نکالنے کے لئے ظاہر کسی مشکل پیش آئی تھی مگر خدا تعالیٰ نے اس کا بھی کیسا آسان طریقہ بتلادیا کہ خرچ کیا کرو تو اب کیسی جامع تعلیم ہو گئی کہ مرض بتلایا دو بتلایا پر ہیز بتلادیا اس لئے ان کو اس جگہ جمع کر دیا گیا اور ہر ایک میں مناسب مناسب اور مفید رعایتیں فرمائیں میں ہر ایک کو مفصل ذکر کرتا مگر وقت گزر گیا ہے اور مجملاً ذکر بھی ہو گیا ہے اس لئے میں سب کا قدرے قدرے بیان کرتا ہوں پس اتقوا اللہ میں یہ قید لگائی کہ ما استطعتم جس سے معلوم ہوا کہ ہم کو اسی قدر کا مکلف کیا گیا ہے کہ جس قدر طاقت ہو اگر اس پر کوئی کہنے لگے کہ ہم کو تو صرف ایک ہی وقت کی نماز کی طاقت ہے تو جواب یہ ہے کہ تم نے صرف اسی کو دیکھا ہے دوسرے مقام کو نہیں دیکھا کہ حق تعالیٰ نے پانچ وقت کی نماز کا مکلف فرمایا اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا اس سے صاف معلوم ہوا کہ جتنے کا مکلف فرمایا ہے اس کی طاقت ضرور ہے پس اب جو یہاں فرمایا استطعتم تو مطلب یہ ہوا کہ جتنا تم کو بتلایا سب کرو اور یہ عنوان دل بڑھانے کے لئے فرمایا جیسے کوئی نوکر سے کہے کہ تم سے یہ کام تو جو ہو سکتا ہے وہ تو کرو تو گویا تصریحاً متنبہ کیا کہ تم سے تو ہو سکتا ہے تو یہ شبہ تو دفع ہو گیا۔

إِنْ تَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يَضْعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ

شَكُورٌ حَلِيمٌ ۝۱۷ ۝ عَلِيمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝۱۸

ترجمہ: اگر تم اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح (خلوص کے ساتھ) قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان ہے (کہ عمل صالح کو قبول فرماتا ہے) اور بڑا بردبار ہے۔ پوشیدہ اور ظاہر (اعمال) کو جاننے والا اور زبردست (اور) حکمت والا ہے۔

تفسیری نکات

يضاعف کا مفہوم

يضاعف سے شاید آپ نے دونا سمجھا ہو گا یہ نہیں بلکہ مضاعف کے معنی مطلق بڑھانے کے ہیں خواہ دونا ہو یا اس سے بھی زیادہ اس جگہ دونا سے زیادہ کو بھی یہ لفظ شامل ہے کیونکہ دوسری آیت میں اس کی مثال اس طرح بیان فرمائی ہے۔ مثل الذين ينفقون اموالهم في سبيل الله كمثل حبة انبتت سبع سنابل في كل سنبلة مائة حبة والله يضاعف لمن يشاء والله واسع عليم جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک دانہ سے سات خوشہ پیدا ہوں اور ہر خوشہ میں سو سو دانہ ہوں تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک چیز دینے سے سات سو حصے اس کے آخرت میں ملیں گے اس کے بعد ارشاد ہے واللہ يضاعف لمن يشاء کہ حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں حدیث میں اس کی زیادہ توضیح ہے کہ اگر ایک چھوڑا اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے تو حق تعالیٰ شانہ اس کو پرورش فرماتے ہیں اور بڑھاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ احد پہاڑ کے برابر کر کے اس شخص کو دیں گے اس حدیث کو ہم لوگ پڑھتے ہیں مگر غور نہیں کرتے غور کر کے دیکھئے اگر احد پہاڑ کے تم ٹکڑے کرنے لگو چھوڑا کے برابر تو وہ ٹکڑے کس قدر ہوں گے اور خصوصاً اگر ٹکڑے چھوڑا کی جسامت کے برابر نہ کئے جاویں بلکہ چھوڑا کے وزن کے برابر لئے جاویں تو احد پہاڑ چونکہ پتھر ہے اس کا ذرا سا ٹکڑا وزن میں چھوڑا کے برابر ہو جائے گا تو اس صورت میں تو اور بھی زیادہ ٹکڑے ہوں گے تو اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ تضاعف سات سو یا سات سو کے مضاعف تک محدود نہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اکثر ایسے موقع میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس مثال سے سمجھ لو اور حقیقت میں وہ ثواب اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے تو احد کے ٹکڑوں کے ساتھ بھی ثواب محدود نہیں تو دیکھئے یہ حساب کہاں تک پہنچتا ہے اسی کو فرماتے ہیں مولانا۔

خود کہ باید اس چنیں بازار را کہ بیک گل مچری گلزار را
 نیم جاں بستاند و صد جاں دہد انچہ درو ہمت نیابد آں دہد
 حضرت یہ تو مال بھی اور جان بھی سب انہی کی ہے وہ مفت مانگیں تب بھی سب قربان کر دینا چاہئے تھا
 چہ جائیکہ اس قدر ثواب کا وعدہ بھی ہے۔

ہمچو اسمعیل پیشش سر بنہ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ
 ہر کہ جاں بخشد اگر رواست نائب ست و دست او دست خداست

شکور حلیم کا مفہوم

واللہ شکور حلیم اگر تم حق تعالیٰ کو قرض حسن دو گے تو تمہاری مغفرت کر دیں گے اور اس کو مضاعف کر دیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ قدر دان ہیں (قدر دانی تو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا قدر دانی ہوگی اس کی تفصیل ابھی بیان ہو چکی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں حلیم کے وہ بردبار بھی ہیں یہ صفت اس لئے بیان فرمائی کہ طاعات میں جو کوتاہی ہو جاتی ہے اس پر نظر نہیں فرماتے بوجہ حلیم ہونے کے دوسرے یہ کہ بعض لوگ ایسے بھی تو ہیں جو طاعات کرتے ہی نہیں بلکہ معاصی میں مبتلا ہیں تو اہل طاعات کی قدر فرماتے ہیں اور اہل معاصی سے حلم اور بردباری فرماتے ہیں کہ ان کو جلدی سزا نہیں ملتی تو حلیم بڑھا کر اہل معاصی کو متنبہ کر دیا کہ سزا نہ ملنے سے یہ نہ سمجھیں کہ وہ مستحق سزا نہیں بلکہ بوجہ حلم کے ان کو جلدی سزا نہیں ملتی پھر کسی وقت یعنی آخرت میں سزا دیں گے اور کبھی تھوڑی سی سزا دنیا میں بھی دیدیتے ہیں اور ایک نکتہ اسی وقت سمجھ میں آیا ہے بہت عجیب بات ہے وہ یہ کہ شکور حلیم کو طاعات و معاصی دونوں کے اعتبار سے نہ مانا جائے بلکہ صرف ایک ہی امر کے متعلق مانا جائے یعنی طاعات ہی کے متعلق دونوں صفتوں کو قرار دیا جائے مطلب یہ کہ حق تعالیٰ شانہ تمہاری طاعات کو بوجہ قدر دانی اور حلم کے قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ہماری طاعات کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ وہ ہماری طاعت ہے اور ہم ناقص ہیں تو اس لحاظ سے اس کو گستاخی کہا جائے تو عجب نہیں اور میں اس کو ایک مثال سے عرض کرتا ہوں آپ کو بعض نوکریاں نالائق ملے ہوں گے کہ وہ موافق آپ کی طبیعت کے کام نہیں کرتے ہوں گے اس لئے کہ ان کو سلیقہ اور تمیز نہیں اگر پنکھا جھلتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سر میں مار دے گا ہر دفعہ آپ اپنے سر کو بچاتے ہیں تو اب دو موقعے پیش آتے ہیں ایک تو یہ کہ آپ اس کو ڈانٹ دیں اس وقت تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ میری خدمت سے راحت نہیں پہنچی بلکہ تکلیف ہوئی ایک موقع یہ ہے کہ آپ اپنے حلم سے خاموش رہیں اس وقت وہ سمجھتا ہے کہ میں نے میاں کو ایک گھنٹہ کھڑے ہو کر پنکھا جھلا تو میں مستحق جزا و انعام کا ہوں حالانکہ

یہ نہیں سمجھتا کہ اس گھنٹہ بھرتک میاں کو ستایا اس سے تو خالی ہی بیٹھا رہتا تو اچھا تھا اس کی خدمت گستاخی کا حکم رکھتی تھی ایسی ہی ہماری عبادت ہے کہ وہ مواقع میں عبادت اور طاعت کہنے کے لائق نہیں۔

طاعات کے دو پہلو

کہ ہماری طاعات میں دو پہلو تھے ایک کے اعتبار سے شکور فرمایا گیا اور دوسرے کے اعتبار سے حلیم فرمایا گیا۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں عالم الغیب والشہادۃ یعنی حق تعالیٰ جاننے والے ہیں پوشیدہ اور ظاہر کے یہ اس لئے فرمایا گیا تا کہ لوگ خلوص سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کریں کیونکہ دار و مدار ثواب کا خلوص پر ہے اور خدا تعالیٰ کو دلوں کی باتوں کا علم پورا پورا ہے اس کے سامنے کوئی حیلہ بہانہ چل نہیں سکتا۔

اس کے بعد ارشاد ہے العزیز الحکیم یعنی حق تعالیٰ شانہ غالب ہیں صاحب حکمت ہیں یہ اس لئے فرمایا کہ اجر دینے کا جو پہلے وعدہ فرمایا تھا اس پر شاید کسی کو یہ شک ہوتا کہ معلوم نہیں دیں گے بھی یا نہیں تو فرماتے ہیں کہ خدا ہر شے پر غالب ہے۔ ان کو ایفاء وعدہ سے کوئی امر مانع نہیں اس کا وعدہ خلاف نہیں ہو سکتا اس پر پھر کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ جب غالب ہیں ابھی کیوں نہیں دیدیتے دیر کس لئے کی جاتی ہے اس شبہ کو حکیم سے قطع فرمادیا کہ وہ صاحب حکمت ہیں ان کا ہر کام حکمت سے ہوتا ہے اس دیر میں بھی حکمت ہے۔

اولاد کا فتنہ مال سے سخت ہے

کیوں کہ اولاد کا فتنہ زیادہ سخت ہے اس لئے یہاں اس کو مکرر ارشاد فرمایا اور نیز اس لئے کہ اموال کے ساتھ محبت کا ایک منشاء اولاد کی محبت بھی ہے۔ اس لئے بھی اولاد کو مکرر ذکر فرمایا اور مال کی محبت کے بھی دو درجے ہیں ایک تو بضرورت حدود شرعیہ کے اندر یہ مذموم اور مانع نہیں اور ایک وہ محبت جس کے غلبہ میں حقوق شرعی فوت ہوتے ہیں چنانچہ آج کل یہ بلا بھی عام ہے جو کہ حب مال کا شعبہ ہے وہ یہ کہ حقوق العباد میں بہت کوتاہی کرتے ہیں۔

تقویٰ

اور وہ کل تین چیزیں ہوں گی ایک مصیبت اور نعمت کے افراد میں سے ایک اولاد و ازواج دوسرا مال اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مانعیت ان کی بوجہ افراد محبت و تاثر کے ہے اب اس مقام پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ محبت اور تاثر تو قلب میں ہوتا ہے اور وہ اختیار میں نہیں ہے یہ تو سخت مصیبت ہوئی تو آگے اس کا جواب ارشاد ہے فاتقوا اللہ ما استطعتم مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ کون کہتا ہے کہ تم آج ہی جنید جیسے ہو جاؤ میاں جس قدر تم سے ہو سکے تقویٰ کرتے رہو رفتہ رفتہ مطلوب تک پہنچ جاؤ گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت فاتقوا اللہ حق

تفاتیہ کی ناسخ ہے لیکن میرے تفسیر کر دینے سے معلوم ہوا ہوگا کہ فاتقوا اللہ حق تفاتیہ کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب آیت فاتقوا اللہ حق تفاتیہ نازل ہوئی تو صحابہ یہ سمجھے کہ امر کا صیغہ اس میں فور کے واسطے ہے اسی وقت اللہ سے ایسا درجہ تقویٰ حاصل کر لو جو حق ہے اس کا اور قاعدہ تو یہی ہے کہ امر فور کے لئے نہیں ہوتا لیکن گاہ گاہ قرآن سے فور بھی محتمل ہوتا ہے پس صحابہ اس احتمال سے کانپ اٹھے اس لئے جو حق ہے تقویٰ کا وہ فوراً کیسے حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد یہ آیت فاتقوا اللہ ما استطتم بطور اس کی تفسیر کے نازل ہوئی مطلب یہ ہوا کہ حق تفاتیہ درجہ منتہی کا ہے اور اس مامور بہ کا حاصل کرنا علی الفور واجب نہیں ہے بلکہ بقدر استطاعت تقویٰ اختیار کرو اور بتدریج اس میں جتنی جتنی ہو سکے ترقی کرتے رہو حتیٰ کہ جو تقویٰ مطلوب ہے اس پر جا پہنچو گے پس اس تقریر پر ان دونوں آیتوں میں نسخ اصطلاحی نہیں ہوا اور بعض روایات میں جو یہاں نسخ کا لفظ آیا ہے وہ بالمعنی المصطلح نہیں بلکہ بالمعنی الاعم ہے جو تفسیر مبہم کو بھی شامل ہے اب یہاں پر یہ خلجان ہوا کہ تقویٰ کا سلسلہ ایسا دراز ہے کہ اس کے علوم موقوف علیہا اور اعمال موتی بہا کا احاطہ حاصل نہیں تو عمل کی کیا صورت ہو آگے اس کا دفعیہ فرماتے ہیں واسمعوا واطیعوا یعنی تم اپنا دستور العمل یہ بنا لو کہ سنو اور مانو اور اپنی طبیعت کو پریشان نہ کرو جب کوئی بات سنی فوراً اس پر عمل شروع کر دو گو اس وقت احاطہ نہ ہو البتہ یہ نہ کرو کہ سن کر غفلت اور عمل میں کوتاہی کرو۔

پس واسمعوا واطیعوا میں ایک اعلیٰ درجہ کا دستور العمل بتلا دیا گیا اور چونکہ مال انسان کو بالطبع محبوب ہے اور نیز انسان کے اندر بخل بھی طبعی سا ہے اس لئے تقویٰ کے افراد میں سے تعیم بعد تخصیص کے طور پر اہتمام شان کے لئے اس کو مستقل طور سے بھی ارشاد فرماتے ہیں۔ وانفقوا خیر الانفسکم یعنی اپنے نفسوں کے لئے مال خرچ کرو اور لانفسکم اس لئے فرمایا کہ شاید تم یہ سمجھنے لگو کہ اس کا نفع حق تعالیٰ کا ہوگا سو یاد رکھو کہ اس انفاق کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوگا ہم تو معنی بالذات ہیں اور چونکہ جملہ کلام سابق یعنی اسمعوا واطیعوا سے بعضے کوتاہ ہیں ممکن ہے کہ یہ سمجھیں کہ صرف ظاہر احکام پر عمل کر لینے سے بس مقصود حاصل ہو جائے گا۔

تزکیہ نفس

اس لئے آگے ان اعمال ظاہرہ کی روح کی تعین فرماتے ہیں ارشاد ہے ومن یوق شح نفسه فاولئک ہم المفلحون مطلب یہ ہے کہ صرف اعمال ظاہرہ کی صورت پر مت رہو بلکہ روح کو بھی حاصل کرو اور اس کو ہم ایک مختصر عنوان میں بیان کرتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نفس کی حرص سے بچا لیا جائے تو یہ لوگ ہیں کامیاب یعنی جب نفس کے اندر اس قدر سماحت پیدا ہو جائے کہ غیر اللہ کا تعلق اس میں نہ رہے اور غیر پر نہ گرے تو جانو کہ فلاح حاصل ہوگئی اور یہ روح عادت الہیہ میں حاصل ہوتی ہے۔ امل اللہ کی خدمت و صحبت سے

اور یوق بصرہ مجہول فرمایا ہے یہ نہیں فرمایا ومن یوق شح نفسه (جو شخص اپنے کو بچائے حرص سے) اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ وقایہ (نگہداشت) تمہارا کام نہیں ہے بلکہ بچانے والے ہم ہیں یعنی اپنے پرنازنہ کرنا ہم ہی ہیں جو مقصود پر پہنچا دیتے ہیں جس کا ظاہری واسطہ اہل اللہ ہیں اس سے داوم مجاہدہ کی حد بھی بیان فرمادی کہ جب تک نفس کے اندر حصر اور شح باقی رہے اس وقت تک مجاہدہ نہ چھوڑو اور چونکہ نفس کے اندر حرص اور شح جبلی ہے کہ کسی طرح قابل زوال نہیں اس لئے مجاہدہ بھی مدۃ العمر ہی ضروری ہوا البتہ بعد چندے اس میں زیادہ مشقت نہیں رہتی اور چونکہ ومن یوق شح نفسه الخ اس کی تمام حرصیں جو غیر اللہ کے متعلق ہیں چھڑانا مقصود ہے اور یہ جب تک کہ نفس کو اس سے بڑی چیز کی حرص نہ دلائی جائے یہ نکل نہیں سکتی جیسے کسی کے پاس پیسہ ہو تو اس کو جب تک روپیہ یا گنی کالا لچ نہ دیا جائے اس کو چھوڑ نہیں سکتا اس لئے آگے شمرہ اعمال کی خیر کی حرص دلاتے ہیں۔

حرص کی قسمیں

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ مطلق حرص مذموم نہیں بلکہ حرص کی دو قسمیں ہیں غیر اللہ کی حرص تو مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کی حرص محمود ہے چنانچہ ارشاد ہے ان تقرضوا اللہ قرضاً حسناً یضاعفہ لکم یعنی ہم جو تم سے تمہارے اموال اور اولاد اور ازواج سے تمہاری جان چھڑانے (یعنی قلب سے نکالنے) کے لئے آیات سابقہ میں ارشاد کر آئے ہیں اس سے ڈرو مت کہ ہم تو بالکل ہی مفلس ہو جائیں گے تم یہ سب چیزیں ہم کو قرض دے رہے ہو سو اگر تم اچھا قرض دو گے یعنی خالص بلا ریا کے یعنی ان کی حب مفراط کو چھوڑ دو گے اور جس کیلئے انفاق بھی لازم ہے جان کا بھی مال کا بھی تو ہم اس کو بڑھاویں گے مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

خود کہ باید ایس چنیں بازار را کہ بیک گل می خری گلزار را

نیم جان بستاند و صد جان دہد آنچه در و ہمت نیاید آن دہد

اور دوسرے مقام پر اضعا فاکثیرہ ہے یعنی بہت حصے بڑھاویں گے جس کی کوئی انتہا نہیں اور بعض

روایتوں میں جو سات سو تک مضاعفت آئی ہے اس سے مراد تحدید نہیں بلکہ تکثیر ہے۔

سُورَةُ الطَّلَاقِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا

الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تَخْرُجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا

يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُودُ

اللَّهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي

لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا ①

ترجمہ: اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جب تم لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو (زمانہ) عدت (یعنی حیض سے پہلے یعنی طہر میں) طلاق دو اور تم عدت کو یاد رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے ان عورتوں کو ان کے رہنے کے گھروں سے مت نکالو کیونکہ سنی مطلقہ کا مثل منکوحہ کے واجب ہے اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے اور یہ سب خدا کے مقرر کئے ہوئے احکام ہیں اور جو شخص احکام خداوندی سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے اوپر ظلم کیا تجھ کو خبر نہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ بعد طلاق دینے کے تیرے دل میں نئی بات پیدا کر دے۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ و تعالیٰ کی غایت رحمت

لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرًا میں ایک حکمت کی طرف اشارہ ہے گو حق تعالیٰ کے ذمہ حکمتیں

بیان کرنا نہیں ہے لیکن ان کی رحمت نہایت درجہ ہے وہ چاہتے ہیں کہ سامعین کی اصلاح ہو ہی جائے کیونکہ بعضے ایسے بھی ہیں جو بدوں حکمت کے دل سے احکام کو نہ مانیں گے اس لئے کہیں انہوں نے احکام کی حکمت بھی بیان کر دی ہے مگر بعض جگہ نہیں بھی کی تا کہ سامعین کو حکمت معلوم کرنے کی عادت نہ ہو جاوے اور کسی جگہ حکمت غامض ہوتی ہے جس کو ہر شخص نہ سمجھ سکے گا اور عادت پڑ گئی ہے حکمت معلوم کرنے کی تو وہ عمل بھی نہ کرے گا اور گنہگار ہوگا اس لئے خدا تعالیٰ نے نہ تو ہر جگہ حکمت بیان کی نہ یہ کہ کہیں بھی ذکر نہ ہو۔

طلاق کی ایک حد

اب پوری آیت کی تفسیر سنئے اس سے اس حکمت کی حقیقت واضح ہوگی حق تعالیٰ فرماتے ہیں یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتھن اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو عدت سے پہلے طلاق دو یہاں سب کے نزدیک حسب روایت لعدتھن کے معنی فی قبل عدتھن (ان کی عدت سے پہلے) ہیں پھر قبل کے معنی میں حنفیہ و شافعیہ کا اختلاف ہے حنفیہ کے نزدیک عدت حیض سے شمار ہوتی ہے تو ان کے نزدیک قبل کے معنی استقبال و آمد کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ حیض آنے سے پہلے یعنی طہر میں طلاق دو اور شافعیہ کے نزدیک عدت طہر سے ہے ان کے نزدیک قبل کے معنی ابتداء کے ہیں یعنی زمانہ عدت کے شروع میں طلاق دو اس کا حاصل بھی وہی ہوا کہ طلاق طہر میں ہونی چاہیے لیکن جس طہر میں طلاق دی جائے گی حنفیہ کے نزدیک وہ عدت میں شمار نہ ہوگا بلکہ عدت حیض سے شمار ہوگی اور کے نزدیک وہ طہر بھی عدت میں شمار ہوگا کتب اصول میں فریقین کے دلائل مذکور ہیں اس وقت میں ان کو بیان کرنا نہیں چاہتا آگے فرماتے ہیں واحصوا العدة یعنی طلاق دینے کے بعد تم عدت کو یاد رکھو واتقوا اللہ ربکم اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے یعنی طلاق کے متعلق جو خدا کے احکام ہیں ان کے خلاف نہ کرو مثلاً یہ کہ حدیث میں تین طلاق دفعہ دینے کی ممانعت ہے تو ایسا نہ کرو اور حیض میں طلاق مت دو وغیرہ وغیرہ

اور ایک حکم آگے مذکور ہے لا تخرجن من بیوتھن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشة مبینة یعنی عدت میں ان مطلقہ عورتوں کو ان کے رہنے کے گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے مثلاً بدکاری یا سرقہ کی مرتکب ہوں اس صورت میں سزا کے لئے گھر سے نکالی جاویں یا بقول بعض علماء کے وہ زبان درازی اور ہر وقت کارج و نکرار رکھتی ہوں تو ان کو نکال دینا اور باپ کے گھر بھیج دینا جائز ہے۔ تلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسه یہ سب خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود ہیں جو شخص حدود خداوندی سے تجاوز کرے گا (مثلاً تین طلاق دفعہ دیدیں یا طلاق

کے بعد عورت کو گھر سے نکال دیا) تو اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا (یعنی گنہگار ہوا آگے طلاق دینے والے کو ترغیب دیتے ہیں کہ طلاق میں رجعی بہتر ہے طلاق مغلظہ نہ دینی چاہیے فرماتے ہیں لا تدری لعل اللہ یحدث بعد ذلك امرًا اے طلاق دینے والے تجھ کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ اس طلاق کے بعد کوئی نئی بات تیرے دل میں پیدا کر دیں مثلاً طلاق پر ندامت ہو تو رجعی طلاق میں اس کا تدارک ہو سکے گا۔

مفسرین نے لا تدری الخ کی توجیہ میں اختلاف کیا ہے بعض نے یہ کہا ہے کہ ایک طلاق دینی چاہیے تین نہ دینی چاہئیں۔ اور ایک توجیہ یہ ہے کہ تین دفعہ مت دو اگر تین ہی دینی ہوں تو ایک طہر میں ایک طلاق پھر دوسرے طہر میں دوسری طلاق متفرقا دینی چاہئیں مجھے سب توجیہوں کا بیان کرنا مقصود نہیں صرف یہ بتانا ہے کہ اس جگہ طلاق کی حد مذکور ہے کہ ایک وقت میں ایک دینی چاہئے ایک دم سے تین نہ دینی چاہئیں اور اس کی حکمت یہ بتلائی ہے کہ تم کو کیا معلوم ہے کہ اس کے بعد تمہارے دل میں کیا بات پیدا ہو تو ایک طلاق دینے میں یا تین متفرقا دینے میں مصالح و منافع کی رعایت ہے اور تین دفعہ دینے میں معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے پھر اگر ندامت ہو تو سوائے حسرت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ (حرمت الحدود ص ۶۸-۶۹)

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝

ترجمہ: جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ نکال دیتے ہیں

تفسیری نکات

حقیقت اسباب رزق

مگر اس کے یہ معنی نہ سمجھنا کہ نوکری کی ضرورت نہ رہے گی زراعت و تجارت کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس کے معنی ایک مثال سے واضح ہو جائیں گے زراعت و تجارت ملازمت کی مثال زنبیل گدائی کی سی ہے۔ حق تعالیٰ کا معاملہ اکثر یہ ہے کہ جو شخص جو زنبیل پھیلاتا ہے حق تعالیٰ اسی میں عطا کرتے ہیں۔ ہاں بعض کو بے زنبیل لائے بھی دیتے ہیں دیکھو دنیا میں بھی دینے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کھانا دے دیا مگر شرط یہ کہ اپنا برتن لاؤ ایک یہ کہ کھانا مع برتن دے دیا پس جس طرح زنبیل لانے پر کھانا ملنے میں معطی (عطا کرنے والا) سب اس جو ادہی کو سمجھتے ہیں زنبیل کو کوئی موثر نہیں سمجھتا چنانچہ اس صورت میں اگر کوئی زنبیل سے کھانا نکال کر کہنے لگے کہ یہ تو خود بخود میرے برتن میں سے نکلا کسی نے اس میں ڈالا نہیں تو یہ اس کی حماقت ہے اور اسے کہا

جائے گا رے بیوقوف برتن میں کیا تھا وہ تو محض ظرف ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی کسی مصلحت سے قانون مقرر کر دیا ہے کہ اپنا برتن لاؤ اور لے جاؤ تو یہ تجارت و ملازمت و زراعت برتن ہیں اب اگر کوئی کہنے لگے کہ خدا نے نہیں دیا وہ تو میری ملازمت یا تجارت یا زراعت سے پیدا ہوا تو جس طرح وہ بیوقوف ہے یہ بھی احمق ہے اور یہ تو قارون کا مذہب ہے اور اس نے اپنے مال کو کہا تھا کہ خدا نے نہیں دیا بلکہ انما او تبتہ علی علم عندی میرے پاس ایک ہنر ہے اس کی بدولت مجھے یہ حاصل ہوا بعضوں نے ہنر کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ کیمیا کرتا تھا بعضوں نے کہا ہے کہ بہت بڑا تاجر تھا بہر حال اپنے مال کو ہنر کی طرف منسوب کرتا تھا تو یہ قارون کا مذہب ہے کہ علت حقیقیہ رزق کی نوکری یا زراعت یا تجارت کو قرار دے خوب سمجھ لو کہ یہ کاسہ گدائی ہیں خدا کی عادت غالبہ یہ ہے کہ برتن لاؤ تو دیں گے تجارت کرو یا نوکری یا زراعت وہی دیتے ہیں اسباب تو نظر آتے ہیں اور وہ مسبب نظر نہیں آتا۔

قَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ

مُبَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ

إِلَى النُّورِ ۚ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا ۝

ترجمہ: خدا تعالیٰ نے تمہارے پاس ایک نصیحت نامہ بھیجا اور وہ نصیحت نامہ دے کر ایک ایسا رسول بھیجا جو تم کو اللہ کے صاف صاف احکام پڑھ کر سناتے ہیں تاکہ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں (کفر و جہل) کی تاریکیوں سے (ایمان و علم و عمل) کے نور کی طرف لے آئیں (اور آگے ایمان و طاعت پر وعدہ ہے کہ) جو شخص اللہ پر ایمان لائے گا اور اچھے عمل کرے گا خدا اس کو جنت کے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت اچھی روزی دی۔

تفسیری نکات

ذکر کی توجیہ

قد انزل اللہ الیکم ذکراً اس کی توجیہ میں اختلاف ہے ایک توجیہ تو یہ ہے کہ ذکر کی تفسیر قرآن مجید

سے کی جائے اور رسولاً ذکر ا کا بدل الاشمال ہے اور ایک توجیہ ہے کہ ذکر ا کے معنی ہیں شرفا کے اور رسولاً اس سے بدل الکل ہو مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ نے ایک شرف نازل کیا۔

شرف کا لفظ عظمت کو ظاہر کر رہا ہے۔ وہ کون ہیں رسول ہیں انزل بھی آپ کے شرف پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ انزال اوپر سے نیچے آنے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تھی تو اونچی رکھنے کی چیز بوجہ شرف کے مگر تمہاری خاطر سے نیچے بھیج دیا ہے اس صورت میں آپ کا شرف در شرف ظاہر ہو گیا۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ دوسرے موقع پر قرآن شریف میں ہے و انزلنا الحديد کہ ہم نے لوہے کو نازل کیا حالانکہ وہاں اوپر سے نیچے آنا نہیں پایا جاتا کیونکہ لوہا آسمان سے تو نازل نہیں ہوتا وہ تو زمین میں سے نکلتا ہے اس لئے انزال کے معنی اوپر سے نیچے آنے کے کہاں ہوئے۔

جواب یہ ہے کہ وہاں مجاز ہے تعذر حقیقت کے سبب سے ہے اور قد انزل اللہ الیکم ذکرا میں تعذر نہیں۔ اس لئے حقیقت مراد ہے۔ دوسرے کسی نے اس کے بھی توجیہ کی ہے کہ حضرت آدم کے ساتھ کئی چیزیں آئی تھیں۔ ہتھوڑا تھا اور وہ اوپر ہی سے آئی تھیں۔ تیسری توجیہ یہ کہ حدید نکلتا ہے زمین سے اور سب اس کا بخارات ہیں جو پانی سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی اوپر سے آتا ہے اور زمین میں نفوذ کرتا ہے۔ سو اس طرح وہاں بھی معنی حقیقی ہی ہیں۔ غرض حقیقی معنی انزال کے اوپر سے آنے کے ہیں اور انزال کا کلمہ بارش کے لئے بھی آیا ہے سو آپ کے لئے اس کا استعمال ہونا یہ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آپ کی شان بارش کی سی ہے کہ وہ بھی رحمت ہے اور آپ بھی رحمت۔ چنانچہ حدیث میں ہے انار حمة مہداة یعنی میں خدا کی رحمت ہوں جو بندوں کے لئے خدا کے پاس سے تحفہ کر کے آیا ہوں اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاصیت بارش کی سی ہے چنانچہ بارش سے حیات ہوتی ہے ارض کی اور آپ سے حیات ہوتی ہے قلب کی۔

ایک شعر حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب نے ایسے موقع پر پڑھا تھا کہ کسی نے آپ سے مسئلہ مولد کے متعلق پوچھا تھا آپ نے فرمایا لوہم مولد پڑھتے ہیں اور یہ شعر پڑھا۔

تر ہوئی باراں سے سوکھی زمین یعنی آئے رحمت للعالمین

اس شعر سے میرے اس مضمون کو اور قوت ہو گئی۔ غرض ذکر میں آپ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ رسولاً میں متابعت کی طرف کیونکہ ایک مدار متابعت کا رسالت ہے اور آمنوا میں محبت کی طرف کیونکہ ایک آیت ہے۔ والذین آمنوا اشد حباً للہ اور حب اللہ اور حب الرسول میں تلازم ہے تو جس طرح ایمان کے لئے اللہ کی شدت محبت لازم ہے اسی طرح رسول کی شدت محبت بھی لازم ہے آگے ہے مہینات یعنی خود ظاہر بھی اور

ظاہر کرنے والی بھی۔ آگے ارشاد ہے لیخرج الذین الخ لیخرج میں لام غایت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیوں بھیجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے برکات حاصل کریں۔

یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ موصوف ہوگا وہ تو خود ہی خارج من الظلمات الی النور ہوگا۔ پھر ان کے خارج ہونے کے کیا معنی؟

سو مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ظلمت سے نور کی طرف خارج ہوئے ہیں وہ ایمان اور اعمال صالحہ کر کے ہوئے ہیں یعنی یہ برکت ایمان اور اعمال صالحہ ہی کی ہے کہ وہ تاریکی سے نور کی طرف لے آئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے پورے حقوق ادا کرنے چاہئیں یعنی ذکر بھی کریں محبت بھی کریں۔ متابعت بھی ادب و تعظیم بھی آگے آیت میں خاصیت ایمان اور اعمال صالحہ کی بیان فرماتے ہیں۔ ومن یومن باللہ

الخ مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کر کے کیا ملے گا۔ بشارت دیتے ہیں کہ یہ ملے گا۔ یدخلہ جنت تجری من تحتہا الانہر خلدین فیہا ابدًا قد احسن اللہ لہ رزقا۔

یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کا یہ ثمرہ ہے کہ حق تعالیٰ ایسی جنات میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خالدین فیہا ابدًا کہ وہ نعمتیں بلا حساب اور بلا انقطاع ہوں گی۔ یہی دو صورتیں کمال

نعمت کی ہوتی ہیں کہ نفیس اور عمدہ بھی ہو اور بلا انقطاع بھی ہو کہ مزیت کما ہے سو یہ جنت میں حاصل ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ کے جملہ حقوق ادا کر کے

جنت کی نعمتیں حاصل کریں اور اگر حقوق ادا نہ کئے برائے نام تھوڑی سی تعریف کر لی یا محفل منعقد کر لی اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً طبیب کی تعریف سے کیا فائدہ جب تک اس سے نسخہ لکھا کر اس کا استعمال نہ کیا جائے اور اس کے

کہنے پر عمل نہ کیا جائے اور یہ حقوق آپ کے دائمی ہیں۔ تو آپ ایسی بارش کے مشابہ نہیں جو کسی خاص موسم میں ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بارش ہیں کہ جس سے ہمیشہ بہار ہی بہار ہے کبھی خزاں ہی نہیں۔ یہ نہیں کہ ربیع الاول

میں تو بہار ہو اور مہینوں میں نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہار جو حیات میں تھی وہ اب بھی بحالہ ہے۔ اب میں اس مضمون کے مناسب اس شعر پر اپنے وعظ کو ختم کرتا ہوں۔

ہنوز آں ابر رحمت در فشاں ست خم و خم خانہ بامہر و نشان ست

محروم ہے وہ شخص جو ایسے نبی کی برکات حاصل نہ کرے دعا کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نصیب ہو متابعت کی توفیق ہو اور آپ کی عظمت ہو قلب میں۔ (الربیع فی الربیع ملحقہ مواعد میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۸۷۲-۸۷۳)

الحاصل

غرض اس وقت یہ تین جماعتیں ہیں۔

(۱) ایک وہ جو محبت رکھتے ہیں مگر اتباع و عظمت نہیں۔

(۲) ایک وہ جو عظمت کرتے ہیں لیکن محبت و اتباع نہیں۔

(۳) ایک وہ جو اتباع کرتے ہیں مگر عظمت و محبت نہیں۔

سو یہ تینوں جماعتیں پورے حقوق ادا نہیں کرتیں۔ کسی نے ایک کو لیا دو کو چھوڑا کسی نے دو کو لیا تیسرے کو چھوڑا علیٰ ہذا جامع وہ شخص ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں متابعت میں عظمت میں سرافگندہ رہتا ہو۔

سُورَةُ التَّحْرِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَاۤ ۗ وَاِنْ تَظْهَرَا عَلَیْهِ

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ

ترجمہ: اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کر لو تو تمہارے دل مائل ہو رہے ہیں اور اگر پیغمبر کے مقابلہ میں تم دونوں کا ردائیاں کرتی رہیں تو پیغمبر کا رفیق اللہ ہے اور جبریل ہیں اور نیک مسلمان ہیں۔

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ كے متعلق

ان توبہ الی اللہ فقد صغت قلوبكما و ان تظاہر اعلیہ فان اللہ ہو مولاه و جبریل و صالح المؤمنین میں وہ ان تظاہر اعلیہ کی جزا محذوف ہے اور وہ لایضرہ ہے کیونکہ فان اللہ ہو مولاه صلاحیت جزاء کی نہیں رکھتا کیونکہ جزا متاخر عن الشرط ہوتی ہے اور ولایت حق تعالیٰ متاخر نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۵ ص ۱۵)

عَسَى رَبُّهُ أَنْ طَلَّقَكَ أَنْ يُبَدِّلَهُ أَنْزِلْ وَأَجْأخِيراً مِنْكَ مُسْلِمًا

مُؤْمِنًا قَدِّتِ تَبَّتْ عِدَّتِ سَبَّحَتْ تَبَّتْ وَأَبْكَارًا ۝

ترجمہ: اگر پیغمبر تم کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیویاں دے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہوں گی کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں۔

تفسیری نکات

توبہ باقی اعمال پر مقدم ہے

اس میں بھی تائبات مقدم ہے عبادت پر ان آیات سے اور ان مویدات سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ توبہ جملہ عبادت پر مقدم ہے تو توبہ اول اعمال ہوئی۔ ہاں اس آیت عسی ربہ ان لٰح پر ایک شبہ ہے۔

وہ یہ کہ اس میں تائبات کا لفظ عبادت پر تو مقدم ضرور ہے جس سے توبہ کا مقدم ہونا عبادت پر نکلتا ہے مگر اول اعمال ہونا توبہ کا اس سے نہیں نکلتا کیونکہ اس سے بھی مقدم چند الفاظ ہیں۔ اور وہ یہ ہیں مسلمات مؤمنات قانتات ترتیب کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ چوتھے مرتبہ میں درجہ تائبات کا ہے توبہ کا اول اعمال ہونا جب مستطب ہوتا جب کہ آیت التائبون کی طرح اس میں بھی سب سے مقدم التائبات ہوتا۔

اس کا جواب بہت ظاہر ہے کیونکہ میں نے اس بیان میں تصریح کر دی تھی کہ توبہ کے اول اعمال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بجز ایمان و اسلام کے اور سب اعمال پر مقدم ہے اور ان دونوں کا مقدم ہونا تو مسلم ہے کیونکہ یہ تمام اعمال کی صحت کے لئے شرط ہیں ان کے بغیر تو اعمال خواہ کیسے ہی اچھے ہوں ایسے ہوتے ہیں جیسے ایک باغی ہو کہ رعایا کی بہت خدمت کرے اور بڑے بڑے کارہائے نمایاں کرے چندہ رفاہ عام بھی بدرجہ وافر دے اور قحط وغیرہ میں بہت امداد دے مگر ہے باغی تو یہ سب کام اس کے بے کار ہیں کوئی بھی ان میں سے سلطنت کی نظر میں کچھ شمار نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک کہ بغاوت سے رجوع نہ کرے۔

اسی طرح ایمان و اسلام ہے کہ کوئی عمل بدوں ان کے صحیح بھی نہیں نورانیت تو الگ رہی تو اس آیت میں تین لفظ ہیں جو تائبات پر مقدم ہیں یعنی مسلمات اور مؤمنات اور قانتات۔ مسلمات اور مؤمنات کی وجہ مقدم توبہ ظاہر ہے صرف قانتات پر شبہ رہا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قنوت ایک خاص وجہ سے توبہ سے مقدم ہے اس واسطے کہ توبہ ندامت کو کہتے ہیں اور ندامت جب ہوگی جب کہ تعب قنوت ہو کیونکہ جب تک نرمی اور جھک جانا اور عجز قلب میں نہ ہو تو کسی فعل پر ندامت کیوں ہونے لگی اور یہی ترجمہ ہے قنوت کا تو توبہ ہمیشہ قنوت کے بعد ہوگی تو عقلاً ثابت ہو گیا کہ توبہ کی شرط قنوت ہے اس واسطے قاننات کو بھی اس آیت میں تاہیات پر مقدم کیا تو حاصل یہ ہوا توبہ کے اول اعمال ہونے کا کہ ان اعمال سے جن پر توجہ مٹی ہے ان سب سے مقدم توبہ ہے۔ باقی قنوت چونکہ توبہ کے لئے شرط عقلی ہے لہذا توبہ پر مقدم ہے اور ان کے سوا باقی اعمال پر توبہ مقدم ہے۔

ازواج مطہرات کی حضورؐ سے از حد محبت تھی

ان آیات میں اسی عتاب کا ذکر ہے اور یہ دھمکی ایسی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ہی محبت تھی اور یہ کہ وہ دنیا دار نہ تھیں بلکہ کامل دیندار تھیں کیونکہ یہاں جہنم وغیرہ کی دھمکی نہیں دی گئی۔ نہ کسی آفت ارضیہ و سماویہ سے ڈرایا گیا بلکہ دھمکی یہ دی گئی کہ اگر تم حضور کو مکدر کرو گی تو اندیشہ ہے کہ حضور تم کو طلاق دے دیں اور ہم آپ کو تم سے بہتر بیبیاں دے دیں اور ظاہر ہے کہ یہ دھمکی عاشق ہی کو دی جاسکتی ہے جو بیوی عاشق نہ ہو اس کے حق میں یہ کچھ بھی دھمکی نہیں بلکہ وہ تو اس کو بشارت سمجھے گی خصوصاً جب کہ عدم محبت کے ساتھ یہ بات بھی ہو کہ شوہر کے یہاں کھانے پہننے کی بھی تنگی ہو دنیا کی عیش و راحت بھی نہ ہو جیسا کہ حضور کے یہاں حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ کے یہاں فاقہ بھی ہوتا تھا۔

آیت تخیر

بہر حال جب یہ آیت تخیر نازل ہوئی تو سب ازواج نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اختیار کیا کہ کسی نے بھی اختیار نہیں کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس درجہ کی محبت تھی کہ فقر و فاقہ اور تنگی میں رہنا منظور تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی منظور نہ تھی چنانچہ اس محبت ہی کی وجہ سے ان کو حق تعالیٰ نے جہنم کے عذاب وغیرہ کی دھمکی نہیں دی بلکہ صرف اس سے ڈرایا کہ دیکھو کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تم کو اپنے سے علیحدہ نہ کر دیں۔ اور تم یہ نہ سمجھنا کہ اگر ہم کو الگ کر دیا تو ہم سے بہتر بیبیاں کہاں سے ملیں گی۔ خوب سمجھ لو کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو طلاق دے دی تو حق تعالیٰ قادر ہیں کہ وہ تم سے بہتر بیبیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیں عسی ربہ ان طلقکن ان یبدلہن ازواجاً خیر امنکن (اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا) یہ تو اجمالاً ان کی خیریت کا ذکر تھا آگے اس خیریت کی تفصیل ہے کہ وہ بیبیاں کیسی ہوں گی۔ مسلمات مومنات قاننات تاہیات

عبادات سائخت وہ اسلام والیاں ہوں گی اور ایمان والیاں اور خشوع خضوع والیاں اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے والیاں اور عبادت کرنے والیاں اور سائحات ہوں گی۔ سائحات (روزہ رکھنے والیاں) کی تفسیر عنقریب آتی ہے یہ تو تشریحی صفات ہیں آگے تکوینی صفات مذکور ہیں۔ نیت و ابراراً (کچھ بیوہ کچھ کنواریاں)

ازواج مطہرات باقی عورتوں سے افضل ہیں

اس مقام پر ایک اشکال طالب علمانہ ہے وہ یہ کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ازواج مطہرات سے خیر و بہتر عورتیں موجود تھیں اگر نہیں تھیں تو یہ دھمکی کیسی؟ اور اگر تھیں تو بظاہر بہت بعید ہے کہ ان سے بہتر عورتیں دنیا میں ہوں اور حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کمتر تجویز فرمائیں۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال فیض و قوت تاثیر صحبت پر نظر کر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ عورتوں سے بہتر کوئی ایسی عورت ہو سکے جس نے ابھی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل نہیں کی اور خود نص میں بھی تو ہے یا نساء النبی لستن کا احد من النساء ان اتقین (اے نبی کی بیویوں میں معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تقویٰ اختیار کرو) اس آیت میں قلب ہے مطلب یہ ہے لیس احد من النساء کمنکن کہ کوئی عورت تم جیسی نہیں ہے اگر تم متقی ہو اور ازواج مطہرات کا متقی ہونا معلوم ہے تو ثابت ہوا کہ ان کے مثل کوئی عورت دنیا میں اس وقت نہ تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ قلب نہ ہو اور تقدیر اس طرح ہو یا نساء النبی لستن دنیات کغیر کن (اے نبی کی بیویوں میں غیر عورتوں کی طرح دنیا دار نہیں ہو) اس اشکال کا جواب میں نے ایک عالم کے خادم سے سنا ہے اپنے شیخ سے نقل کرتے تھے کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ ازواج مطہرات کی خیریت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح ہی کی وجہ سے تھی۔ قبل از نکاح تو وہ اور دوسری عورتیں یکساں تھیں۔ پھر اگر آپ ان کو طلاق دے دیتے تو ان سے خیریت کم ہو جاتی اور دوسری جس بیوی سے نکاح کر لیتے نکاح کے بعد وہ ان سے بہتر ہو جاتی۔ پس خیراً منکن (جو تم سے بہتر ہوں گی) بالفعل کے اعتبار سے نہیں فرمایا گیا بلکہ مؤول (آئندہ حالت کے) اعتبار سے فرمایا گیا ہے اب کوئی اشکال نہیں یہ جواب مجھے بہت پسند آیا یہ تو اشکال کا جواب تھا۔

بعض علماء نے جو سائح کی تفسیر سیاحت کنندہ سے ہے انہوں نے سیاحت کرنے والے کو تشبیہات بالصائم (روزہ دار سے تشبیہ دے کر) سائح کہہ دیا ہے صائم کو سیاحت کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دے کر سائح نہیں کہا گیا پس اصل تفسیر سائحات کی صائمات (روزہ رکھنے والیاں) ہے اور تو اجمہود نیل مستقل ہے کہ اکثر علماء مفسرین نے سنسخت کی تفسیر یہی کی ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ سنسخت کی تفسیر روزہ رکھنے والیاں ہیں تو

اس سے معلوم ہوا کہ روزہ بڑی عبادت ہے کیونکہ تخصیص بعد تعمیم اہتمام کے لئے ہوتی ہے تو حالانکہ مسلمات اور عبادات میں روزہ بھی داخل تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو اہتمام کے ساتھ الگ بیان فرمایا ہے جس سے اس کی خاص عظمت و فضیلت معلوم ہوئی کہ یہ بہت بڑی عبادت ہے مگر اس سے ناز نہ کرنا کہ ہم نے بڑا کام کیا بلکہ حق تعالیٰ کا احسان سمجھو کہ انہوں نے ہم سے یہ کام لے لیا۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہی کئی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت
(احسان مت کرو کہ بادشاہ کی خدمت کرتے ہو بلکہ اس کا احسان مانو کہ اس نے تم کو خدمت کے لئے رکھ لیا ہے)

اب سمجھئے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے سمجھات کو جس کی تفسیر ابھی معلوم ہو چکی ہے کہ اس کے معنی روزہ رکھنے والیوں کے ہیں مقرون کیا ہے ثبوت و ابرار کے ساتھ جو صفات غیر اختیاریہ ہیں اور صفات غیر اختیاریہ سب سے زیادہ سہل ہیں کیونکہ ان میں کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا۔ حتیٰ کہ ارادہ و اختیار کو بھی صرف کرنا نہیں کرنا پڑتا بلکہ وہ بدو و ارادہ و اختیار کے خود بخود ثابت ہیں اور اوپر ابھی معلوم ہوا کہ اقتران حکمت سے خالی نہیں تو معلوم ہوا کہ صفت صوم کو صفات غیر اختیاریہ سے مقترن کرنے میں بھی کچھ حکمت ہے اور وہ حکمت میرے نزدیک یہی ہے کہ صوم بھی مثل صفات غیر اختیاریہ کے سہل ہے کہ اس میں بھی کچھ فعل و جود کرنا نہیں پڑتا پس آیت سے سہولت صوم پر عجیب طرز سے دلالت ہے رہا یہ کہ یہ صفات غیر اختیاریہ کیسے ہیں تو سنئے کہ شیوہ بت تو اس لئے غیر اختیاری ہے کہ لغت میں شیوہ بت بکارت کے مقابل ہے اور شرعاً شیبہ وہ ہے جو صاحب زوج ہو چکی ہے پھر اس سے فرقت ہو گئی ہے بوجہ طلاق یا موت کے اور باکرہ وہ ہے جو ابھی تک صاحب زوج نہیں ہوئی۔

پس شیوہ بت کو اگر اپنے جزو اول کے اعتبار سے من کل الوجوہ غیر اختیاری تسلیم نہ بھی کیا جائے تب جزو ثانی کے اعتبار سے تو یقیناً غیر اختیاری ہے کہ اس صفت کا ثبوت عورت میں بدو اس کے اختیار کے ہو جاتا ہے تو جزو اخیر شیوہ بت کی علت تامہ کا ہر حال میں غیر اختیاری رہا اگر مجموعہ اجزاء پر نظر کی جائے تب بھی مجموعہ اختیاری و غیر اختیاری کا غیر اختیاری ہوتا ہے تو شیوہ بت غیر اختیاری ہی رہی اور بکارت کا غیر اختیاری ہونا ظاہر ہے پس۔ سنحت کو ثبوت و ابرار کے ساتھ مقرون کرنا بتلا رہا ہے کہ صوم مثل امور طبعیہ کے سہل ہے اور واقعی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صوم امر طبعی ہے کیونکہ امر طبعی وہ ہے جس کیلئے قصد و ارادہ کی ضرورت نہ ہو اور ظاہر ہے کہ کھانے پینے کے لئے تو قصد و ارادہ کی ضرورت ہے اور نہ کھانے اور نہ پینے کے لئے قصد و ارادہ کی کیا ضرورت ہے کچھ بھی نہیں ہم گھنٹوں بدو کھانے پینے کے کام میں لگے رہتے ہیں اس وقت اس حالت پر التفات بھی نہیں ہوتا کہ ہم اس وقت کھاتے پیتے نہیں ہیں دوسرے یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کے زیادہ

تر اوقات نہ کھانے اور نہ پینے ہی کے ہیں۔ کھانے پینے کے تو چند اوقات معین ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ نہ کھانا نہ پینا امر اصلی ہے اگر کھانا پینا امر اصلی ہوتا تو اس کے اوقات زیادہ ہوتے مگر واقعہ اس کے خلاف ہے اور اصلی سہولت ہے رہا یہ شبہ کہ نہ کھانے پینے کی حالت میں جو التفات شراب و طعام کی طرف نہیں ہوتا تو یہ اسی وقت تک ہے جب تک بھوک نہ لگے اور جب بھوک لگتی ہے تو خاص التفات ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو بھوک میں بھی شراب و طعام کی طرف التفات بے کاری کی حالت میں ہوتا ہے اور اگر کسی کام میں لگ جائے تو کھانے پینے کی تو کیا بھوک کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ بہت واقعات ایسے ہو چکے ہیں اور کم و بیش ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوتا ہوگا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ بھوک میں طعام و شراب کی طرف التفات ہوتا ہے تو اس کا انکار ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک عارض کی وجہ سے ہے اب معدہ ان رطوبات اصلیہ کے ہضم کی طرف متوجہ ہو گیا جس سے تکلیف ہوتی ہے جب یہ عارض مرتفع ہو جائے گا۔ التفات بھی جاتا رہے گا۔ اب یہاں سے میں ایک اور شبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں جس کا جواب دینا جمعہ کو بھول گیا تھا (وہ اسی اقتران کی مثل ایک اور صفت سے اقتران اسی کا ہم اثر ہے تقدیر اس کی یہ ہے کہ سورہ احزاب میں صائمین و صائمات روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں (کا اقتران و الحافظین فر و جہم و الحافظات اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں کے ساتھ ذکر میں واقع ہوا ہے اور حفظ فروع اہل طبائع سلیمہ کا اور ان میں سے بھی بالخصوص اناث کا امر طبعی ہے تو اس امر طبعی کے ساتھ اقتران نیز مویذ ہر علوم کے مشابہ ہونے کا جو کہ بے حد سہل ہوتے ہیں جیسا کہ متن میں مذکور ہے یہ مضمون بعد میں ذہن میں آیا اس لئے حاشیہ میں لکھ دیا گیا۔ ۱۲

وہ یہ کہ نہ کھانا اور پینا اگر آسان ہے تو کسی کو مہینہ بھر تک بھوکا رکھ کر دیکھا جائے معلوم ہو جائے گا کہ نہ کھانا کیونکہ آسان ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عدم اکل کی حقیقت فی نفسہ دشوار نہیں بہت سے بہت آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ امتداد عدم اکل دشوار ہے تو یہ دشواری امتداد عارض سے ہو گئی نہ کہ حقیقت عدم اکل سے۔ اور شریعت نے جو عدم اکل و شرب کی حد مقرر کی ہے وہ ممتد نہیں ہے اس لئے صوم کچھ دشوار نہیں سواب سب اشکالات رفع ہو گئے اور سہولت صوم کا دعویٰ بے غبار ہو گیا۔ پھر اقتران سنسخت نیست و ابکاراً کے علاوہ خصوصیت مقام سے اس سہولت میں ایک اور اضافہ ہو گیا وہ یہ کہ اس جگہ عورتوں کے روزہ کا ذکر ہے اور عورتوں کو طبعاً بھی روزہ اس لئے آسان ہے کہ ان میں رطوبت و برودت زیادہ غالب ہوتی ہے ہاں کوئی ضعیف و نحیف ہو تو اور بات ہے ورنہ عام طور سے مزاج عورتوں کا رطب و بارد ہے اور ایسے مزاج والے کو روزہ دشوار نہیں ہوتا روزہ حار و یا بس مزاج والے کو زیادہ گراں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں نماز میں تو ست ہیں مگر روزہ میں بچیاں بھی ہمت والی ہیں۔ نیز عورتوں کا طرز عمل بھی بتلاتا ہے کہ ان کو روزہ سہل ہے اور وہ یہ کہ عورتیں جب کبھی نذر و منت مانتی ہیں تو زیادہ تر روزہ کی منت مانتی ہیں نماز کی نذر کوئی نہیں کرتی کیونکہ نماز ان پر گراں ہے اس میں پابندیاں بہت ہیں اور افعال

اختیار یہ بھی زیادہ ہیں پابندی کا تو یہ حال ہے کہ نماز میں بات بھی نہیں کر سکتے۔

لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿۶﴾

ترجمہ: جو خدا کی نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو فوراً بجالاتے ہیں۔

تفسیری نکات

ملائکہ کی اطاعت

فرمایا کہ اگرچہ ملائکہ بھی بوجہ اطاعت خداوندی کے جیسا کہ ارشاد ہے لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ افضل واکمل ہیں لیکن ان کا کمال زیادہ عجیب نہیں کیونکہ ان میں وہ تقاضے پیدا ہی نہیں ہوتے جن سے مخالفت کی نوبت آئے مگر انسان کا مطیع ہونے میں کامل ہونا زیادہ عجیب ہے اس لئے کہ انسان میں جس طرح علت الخیر ہے علت الشر بھی موجود ہے۔ پس اس میں متنافیین کا تراجم ہے اور اس تراجم کے ساتھ کمال اطاعت ہونا زیادہ عجیب ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ

أَن يُكَفِّرَ عَنْكُم سَيِّئَاتِكُمْ

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کے آگے سچی توبہ کرو امید ہے تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کر دینگے

تفسیری نکات

حقیقی توبہ

مقصود اس آیت کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ توبہ کا حکم کرتا ہے اسی کو توبہ کہتے ہیں کہ بندہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائے یہی توبہ کی حقیقت ہے اور صرف لفظ توبہ زبان سے کہہ لینا کافی نہیں کیونکہ صرف زبانی وہی توبہ ہے جس کو کہتے ہیں۔

سجہ بر کف توبہ بر لب دل پر از ذوق گناہ معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

(ہاتھ میں تسبیح ہونٹوں (زبان) پر توبہ توبہ ہو اور دل اندر اندر گناہ کے مزے لے رہا ہو تو ایسی حالت

میں خود گناہ کو بھی ہماری ایسی توبہ و استغفار پر ہنسی آ جاتی ہے۔)

تو حقیقت توبہ کی یہ ہوئی کہ دل سے توبہ ہو تو فرماتے ہیں یا ایہا الذین امنوا اتوبوا الخ (اے مسلمانو توبہ کرو) خلاصہ یہ کہ اس مقام پر توبہ کا حکم ہے اور توبہ گناہ سے ہوتی ہے اور گناہ کا علم دین کے جاننے سے ہوتا ہے کہ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ گناہ کس قدر ہیں اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی وقت ایسا گزرتا ہو کہ ہم سے گناہ نہ ہوتے ہوں۔

گناہ کا خلاصہ ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اس کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے یہ معلوم کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس کس بات کا حکم دیا ہے اور ہم اس میں سے کتنوں پر عمل کرتے ہیں اور کتنے نواہی سے اجتناب کرتے ہیں۔ (تفصیل التوبہ ص ۵)

سُورَةُ الْمُلْكِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ

تَرْجِمَانًا: اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے آراستہ کر رکھا ہے۔

تفسیری نکات

ستارے آسمان پر مزمین ہیں

ایک مشہور فاضل نے حضرت والا سے دریافت فرمایا کہ بعض لوگ اسی دعویٰ کی دلیل میں یہ تارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ تو کیا اس آیت سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ تارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں حضرت حکیم الامتہ دام ظلہم العالی نے ارشاد فرمایا کہ ہرگز نہیں اس آیت کی اس امر پر کچھ بھی دلالت نہیں اس آیت سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان ستاروں سے آسمان کو مزمین کیا گیا ہے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ یہ اجرام آسمان میں جڑے ہوئے ہیں کیونکہ کسی چیز کو اگر ہم کسی چیز سے مزمین کریں تو یہ تھوڑا ہی ضروری ہے کہ جس چیز سے مزمین کریں اس کو اس میں جڑ بھی دیں بلکہ تزمین بغیر جڑے بھی ہو حاصل ہو سکتی ہے جیسے کہ چھت کو قدیلوں سے مزمین کیا کرتے ہیں سو اس تزمین کے لئے قدیلوں کو چھت کے اندر جڑا کب جاتا ہے بلکہ قدیلیں چھت سے بہت نیچے ہوتی ہیں اسی طرح ان اجرام سے گو آسمان کو مزمین کیا گیا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اجرام آسمان میں جڑے ہوئے بھی ہوں۔ لہذا اس آیت سے اس دعویٰ پر کہ تارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں استدلال کرنا بالکل غلط ہے اور مدت کے بعد ان ہی فاضل نے سورہ نوح کی آیت وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ

سورہ کے ظاہر سے قمر کے مرکوز فی السماء ہونے پر استدلال کیا لیکن اس کا جواب خود آیت میں ہے کیونکہ فیہن کی ضمیر سموات کی طرف ہے اور ظاہر ہے کہ متعدد سموات میں مرکوز کے کوئی معنی نہیں پس آیت ماول ہو گی اور تاویل جیسے فی مجموعہن سے محتمل ہے۔ اسی طرح فی قمر بھن یا فی جھتھن سے محتمل ہے اسی طرح ظرفیہ باعتبار نور کے ہونا اور باعتبار جمع کے نہ ہونا ممکن ہے تو ان احتمالات کے ہوتے ہوئے رکز پر استدلال نہیں ہو سکتا جیسے اس کے خلاف پر بھی کوئی دلیل قائم نہیں۔

نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۱۰

ترجمہ: اور (کافر فرشتوں سے یہ بھی) کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں (شامل) نہ ہوتے۔

تفسیری نکات

عمل علی الحق کے دو طریقے

اس حکایت میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کو منحصر کیا ہے ایک تو سننے میں اور ایک سمجھنے میں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عمل علی الحق کے دو طریقے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ کسی سے سنا ہو دوسرے یہ کہ خود سمجھا ہو۔ کفار نے چونکہ نہ سنا تھا نہ خود سمجھا تھا اسی لئے ان کو حسرت کی نوبت آئی۔ اس سے آپ کو آیت کا ما حاصل مجملًا معلوم ہو گیا ہوگا خدا تعالیٰ نے اس حکایت کو نقل کر کے اس پر انکار نہیں فرمایا اور اس کو غلط نہیں کہا بلکہ اگلی آیت میں اس کی تصدیق فرمائی۔ فاعترفوا بذنبهم انہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا جس سے معلوم ہوتا ہے ان کا ذنب یہی تھا معلوم ہوا کہ یہ امر حق ہے اور ان ہی دو کا نہ ہونا باعث دخول جہنم ہوا اگر اس کو نقل فرما کر سکوت بھی کیا جاتا تب بھی یہ حق سمجھا جاتا کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس بات کو بیان کر کے اس پر سکوت کیا جائے اور رد اور انکار نہ کیا جائے تو وہ حاکمی کے نزدیک امر مرضی ہوا کرتا ہے۔ نیز اصولیوں نے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ نیز قطع نظر اس مقدمے کے اس کے حق ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ یہ مقولہ قیامت کا ہے اور قیامت میں چونکہ سب امور منکشف ہو جائیں گے اس لئے کوئی جھوٹ نہ بولے گا اور اگر بعض آیات سے مثلاً واللہ ربنا ما کنا مشرکین (قسم ہے اللہ کی جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں ہیں) یہ شبہ ہوا کہ ان لوگوں نے جھوٹ بولا چنانچہ ارشاد ہے انظر کیف کذبوا علیٰ انفسہم (دیکھو تو اپنی جانوں پر کس طرح جھوٹ بول رہے ہیں) تو جواب اس کا یہ ہے کہ جھوٹ ایک عارض کی وجہ سے بولا اور وہ عارض یہ ہے کہ بولنے میں ان کو نفع کی

توقع تھی اور یہاں یہ بات نہیں ہے بلکہ اس قول میں خود ان ہی کا ضرر ہے کہ اعتراف ذنب لازم آتا ہے۔ اس لئے یہ قول غلط نہ ہوگا خلاصہ یہ ہے قیامت میں کشف حقیقت کا اصل مقتضایہ ہے کہ وہاں جو بات کہی جائے بالکل صحیح کہی جائے لیکن بعض لوگ عارض نفع کی وجہ سے اس مقتضایہ کے خلاف کریں گے۔ تو جس جگہ وہ عارض پایا جائے گا اس موقع پر تو ان کے قول میں کذب کا احتمال ہوگا اور جس موقع پر وہ عارض نہ ہو وہاں اصل مقتضایہ کی وجہ سے قول کو صادق ہی سمجھا جائے گا۔ لہذا کفار کا یہ قول بالکل سچا ہے اور پھر جبکہ اس کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے تائید بھی موجود ہے تو اس کے صدق میں کوئی شبہ ہی نہیں رہا چنانچہ ارشاد ہے فاعترفوا بذنبہم فسحقاً لاصحاب السعیر (انہوں نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا) جس کی اوپر تقریر ہو چکی ہے اب میں اصل مقصود کو بیان کرتا ہوں اور اس آیت سے ان شاء اللہ اس کو ثابت کر دوں گا کیونکہ وہ مضمون اس آیت کا مدلول ہے اور اس کی ضرورت نہایت عام ہے ہر وقت ہر جگہ ہر مسلمان کو اس کی ضرورت ہے ایسا ہی اس کا فائدہ بھی نہایت عام ہے یعنی اس کے استعمال کے بعد حتمی فائدہ اس میں ہے نیز یہ مضمون نہایت سہل ہے تو ان تینوں باتوں پر نظر کر کے اس کی ضرورت میں ذرا بھی کلام نہیں رہتا۔ دیکھئے عقلی قاعدہ یہ ہے کہ مرض جس قدر صعب ہوتا ہے مثلاً اگر کسی شخص کو یا کسی جماعت کو یا کسی ایک شہر میں کوئی سخت مرض پھیل جائے تو عقلاً اس کے لئے سخت تدابیر تجویز کرتے ہیں اور جب یہ قاعدہ مسلم ہے اور عقلاً اس کو برداشت کیا جاتا ہے اور اگر برداشت کی تاب نہیں ہوتی تو علاج سے مایوس ہونا پڑتا ہے چنانچہ بعض مرتبہ اطباء کہتے ہیں کہ تمہارا مرض امیرانہ ہے مثلاً کسی غریب آدمی کو جنون ہو جائے اور کوئی طبیب اس کا علاج شروع کرے اور کسی طرح اس کو فائدہ نہ ہو تو پریشان ہو کر طبیب کو یہ کہنا پڑے گا کہ بھائی تمہارا مرض تو امیرانہ ہے اور تم دو چار پیسے کی دوا میں اس کا علاج چاہتے ہو یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے تو بہت سخت تدابیر کی ضرورت ہے جن کی وسعت تم میں نہیں ہے لہذا تم اچھے نہیں ہو سکتے تو از روئے عقل ہر مرض صعب کی تدبیر بھی صعب ہوتی ہے اور بعض اوقات مایوسی کی نوبت آتی ہے لیکن اس طب میں جس کا نام طب ایمانی ہے کوئی درجہ بھی ایسا نہیں ہے کہ وہاں پہنچ کر مایوس کر دیا جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ اب تمہارا مرض لا علاج ہو گیا بلکہ ہر مرض کے لئے علاج موجود ہے اور نہایت سہل علاج موجود ہے میں ان شاء اللہ اس کو بدلیل بیان کر دوں گا کہ صعب سے صعب مرض میں بھی نہایت سہل نسخہ تجویز کیا ہے اور یہ دلیل ہے خدا تعالیٰ کی رحمت عامہ کی کہ اتنا بڑا مرض اور اس کا علاج اس قدر سہل اور اس سے اس آیت کے معنی بھی منکشف ہو جائیں گے۔ کہ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر اور ما جعل علیکم فی الدین من حرج یعنی خدا تعالیٰ نے دین میں تم پر کچھ تنگی نہیں کی یہاں سے ایک جملہ معترضہ عرض کرتا ہوں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں کچھ

تنگی نہیں ہے حالانکہ مشاہدہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ یعنی اکثر دینداروں کو عمل بالشرع میں بہت تنگی پیش آتی ہے اور جو لوگ آزاد ہیں وہ نہایت مزے میں ہیں کہ جو جی میں آیا کر لیا ان کو کارروائی میں تنگی نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین پر عمل کرنے میں تنگی ہے اور آزاد رہنے میں آسانی کیونکہ دیندار آدمی کو تو قدم بقدم حرام کی فکر لگی رہتی ہے بلکہ جس بات کو ان سے پوچھئے اس کو حرام ہی کہتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کو نہایت پریشانی اور تنگی ہوتی ہے۔ مثلاً اب آموں کی بہار آ رہی ہے جو لوگ آزاد ہیں وہ تو نہایت چین میں رہیں گے کہ فصل شروع ہوتے ہی فروخت کر دیں گے اگرچہ ابھی تک نرا پھول ہی ہو اور ان کو نہایت اچھے دام اٹھیں گے اور جو لوگ دیندار ہیں وہ اس فکر میں لگے رہیں کہ پھول فروخت کرنا حرام ہے لہذا اس وقت فروخت کرنا چاہیے کہ جب پھل آ جائیں اور پھل بھی بڑھ جائیں نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی حفاظت کے لئے کم سے کم ماہوار کا ایک ملازم رکھیں گے یا خود حفاظت کریں گے پھر آندھیوں میں جو کچھ آم گریں گے سب ان کے گریں گے ان کی وجہ سے قیمت کم اٹھے گی علیٰ ہذا اگر تجارت کریں تو شریعت پر عمل کرنے میں کوئی صورت قمار میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے کسی داد و ستد میں سود لازم آ گیا وہ اس لئے حرام ہے غرض شریعت پر عمل کرنے میں ہر طرح تنگی و مصیبت ہے اور جب کوئی چیز بھی تنگی سے خالی نہیں تو یہ تو قرآن ہی میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے (نعوذ باللہ من ذالک) تو یہ شبہ بعض لوگوں کو پیدا ہونا ممکن ہے میں نے متعدد مقامات پر اس کا جواب عرض کیا ہے اس وقت بھی وہی جواب دیتا ہوں مگر توضیح کے لئے اول ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ فرض کرو کہ ایک شخص مریض ہو اور وہ کسی طبیب کے پاس گیا اور نسخہ دریافت کیا اور حکیم صاحب نے نسخہ لکھا لیکن اتفاق سے مریض ایسی جگہ رہتا ہے کہ اس جگہ کوئی دوا دستیاب نہیں ہوتی اس کے بعد حکیم صاحب نے پرہیز بتلایا اور اتفاق سے اس گاؤں میں صرف وہی چیزیں ملتی ہیں جن کی ممانعت کی گئی ہے اور جن چیزوں کی اجازت ہے ان میں سے ایک چیز بھی نہیں ملتی۔ پس اگر یہ مریض حکیم صاحب کے نسخہ کو دیکھ کر اور پرہیز کو سن کر یہ کہنے لگے کہ طب میں نہایت ہی تنگی ہے کیونکہ دوائیں وہ بتلائیں جن میں سے ایک بھی میسر نہیں غذائیں وہ تجویز کیں جو کبھی گاؤں بھر میں بھی نہیں آتی اور جتنی چیزیں کھانے کی ہیں وہ سب ممنوع کہ نہ بیٹنگن کھانا نہ آلو کھانا نہ بھینس کا گوشت کھانا اور اس کے ساتھ ہی حکیم صاحب کو بھی اپنے جہل کی وجہ سے برا بھلا کہنے لگے تو عقلاء اس کو کیا جواب دیں گے۔ یہی جواب دیں گے کہ طب میں تو ذرا بھی تنگی نہیں اس شخص کے گاؤں ہی میں تنگی ہے کیونکہ طب میں تنگی تو اس وقت سمجھی جاتی ہے جبکہ دو چار چیزوں کی اجازت ہوتی اور باقی سب چیزیں ممنوع ہوتیں اور جبکہ بیس کی اجازت ہے اور صرف چار کی ممانعت تو طب میں تنگی ہرگز نہیں بلکہ اس شخص کے گاؤں میں تنگی ہے کہ اس میں صرف وہی چیزیں منتخب ہو کر آتی ہیں جو کہ سراسر مضر ہیں۔ (طریقہ النجات ص ۷۳)

إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿۱۹﴾

وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۲۰﴾

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم مقرر ہے اور تم لوگ خواہ چھپا کر بات کہو یا پکار کر اللہ تعالیٰ کو سب کی خبر ہے کیونکہ دلوں تک کی باتوں سے خوب واقف ہیں بھلا کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بین اور پورا باخبر ہے۔

تفسیری نکات

خوف میں اعتدال

پس ارشاد ہے ان الدین یخشون ربہم بالغیب الخ یعنی جو لوگ اپنے رب سے غیب میں ڈرتے ہیں ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

اب یہاں یہ امر قابل غور اور نتیجہ خیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یخشون اللہ کا تعلق لفظ ربہم سے فرمایا یعنی یہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور یخشون اللہ نہ فرمایا اس میں تعدیل خوف کی طرف اشارہ ہے۔ مخلوق کے کلام میں ایسی رعایت نہیں ہوتی اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام بشر کا نہیں خالق کا کلام ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خوف کے اندر دو خاصیتیں ہیں ایک تو یہ کہ گناہوں سے روکتا ہے جیسے مدلل پہلے معلوم ہو چکا ہے یہ تو جب ہے کہ خوف درجہ اعتدال میں ہو۔ اور دوسرا خاصہ یہ ہے کہ طاعت سے بھی روک دیتا ہے یہ اس وقت ہے کہ فوق الحد ہو دنیوی امور میں ہم اس کی نظر بکثرت دیکھتے ہیں کہ جب کسی امر کا زیادہ خوف ہوتا ہے تو کام نہیں ہوتا ہے جیسے کوئی شخص کوئی مضمون لکھ رہا ہو اور کوئی ایسا شخص جس کو وہ اپنے سے استعداد میں زیادہ سمجھتا ہو دیکھنے لگے تو ہرگز نہ لکھا جائے گا امتحان میں وہ طلبہ جن پر امتحان کا خوف غالب ہو جاتا ہے نا کام ہو جاتے ہیں۔ علی ہذا بہت سے نظائر سے یہ امر ثابت ہے کہ غلبہ خوف میں کام نہیں ہوتا جیسا کہ اگر بالکل خوف نہ ہو تو کام نہیں ہوتا اور اسی لئے زندگی میں حکم ہے اتقوا ربکم و اخشوا (اپنے رب سے ڈرو) یعنی خشیت اور مرنے کے وقت ارشاد ہوتا ہے لا تخافوا ولا تحزنوا و ابشروا بالجنة (تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت کے ملنے پر خوش رہو) اور یہی منشاء ہے اس ارشاد کا کہ جو حضرت حاجی

صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ زندگی میں تو خوف کا غلبہ ہونا چاہیے تاکہ گناہوں سے بچا رہے کیونکہ وہ وقت عمل کا ہے اور موت کے وقت امید کا غلبہ ہونا ضرور ہے اس لئے کہ وہ وقت لقاء حق کا ہے اور اللہ تعالیٰ سے امید لے کر ملنا چاہیے تاکہ بمقتضائے انا عند ظن عبدی بی (یعنی میں اپنے بندے کے گمان کے نزدیک ہوں جو اس کو میرے ساتھ ہے) یہ شخص مورد رحمت ہو لیکن غلبہ خوف سے یہ مراد ہے کہ وہ حد سے متجاوز ہو جائے یہاں غلبہ مقابلہ میں امید کے ہے یعنی امید سے زیادہ خوف ہو اس لئے کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب خوف فوق الحد ہوتا ہے تو وہ مانع طاعات بن جاتا ہے چنانچہ بہت سے سالکین پر جب خوف کا غلبہ ہو گیا ہے تو طاعات چھوڑ بیٹھے ہیں۔ بعض نے نماز چھوڑ دی ہے کسی نے ذکر چھوڑ دیا ہے۔ اصطلاح صوفیہ میں ان کو سالکین مستہلکین کہتے ہیں۔ ایسے لوگ مقبول مقرب نہیں ہوتے اور یہ لوگ اپنی خود رائی کی وجہ سے ایسے گڑھے میں گرتے ہیں کہ تمام عمر اس سے خلاصی نہیں ہوتی ایسے وقت رہبر کامل کی ضرورت ہے وہ بہتد امیر اس مہلکے سے نکال لیتا ہے اور تد امیر متعلقہ تدبیر باطن بعض مرتبہ ایسی لطیف ہوتی ہیں کہ عوام کا فہم ان کے ادراک سے قاصر ہوتا ہے بلکہ ان کو بادی النظر میں نامناسب سمجھتے ہیں۔

تخويف کی دو قسمیں

پس رہم اگر نہ فرماتے تو اللہ کے بعض بندے بوجہ غلبہ استحضار شان جلال وقہاریت کے خوف کی وجہ سے جان ہی دیدیتے اس لئے رہم اختیار فرمایا کہ جس ذات سے خوف کی فضیلت بیان ہو رہی ہے وہ تمہارا مربی بھی ہے تم سے بے تعلق نہیں وہ کوئی شیر یا بھیڑ یا نہیں اے میرے مقبول بندو! تم اس قدر خوف کے اندر مت گھلو جیسی مجھ میں شام جلال وقہاریت ہے اسی طرح شان تربیت بھی تو ہے اسی وجہ سے فاما من خاف مقام ربہ (جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے) میں بھی رب فرمایا ہے اور یہاں ربہ کے ساتھ ایک لفظ مقام کا اور زیادہ فرمایا۔ اس میں عجیب نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ خوف کے قائم رکھنے کے لئے بڑھایا شرح اس کی موقوف ہے ایک مثال پر۔

وہ یہ ہے کہ مثلاً کسی کا باپ اگر حاکم ہو تو جب وہ برسر اجلاس ہوگا تو اس کا اور اثر ہوگا اور جب نچ پر ہوگا تو دوسرا اثر ہوگا اجلاس پر تو شان حکومت جلوہ گر ہوگی خواہ کوئی سامنے آئے اور نچ پر شان شفقت پداری کی ظاہر ہوگی اس وقت شان حکومت ظاہر نہ ہوگی پس مقام کا لفظ بڑھا کر یہ بتلادیا کہ گو وہ تمہارا رب ہے جس کا مقتضا شفقت ورحمت و تربیت ہے لیکن جبکہ وہ قیامت کے دن جلال وقہاریت کے ساتھ ظہور فرمائیں گے تو اس وقت ان کے سامنے کھڑے ہونے کو یاد کر کے اس سے ڈرنا چاہیے خلاصہ یہ کہ مقام کا لفظ خوف دلانے کو بڑھایا

اور رہے تعدیل خوف کے لئے لائے اسی طرح یہاں یخشون ربہم (جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں) میں اسی تعدیل کے لئے ربوبیت کو یاد دلایا اور جاننا چاہیے کہ یخشون ربہم میں ربہم کا لفظ جیسے کہ جانب افراط کی تعدیل کرتا ہے اسی طرح جہتہ تفریط کا بھی معدل ہے یعنی نفس خوف کے وجود کا بھی متحرک تفصیل اس کی یہ ہے کہ تخویف کی دو قسمیں ہیں ایک توبہ کی کسی امر موجب سے خوف دلایا جائے جیسے کہا جائے کہ اگر چوری یا ڈکیتی کرو گے تو جیل خانہ جاؤ گے اس کا اثر تو ضعیف ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ مقدمہ میں رہا ہو جائیں اور دوسری قسم یہ ہے کہ کسی امر معجل سے تخویف ہو مثلاً کسی سرکاری ملازم سے کہا جائے کہ فلاں جرم کا اگر ارتکاب کرو گے تو سب سے اول سزا یہ ہوگی کہ تمہاری ملازمت جاتی رہے گی۔ تنخواہ بند ہو جائے گی اور پھر جیل خانہ جاؤ گے۔ یہ موثر قوی ہے کیونکہ نوکری کا نفع کہ تنخواہ ہے وہ فی الحال جاری ہے اس کا انقطاع زیادہ مخوف ہے اسی طرح تعزیرات الہیہ میں بھی سمجھئے کہ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ اس گناہ کی سزا یہ ہے کہ دوزخ میں جلو گے اس کا اثر بعض طبائع پر ضعیف ہے اس لئے کہ جانتے ہیں کہ میاں جب قیامت ہوگی دیکھا جائے گا۔ (خواص الخشیہ ص ۱۶)

یخشون ربہم فرمانے میں حکمت

اب سمجھئے کہ ربہم سے کس طور سے نفس خوف پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ گویا یہ فرماتے ہیں کہ ایسی ذات سے ضرور ڈرنا چاہیے کہ تمہاری تربیت کا مدار اسی کے ہاتھ میں ہے اس لئے کہ اگر اس سے نہ ڈرو گے تو تمہاری تربیت میں کمی آ جائے گی۔ مثلاً روزی نہ ملے گی۔ عافیت جاتی رہے گی سبحان اللہ کلام اللہ کے ایک ایک لفظ کے اندر کتنے بے شمار معانی بھرے ہوئے ہیں اور ہر مقام پر نظائر بیان کرنے سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ کلام اللہ کے اندر پورا لطف اس کو آئے گا جس کی محاورات اور واقعات پر نظر ہو اور استدلال اور فلسفیت کی زیادہ کاوش سے خالی ہو۔

اب رہی یہ بات کہ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم تو گناہوں کے اندر رات دن رہتے ہیں اور ہم کو خوب رزق ملتا ہے نافرمانی سے رزق کبھی نہیں گھٹتا اس کے دو جواب ہیں اول تو نطقی قرآن و حدیث سے مسلمانوں کا چونکہ وہ ایمان ہے ان لئے اس کے لئے تو یہی کافی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں من اعرض عن ذکرہ فان له معیشتہ ضنکاً یعنی جو شخص میری یاد سے اعراض کرے اس کے لئے تنگ زندگی ہے۔ اگرچہ اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ معیشتہ ضنکاً سے مراد یہ ہے کہ قبر میں اس کی حیات اخروی تنگ ہوگی لیکن معیشتہ کے لفظ سے متبادر یہی ہے کہ دنیا ہی کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ بندہ گناہ کرنے سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔ دوسرا جواب عقلی ہے اور اس کی اگرچہ بعد قرآن و حدیث کے ضرورت نہیں لیکن ہم تبرعاً واقعات سے دکھلاتے ہیں بات یہ ہے کہ رزق میں یہ غور کرنا چاہیے کہ کیا شے

مطلوب ہے جائیداد اگر مطلوب ہے تو کیوں ہے ڈھیلے تو مطلوب ہیں نہیں مکان طلب کیا جاتا ہے تو کیوں کیا جاتا ہے اگر کہو کہ مطلوب جائیداد سے روٹی کپڑا اور مکان ہے اس میں رہنا ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس مقصود کا بھی کوئی مقصود ہے یا کھانا پہننا بذاتہ مطلوب ہے اگر کھانا پہننا بذاتہ مقصود ہوتا تو عاریت کے کپڑے اور عاریت کے گھر میں ایسا لطف کیوں نہیں جیسے اپنے کپڑے پہننے اور اپنے مکان میں رہنے سے آتا ہے معلوم ہوا کہ نفس پہننا کھانا رہنا مقصود نہیں کوئی اور شے مطلوب ہے وہ کیا ہے وہ ہے لذت راحت حلاوت چونکہ اپنا کپڑا پہننے میں اپنے مکان میں رہنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ (خواص الخبیئہ ص ۱۹۱۸)

عجیب ربط آیت

اس لئے خشیت کی فضیلت معلوم کرنے کے بعد ممکن ہے کہ کسی کو خیال ہو کہ میاں ہم ایسی جگہ جا کر گناہ کریں گے کہ کسی کو خبر ہی نہ ہو اس کے جواب میں ارشاد ہے کہ تم لوگ خواہ سرگوشی کرو یا جہر سے بات کرو ہم کو دلوں تک کی خبر ہے سبحان اللہ کیا کلام ہے انہ علیہم بذات الصدور (وہ دلی باتوں سے واقف ہیں) میں قول سے لے کر ذات الصدور تک جتنے مراتب ہیں ظہور و انخفا کے سب آگئے۔ آگے اس کے دلیل عقلی ہے الایعلم من خلق یعنی وہ ذات جس نے پیدا کیا ہے وہ نہ جانے گا یہ عقلی مسئلہ ہے کہ ایجاد بعد علم کے ہوتا ہے اس لئے کہ فعل اختیاری مسبوق بالارادہ ہوتا ہے اور ارادہ مسبوق بالعلم سے مطلب یہ ہوا کہ کیا ہم تمہاری چھپی کھلی ہوئی بات سے ناواقف ہیں ہم نے خود ہی تو سب کو پیدا کیا ہے اس میں بڑی تاکید خشیت کی ہوگی کہ ہر حال میں ڈرنا چاہیے آگے ارشاد ہے وهو اللطیف الخبیر (وہ باریک بین اور پورے باخبر ہیں) یہ جملہ بھی خشیت کا مؤکدہ ہے اس لئے کہ نہ ڈرنے کی دو وجہ ہوتی ہیں کبھی تو خوف منہ کا بعید ہونا تو اس کی نسبت تو ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت قریب ہیں لیکن چونکہ لطیف ہیں اس لئے نظر نہیں آتے دوسری وجہ نہ ڈرنے کی خوف منہ کو خبر نہ ہونا ہوتی ہے تو اس کے لئے فرماتے ہیں کہ وہ خبیر بھی ہیں غرض فحواہ قیاس الغائب علی الشاہد تم ہم کو مخلوق پر قیاس نہ کرو ہم سے تم کسی بات کو چھپا نہیں سکتے اس لئے خشیت ضروری ہے ان آیات سے خوف کی فضیلت اور اس کا مفتاح سعادات دنیویہ و اخرویہ ہونا معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خشیت بہت ہی ضروری شے ہے۔ (خواص الخبیئہ ص ۲۱۲۰)

طریق تحصیل خشیت

اپنے روزانہ اوقات میں سے آدھ گھنٹہ یا بیس منٹ نکال کر تنہا بیٹھ کر دو چیزوں کو سوچا کرو۔ اول تو اپنے اعمال سیدہ کو یاد کرو اور خدا تعالیٰ نے جو اس پر سزا مقرر فرمائی ہے اس کو سوچا کرو اور اس کے بعد اپنے نفس سے

کہو کہ اے نفس تو کیوں ہلاک ہوتا ہے دیکھ تو سہی ان اعمال کی یہ پاداش تجھ کو بھگتنا پڑے گی اور اس کے بعد اپنے مرنے سے لے کر جنت اور جہنم کے داخل ہونے تک جو جو واقعات پیش آنے والے ہیں مثلاً قبر میں جانا منکر تکبیر کا سوال کرنا حساب کتاب پل صراط سب واقعات تفصیل کے ساتھ سوچو یہ وظیفہ اپنا روزانہ رکھو دیکھئے تو سہی کیا شمرہ ہوتا ہے۔ (خواص الکیہ ص ۳۱)

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ

ترجمہ: اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے

تفسیری نکات

سمع کو مفرد لانے میں نکتہ

ایک اور نکتہ بیان کرتا ہوں کہ دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ہے وجعل لكم السمع والابصار والافئدة اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے اس میں ابصار و افئدة کو جمع لایا گیا ہے اور سمع کو مفرد مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا تھا کہ سمع ایسی چیز ہے کہ بہت سے سننے والے ایک دم سنتے ہیں اس لئے وہ سب مل کر مثل ایک کے ہیں۔ مجلس واحدہ میں عادتاً یہی ہوتا ہے کہ سب ایک دم سنیں یہ نہیں کہ علی التعاقب سنیں تو گویا سب سمع جمع ہو کر سمع واحد کے حکم میں ہیں اور ابصار میں تعاقب ہو سکتا ہے اسی طرح قلوب کے فہم میں بھی تعاقب ہوتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ ادراک سمع کا واحد تھا اس لئے سمع کو مفرد لائے بخلاف ابصار و قلوب کے کہ ان کا ادراک علی التعاقب جدا ہو سکتا ہے اور اس نکتہ کی ضرورت اس مقام پر ہوگی کہ ابصار و قلوب بدون اضافت الی ضمیر الجمع آیا ہو ورنہ اضافت الی ضمیر الجمع (ضمیر کی جمع کی طرف مضاف ہونے کے بغیر کے وقت تو بوجہ مقابلہ جمع بالجمع کے ابصار و قلوب بھی حکم مفرد میں ہو جاویں گے۔ اب ایک نکتہ اور بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ ختم اللہ علی سمعہم (ان کے کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی) آیت میں قلب اور سمع کے لئے ختم لائے اور بصر کے واسطے غشاوة لائے اس میں بھی ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ قلوب اور سمع کا ادراک کسی ایک جانب کے ساتھ خاص نہیں تو ان کے ابطال ادراک کے لئے سب جوانب سے موانع کے احاطہ کی ضرورت ہے اور ختم میں ایسا ہے احاطہ ہوتا ہے جو سب جوانب سے مانع ہوتا ہے بخلاف بصر کے کہ اس کا ادراک صرف جہتہ مقابلہ سے ہوتا ہے سو اس کے مانع کا بھی ایک جانب سے ہونا کافی ہے اور

غشاوة ایک ہی جانب سے ہوتا ہے اس لئے فرمایا ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم (یعنی ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی) و علی ابصارہم غشاوة یعنی ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور یہ نکتہ جب ہے کہ و علی سمعہم کا عطف علی قلوبہم پر ہوا اور بعض مفسرین و علی ابصارہم کا عطف علی قلوبہم پر نہیں کرتے بلکہ اس کو معطوف علیہ قرار دیتے ہیں۔ و علی ابصارہم کا تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا سمع و بصر دونوں پر پردہ ڈالا گیا ہے اور مجھے یاد نہیں کہ اس جگہ عطف میں کیوں اختلاف ہوا ہے میرے نزدیک تو شق اول متعین ہے کیونکہ دوسری جگہ احتمال اول کی تصریح ہے۔ و ختم علی سمعہ و قلبہ و جعل علی بصرہ غشاوة اس کے کانوں اور دل پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا پس جب وہ وجہ محتمل ہی نہیں تو میں اس کی توجیہ میں دماغ کیوں تھکاؤں ناحق کے نکتے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔

کوئی احتمال کی بناء پر سوال کرے اور کہے کہ آخر اس کا احتمال تو ہے ہی کہ علی سمعہم کا عطف علی قلوبہم پر ہو تو میں کہوں گا کہ ایسے احتمالات کا اعتبار نہیں ہے کیا قرآن شریف دوبارہ نازل ہوگا جب دوسری جگہ قرآن شریف میں صرحاً و ختم علی سمعہ و قلبہ و جعل علی بصرہ غشاوة اس کے کانوں اور دل پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا) موجود ہے تو پھر اس جگہ بھی اس کے مطابق توجیہ کیوں نہ کی جاوے۔

مدرکات قلب کا بیان

اب اس کا بیان کرتا ہوں کہ اس آیت میں ان مدرکات ثلاثہ میں سے کن مدرکات کا بیان ہے سوا اول نظر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ فقط ایک مدرک کا بیان ہے یعنی فقط بصر کا ذکر ہے مگر بعد تامل معلوم ہوتا ہے کہ دو کا ذکر ہے ایک بصر کا عینین میں دوسرے قلب کا گو اس کا ذکر منظوقاً نہیں کیا ہے۔ مگر وھدیناہ النجدین۔ میں مفہوم ما ذکر کر دیا پس ہدیناہ النجدین میں نعمت قلب کا تذکرہ ہے کیونکہ فعل قلب کا ہے قلب ہی سے تو ہدایت کا ادراک ہوتا ہے اور یہی قلب مخاطب ہے امر و نہی کا اور یہی مدرک ہے کلیات و جزئیات کا گو بواسطہ آلات سمی اور وہ آلات عقل و حواس ہیں ظاہر ابھی باطنہ بھی اور یہ قلب حافظہ ہے کلیات و جزئیات مدرک کو نظوا ہر نصوص سے مفہوم ہوتا ہے اور گو یہ حکماء کے خلاف ہے کہ انہوں نے اختلاف مدرکات (بصیرۃ المفعول) سے خود مدرکات (بصیرۃ الفاعل) میں بھی اختلاف کا دعویٰ کیا ہے۔ کلیات کے لئے عقل اور جزئیات کے لئے حواس پھر مختلف مدرکات کے لئے حافظات بھی جدا جدا مانے ہیں مگر متکلمین کو یہ مضرت نہیں کیونکہ یہ قول حکماء کا سب بناء الفاسد علی الفاسد ہے کیونکہ اس تغایر کی ضرورت ان کو الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد (واحد سے ایک

ہی صادر ہوتا ہے) کی وجہ سے ہوئی ہے جیسا کتب فلسفہ میں مشہور ہے اور یہ قاعدہ خود غلط ہے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے و نیز اس قاعدہ میں خود حکماء نے تصریح کی ہے کہ یہ قاعدہ واحد حقیقی کے متعلق ہے اور قوی مدرکہ کی وحدت حقیقہ خود باطل ہے۔ نامعلوم یہ حکماء کہاں چلے جاتے ہیں اصل مسئلہ میں تو واحد کے ساتھ حقیقی کی قید لگاتے ہیں اور تحقیق فروع کے وقت اس قید کا خیال نہیں کیا جاتا۔ کتنی بڑی غلطی ہے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ حجے کئے تبت کے اور رواں پڑھا بخ البتہ آلات اور ان کے تغائر کا دعویٰ صحیح ہے جس کی سیدھی دلیل انی مشاہدہ ہے مگر حکماء نے دلیل لمی بیان کرنا چاہا اور مدرکہ (بافتح) مختلف پائے گئے اس لئے قاعدہ مذکورہ کی بناء پر مختلف مدرکات کی ضرورت پڑی پھر جن جن مدرکات میں قابلیت جس جس کی ادراک سمجھے ایک ایک ادراک کو ان کے سپرد کر دیا۔ جن میں سب مدرکات (بافتح) حسیہ تو ادراک و حفظا حواس کے متعلق ہو گئے مگر مدرکات کلیہ باقی رہ گئے ان کا مدرک عقل کو تجویز کیا مگر کوئی حافظ ان کلیات کا نہیں ملا تو عقلی گھوڑے دوڑائے اور کوئی نہ تھا تو عقل فعال کا نام دے دیا اور عقل فعال کو کھینچ لائے۔

سُورَةُ الْحَاقَّةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝

ترجمہ: اور (علم ہوگا) کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے صلے میں جو تم نے گذشتہ ایام (یعنی زمانہ قیام میں کئے ہیں)

تفسیری نکات

ایام خالیہ کی تفسیر

پس ارشاد فرماتے ہیں کہ قیامت میں اصحاب الیمین سے کہا جائے گا کلووا و شربوا ہنیئاً بما اسلفتم فی الايام الخالیہ کہ کھاؤ اور پیو ان اعمال کے عوض میں جو تم نے ایام خالیہ میں کئے ہیں۔ ایام خالیہ کی ایک تفسیر ابن عدی و بیہقی نے وہ نقل کی ہے جو پہلے سے میرے دل میں تھی اور اسی کی بناء پر میں نے اس آیت کو بیان کے لئے اختیار کیا تھا مگر مجھے تلاش تھی کہ اس کی تائید سلف کے کلام سے بھی مل جائے بدوں تائید سلف کے میں قرآن کے ایک لفظ کی تفسیر بھی گوارا نہیں کرتا کیونکہ تفسیر بالرأے سے ڈر لگتا ہے ہاں نکات و لطائف بیان کرنے کا مضائقہ نہیں کیونکہ وہ تفسیر میں داخل نہیں بلکہ امر زائد کی قبیل سے ہیں بہر حال مجھے تلاش تھی کہ ایام خالیہ سے جو میں نے سمجھا ہے اس کی تائید منقول سے مل جائے اول اور تفاسیر دیکھیں جلالین وغیرہ مگر کسی میں اس کی موافقت نہ ملی پھر اخیر میں درمنثور میں تلاش کیا تو اس میں ابن منذر و ابن عدی اور بیہقی کی تخریج سے نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن رفیع نے بما اسلفتم فی الايام الخالیہ (یہ بدلہ ہے اس کا جو ایام خالیہ میں تم نے کئے ہیں) کی تفسیر میں فرمایا ہے هو الصوم (وہ روزے ہیں) قلت و عزاه القمی فی تفسیر الی مجاہد و الکلبی قالا ہی ایام الصیام قال القمی فیکون الاکل والشرب فی الجنة بدل الا

مساك عنهما في الدنيا (ج ۲۹ ص ۳۴) (میں کہتا ہوں تمہی تفسیر میں مجاہد و کلبی کی طرف منسوب کیا ہے انہوں نے کہا ایام خالیہ سے مراد روزے کے دن ہیں لہذا کھانا پینا جنت میں دنیا میں کھانے پینے سے رکنے کا بدل ہو جائے گا) اگر یہ تائید نہ ملتی تو بڑی فکر ہوتی اور مجھے کوئی دوسری آیت تلاش کرنا پڑتی۔ مگر دل اسی کے بیان کو چاہتا تھا کیونکہ اول ذہن میں یہی آئی تھی اور اس کے ہی متعلق ایک خاص مضمون ذہن میں بھی آ گیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ تائید مل گئی اور مجھے دوسری آیت تلاش کرنا نہ پڑی اب سنئے کہ مشہور تفسیر تو ایام خالیہ کی ایام ماضیہ ہے اور میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ ایام خالیہ سے مراد وہ ایام ہیں جو طعام و شراب سے خالی تھے۔ یعنی ایام صیام چنانچہ سلف کے کلام سے بھی اس کی تائید ہو گئی دوسرے عقلی طور پر ظاہر یہ ہے کہ جزا مناسب عمل ہو اور نصوص میں غور کرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور صوفیہ نے تو اس کو کشفی طور پر بیان کیا ہے اس قاعدہ سے بھی صوم کا عوض اکل و شرب ہی ہونا چاہیے۔

فہو فی عیشة راضیہ فی جنة عالیہ قطر فہا دانیہ کلوا واشربوا ہنیئنا بما اسلفتم فی الایام الخالیہ کہ وہ شخص نہایت چین میں ہوگا۔ بلند جنت میں ہوگا جس کے میوے نزدیک ہیں (یعنی جھکے ہوئے ہیں جن کے توڑنے میں کوئی دشواری نہیں پھر ارشاد ہے کلوا واشربوا الخ کہ ان سے کہا جائے گا کھاؤ پو بعض اس کے کہ تم نے ایام خالیہ میں کیا ہے۔

چونکہ ایام خالیہ کی تفسیر مختلف ہے اس لئے میں ابھی اس کا ترجمہ نہیں کرتا بلکہ تحقیق بیان کرنے کے بعد ترجمہ کروں گا۔

کھانے پینے کی رعایت

پہلے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اکل و شرب (کھانے پینے) کا ذکر مستقل طور پر کیوں کیا۔ حالانکہ فہو فی عیشة راضیہ میں یہ بھی داخل ہو چکا تھا تو اس افراد بالذکر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کھانے پینے کا سب سے زیادہ عاشق ہے اور اس کے سوا جتنی مستیاں وہ سب اسی کے تابع ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کو جو کسی عورت یا مرد پر عاشق ہو چار پانچ دن تک کھانے پینے کو نہ دیا جائے پھر اس سے پوچھا جائے کہ بتلاؤ روٹی اور پانی لاؤں یا عورت اور مرد کو بلائیں تو وہ اس وقت روٹی اور پانی ہی کی درخواست کرے گا اور عورت اور مرد کے عشق کو بھول جائے گا۔ اسی طرح اور سارے مطلوبات کو دیکھ لیا جائے تو سب کا مدار اسی پر ہے چنانچہ اسی کے لئے نوکری اور ملازمت کی جاتی ہے اور اسی کیلئے تیری میری غلامی کی جاتی ہے۔ بعض دفعہ آدمی اس سے گھبرا کر یوں بھی کہنے لگتا ہے کہ یہ دوزخ کہاں کا لگ گیا مگر پھر بھی اس دوزخ کے بھرنے سے نہیں رکتا ایک وقت بھرنے کے بعد پھر دوسرے وقت کے لئے فکر ہے کہ شام کو اسے کس چیز سے بھرا جائے گا اور یہاں

سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے جذبات کی کس قدر رعایت فرمائی ہے۔

وما هو بقول شاعر (الحاقہ آیت ۴۱)

اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔

ملفوظ ۱۸: ”وما هو بقول شاعر“ پر اشکال اور اس کا جواب

ارشاد فرمایا قرآن شریف میں ہے وما علمناہ الشعر وما ينبغي له اور وما هو بقول شاعر حالانکہ قرآن کی بہت سی آیتیں نظم پر منطبق ہیں جیسے فاصبحوا لایری الامساکنہم یا جیسے یرزقہ من حیث لا یحتسب پھر اس کے کیا معنی؟ جواب یہ ہے کہ ایک تو انطباق ہے اور ایک تطبیق ہے۔ ممانعت اگر ہے تو تطبیق کی ہے نہ انطباق کی۔ یعنی قصداً اوزان شعری پر منطبق کرنے کی ممانعت ہے۔ اور ایک منطبق ہو جانا اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اسی تفصیل پر تغنی بالقرآن کے حکم ہے، اگر قصد غنا کے ہو تو ممانعت ہے والا فلا یعنی اصل مقصود تو ادائے حروف اس میں اگر تبعاً کوئی غنا کی صورت پیدا ہو جائے کچھ حرج نہیں قصد تغنی کے نہ ہونا چاہیے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۳۳)

سُورَةُ نُوحٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۖ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي

إِلَّا فِرَارًا ۖ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ

فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَعْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصْرُوا وَاسْتَكْبَرُوا وَاسْتَكْبَرُوا ۖ

ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۖ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ

لَهُمْ إِسْرَارًا ۖ

ترجمہ: آخر نوح علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی اور دن کو بھی (دین حق کی طرف بلایا) سو میرے بلانے پر دین سے اور زیادہ بھاگتے رہے اور (وہ بھاگنا یہ ہوا کہ) میں نے جب کبھی ان کو دین حق کی طرف بلایا تا کہ آپ ان کو بخش دیں تو انہوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں دے لیں اور (نیز زیادتی کی انتہا ہے) اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹ لئے اور اصرار کیا اور (میری اطاعت سے) غایت درجہ کا تکبر کیا پھر بھی میں نے ان کو بہ آواز بلند فرمایا پھر میں نے ان کو خطاب خاص کے طور پر ان کو علانیہ بھی سمجھایا اور خفیہ بھی سمجھایا۔

تفسیری نکات

حضرت نوح علیہ السلام کی غایت شفقت

بعض ظالم مصنف نوح علیہ السلام کی بابت کہتے ہیں کہ ان میں شفقت و رحم نہ تھا اور یہ دلیل لکھی کہ انہوں نے اپنی قوم کے لئے بہت ہی سخت بددعا کی ہے۔ رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیاراً (خداوند!)

کافروں میں سے زمین پر ایک بھی بسنے والا نہ رہے)

میں کہتا ہوں کہ اس شخص نے نوح علیہ السلام کی بددعا کو تو دیکھ لیا مگر اس کو نہ دیکھا کہ انہوں نے اس ظالم قوم کی تکلیفیں کتنی مدت تک برداشت کیں اس شخص کو بڑا ہمدردی قوم کا دعویٰ ہے ذرا وہ نو مہینے ہی ایسی تکالیف برداشت کر کے دکھلا دے نانی یاد آ جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ نوح علیہ السلام کا ساڑھے نو سو برس تک تبلیغ کرتے رہنا اور قوم کی اصلاح میں سعی کرتے رہنا اور ان تکلیفوں کو سہتے رہنا جس کا ذکر اسی آیت میں ہے۔

قال رب انی دعوت قومی لیلاً ونهاراً الی قولہ ثم انی دعوتہم جہاراً ثم انی اعلنت لہم واسررت لہم اسراراً یہ ان کی غایت درجہ شفقت کی دلیل ہے جب اصلاح سے مایوس ہی ہو گئے اور مایوسی بھی وحی سے واقع ہوئی جیسا اس آیت میں ہے۔

واوحی الی نوح انہ لن یومن من قومک الا من قد امن الی قولہ ولا تخاطبنی فی

الذی ظلموا انہم مغرورون

اور یہ سمجھا کہ اب ان سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا سخت اندیشہ ہے اور بظاہر نہ یہ خود ایمان لائیں گے نہ اس کی اولاد میں کسی کے مومن ہونے کی امید ہے اس وقت انہوں نے بددعا کی چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں۔

انک ان تذرہم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً

جب تک ان کو اصلاح کی امید رہی اس وقت تک تبلیغ کرتے رہے مصائب جھیلتے رہے جو ایک سال دو سال کی مدت نہ تھی بلکہ اکٹھے ساڑھے نو سو برس اسی حال میں گزر گئے جب ان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور مسلمانوں کو ان کے وجود سے خطرہ ہونے لگا اس وقت مسلمانوں کے حال پر رحم کر کے کفار پر بددعا کی تو یہ بددعا بھی حقیقت میں رحمت تھی اور اس کا منشاء بھی شفقت ہی تھی یعنی مسلمانوں کے حال پر مگر لوگوں میں مرض یہ ہے کہ وہ صرف ایک پہلو کو دیکھ کر اعتراض کر دیتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا بے رحمی نہیں

تو بتلائے اس حالت میں اگر نوح علیہ السلام ان کے لئے بددعا نہ فرماتے تو اس کا انجام کیا ہوتا ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی مسلمان بہت ہی کم معدودے چند تھے اور کفار کے متعلق معلوم ہو چکا تھا نہ یہ خود ایمان لائیں گے نہ ان کی اولاد میں کوئی مومن ہوگا اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یہ یقین نہ تھا کہ سب ایمان دار ہی ہوں گے بلکہ ان میں بھی ایمان دار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونے والے تھے بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ کفار ہی کو ہونے والا تھا۔ اب اگر اس زمانہ کے کافر غرق نہ کئے جاتے

اور ان کی اولاد بھی اس وقت موجود ہوتی تو مسلمانوں کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔

(احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جتنے لوگ موجود ہیں وہ نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں جب تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اس قدر غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آ رہا ہے تو دنیا بھر کے آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہ ہوتا۔ خصوصاً جبکہ ان کفار کی اولاد میں مسلمان کوئی نہ ہوتا سب کافر ہی ہوتے اس مقدمہ کے ملانے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کے حال پر بہت ہی رحم فرمایا جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بددعا کی ورنہ آج کفار کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آ جاتی اور ان کو جینا محال ہو جاتا ۱۳)

غرض اس سیرت کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے واسطے ایسی سخت بددعا کی جو بے رحمی معلوم ہوتی ہے مگر اس نے دوسرے پہلو کو نہ دیکھا کہ ان کی یہ بددعا مسلمانوں کے حق میں خود جن میں یہ مصنف بھی داخل ہے سراسر رحم تھی ورنہ میاں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دو بھر ہو جاتا یہ اعتراض تو نوح علیہ السلام پر تھا۔ (العمرہ بذب البقرہ ملحقہ مواعظ راہ نجات ص ۳۲۷)

سُورَةُ الْمَرْمَلِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الْمَرْمَلُ ۝ قُمْ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوْ انْقُصْ

مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝

ترجمہ: اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی یعنی نصف رات کہ (اس میں قیام نہ کرو بلکہ آرام کرو یا اس نصف سے کسی قدر کم کرو یا نصف سے کچھ بڑھا دو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو۔

تفسیری نکات

تہجد کی مشروعیت قرآن سے اور تراویح کی سنت

حدیث سے ثابت ہے

اس کی دلیل ہے پھر دوسرا کوع گیارہ بارہ مہینے میں نازل ہوا جس کا حاصل اس فرضیت کا منسوخ کر دینا ہے اور تراویح کی نسبت حضور فرماتے ہیں سنت لکم قیامہ میں نے تمہارے لئے اس میں تراویح مسنون کی ہے (۱۲) اگر یہ تہجد ہے تو اس کو حضور نے اپنی طرف کیوں منسوب کیا۔ اس سے لازم آتا ہے کہ جو خدا کی طرف سے منسوب ہے وہ حضور اپنی طرف منسوب فرماتے ہیں لہذا معلوم ہوا کہ تہجد اور ہے جس کی مشروعیت حق تعالیٰ کے کلام سے ثابت ہوتی ہے اور تراویح اور ہے جس کی سنت حضور کے ارشاد سے ثابت ہوتی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ تعالٰ امت نے دونوں میں فرق کیا ہے۔ غرض یہ عبادت مخصوص ہے اس کے ساتھ اور حقیقت اس کی نماز ہے۔

اہل اللہ کی گستاخی کا انجام

وذرنی الخ میں تسلی ہے حضور کی مجھ کو ان مکذبین کے ساتھ نبٹنے دو اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ مقبولان حق کے ساتھ گستاخی کرنے سے خود حضرت حق تعالیٰ انتقام لیتے ہیں چنانچہ ذرنی فرمایا۔
بس تجربہ کر دیم الخ ہر کہ در افتاد بر افتاد بیچ قومی را خدا رسوا کند تا دل صاحب دلی نامہ بدرد

گلیم پیچیدہ کا ثبوت

یا ایہا المزمّل بمعنی گلیم پیچیدہ میں اشارہ اس طرف ہے کہ صوفیہ کا یہ بھی ایک طریق ہے کہ اپنے بدن کو جس میں سر بھی داخل ہے کپڑے میں لپیٹے رہیں تاکہ نگاہ منتشر نہ ہونے پائے اس سے قلب بھی منتشر ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

انداز مخاطب میں حکمت

یا ایہا المزمّل قم الیل الا قليلا نصفه او انقص منه قليلا اوزد علیہ الایۃ
یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم اس کا امت کو بھی شامل ہے اور مزمّل کے معنی ہیں چادر اوڑھنے والا چونکہ رسول اللہ ﷺ کو کفار کی تکذیب سے بہت تکلیف ہوئی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو یہ چاہتے تھے کہ یہ کم بخت ایمان لائیں تاکہ جہنم سے چھوٹ جائیں اور وہ لوگ ایمان تو کیا لاتے الٹا تکذیب پر کمر باندھ رکھی تھی اور آیت الہی سے تمسخر اور مقابلہ کیا کرتے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدت غم ورنج و حزن سے چادر اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے اس لئے خاص اس حالت کے اعتبار سے یا ایہا المزمّل نداء و خطاب میں فرمایا گیا تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گونہ تسلی ہو اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ہجوم اعداء اور ان کے طعن و تشنیع سے تنگ آ گیا ہو اس وقت محبوب خاص اسی حالت کے عنوان سے اس کو پکارے جس کیساتھ اس کا تلبس ہے۔

تو دیکھئے اس شخص کو کتنی تسلی ہوگی اور اس لفظ کی کتنی لذت معلوم ہوگی جس کی ایک وجہ یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ محبوب کو میرے حال پر نظر ہے ایسا ہی یہاں بھی یا ایہا المزمّل کے عنوان سے جو کہ مناسب وقت سے ہے نداء دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔ اور بعد اس کے بعض اعمال کا حکم دیا جاتا ہے اور ان بعض ارضی احوال پر صبر کرنے کا ارشاد فرماتے ہیں چنانچہ ایک دوسرے مقام پر بھی اسی طرح فرمایا ہے کہ فاصبر علی ما یقولون و سبح بحمد ربک اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے اوپر کہ مثال میں اس شخص کا محبوب اس کو یہ

کہے کہ میاں تم ہم سے باتیں کرو ہم کو دیکھو۔ دشمنوں کو بکنے دو جو بکتے ہیں آؤ تم ہم سے باتیں کرو۔ وہ کام کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو یہ تسلیہ بذریعہ وحی کے ہو مگر امت میں اور اہل اللہ کو اس قسم کے خطابات وغیرہ بذریعہ الہام اور واردات ہوتے ہیں۔ اور اس مقام لفظ مزمل کی تفسیر سے ایک مسئلہ نکلتا ہے وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر اوڑھنے کی وجہ شدت ملال و حزن تھی اس سے ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال کے بشریت سے نہیں نکلتا جیسا یہاں پر بوجہ تکذیب مخالفین کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مغموم ہونا معلوم ہوتا ہے ہاں اتنا فرق ہے کہ ہم لوگوں کا غم ایسے مواقع پر بوجہ تنگ دلی و ضعف تحمل کے ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غم غایت شفقت اور رحم کے تھا آپ اس پر مغموم تھے کہ اگر لوگ ایمان نہ لائیں گے تو جہنم میں جائیں گے اس وجہ سے ان پر رحم آتا تھا اور غم پیدا ہوتا تھا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے لعلک باسع نفسک الخ شاید ان کے ایمان نہ لانے پر جان دیدیں گے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مکیر گر چہ ماند در نوشتن شیر و شیر

نیک لوگوں کو اپنے اوپر مت قیاس کرو اگر چہ شیر اور شیر کو لکھنے میں ایک ہی ہیں مگر معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اب ندائے یایہا المزممل کے بعد احکام کا بیان ہوتا ہے حاصل احکام کا یہ ہے کہ تعلق دو طرح کے ہوتے ہیں ایک خالق کے ساتھ دوسرا مخلوق کے ساتھ اور یہ تعلق دو قسم کا ہے موافق کیساتھ اور مخالف کے ساتھ اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے قم اللیل الا قلیلاً اس میں ایک تو قیام و ادب تعلیم کیا ہے اور اس کے ساتھ اقتصاد میانہ روی کا ارشاد فرمایا ہے ادب یہ کہ قیام لیل کے لئے وہ وقت مقرر کیا گیا ہے جو کہ نہ بھوک کی تکلیف کا وقت ہے اور نہ معدے کی پری کا وقت ہے کہ طبیعت میں گرانی اور بوجھ ہو اور قیام میں کدورت ہو بلکہ ایسا وقت دونوں تکلیفوں سے خالی ہے اور طبیعت میں نشاط اور سرور ہوتا ہے اور اس میں تشبہ بالملائکہ بھی ہوتا ہے کہ نہ بھوک لگے نہ پیاس لگے نیز رات کے وقت یکسوئی ہوتی ہے اور اقتصاد یہ کہ ساری رات کے قیام کا حکم نہیں دیا کیونکہ اس میں سخت تعب ہوتا ہے بلکہ کچھ حصہ سونے کے لئے بھی مقرر کیا گیا ہے اور چونکہ ہر وقت اور ہر حالت میں ہر شخص کے لئے معین مقدار متعین نہیں ہو سکتی اس لئے اونچیر یہ سے نصف اور ثلث اور دو ثلث میں جو مفہوم ہے او انقص منه قلیلاً اوزد علیہ کا جیسا کہ دوسرے رکوع سے معلوم ہوتا ہے اختیار دے کر مخاطب کی رائے پر چھوڑا گیا کہ اگر زیادہ قیام نہ ہو سکے تو تھوڑا ہی سہی حدیث میں ہے۔ وشیء من الدلجة اس اقتصاد میں ایک یہ بھی مصلحت ہے اور حکمت ہے کہ توسط میں دوام ہو سکتا ہے اور افراط میں دوام نہیں اور پہلے یہ قیام اللیل کہ مراد تہجد ہے فرض تھا بعد اس کے فرض منسوخ ہو کر مسنونیت باقی رہ گئی اور اقرب الی الدلیل

تہجد کا سنت فرض تھا بعد اس کے فرض منسوخ ہو کر مسنونیت باقی رہ گئی اور اقرب الی الدلیل تہجد کا سنت موکدہ ہونا ہے تہجد سے محروم رہنے والوں کو اکثر غلطیاں ہونے لگی ہیں۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تہجد صرف اخیر شب کو ہوتا ہے اور اس وقت اٹھنا دشوار ہے اس لئے انہوں نے چھوڑ رکھا ہے کہ اگر اخیر شب میں نہ اٹھ سکو تو اول شب میں ہی پہلے پڑھنا جائز ہے بعض سمجھتے ہیں کہ تہجد کے بعد سونا نہیں چاہیے سونے سے تہجد جا تا رہتا ہے یہ لوگ اس لئے نہیں اٹھتے یہ بھی غلطی ہے تہجد کے بعد سونا بھی جائز ہے غرض اہل سلوک کے لئے تہجد کا یہ عمل بھی ضروری ہے اگر کبھی قضاء ہو جائے تو زیادہ غم میں نہ پڑے تہجد کی قضا بعد میں کر لے اس آیت سے یہی مراد ہے۔ وهو الذی جعل اللیل والنهار خلفة لمن اراد ان یذکر الخ بعض لوگوں کا اگر تہجد قضا ہو جائے تو لوگ حد سے زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں اور کراہتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ہمارا تہجد کبھی قضا نہ ہوا تھا یا در کھواتی پریشانی کا بعض اوقات یہ انجام ہوتا ہے کہ مطالعہ محبوب میں مشغول ہونے کی بجائے خود کے مطالعے میں مشغول ہو جاتے ہیں حالانکہ اس غم میں لگ کر اصل ذکر سے جو کہ مقصود ہے رہ جاتے ہیں اور انسان مطالعہ محبوب کے لئے پیدا ہوا ہے۔

ان ناشئة اللیل الخ میں ارشاد ہے کہ رات کو اٹھنے کے وقت چونکہ شور اور شغب سے سکون ہوتا ہے اور معاش کا وقت بھی نہیں ہوتا اس لئے قلب میں یکسوئی ہوتی ہے اس لئے اس وقت جو کچھ زبان سے پڑھا جاتا ہے دل پر بھی تاثیر ہوتی ہے اس مضمون میں ما قبل والی آیت ورتل القرآن ترتیلا کی تعلیل ہے کہ اس وقت بوجہ اور اسباب کے حضور قلب زیادہ ہوتا ہے لہذا قیام لیل اور ترتیل کا فائدہ اس وقت پورے طور سے حاصل ہوگا اس کے بعد ان لک فی النہار الخ میں بطور حکمت بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو دن میں اور بھی کام رہتے ہیں مثلاً تبلیغ دین اور تربیت خلائق خود بھی دین ہے لیکن چونکہ اس میں ایک قسم کا تعلق مخلوق سے ہوتا ہے لہذا اس میں خاص قسم کی توجہ الی اللہ پورے طور پر نہیں ہو سکتی جیسی خلوت میں ہو سکتی ہے۔

اہمیت تلاوت و نماز

اب دوسرا معمول اہل سلوک کا مذکور ہوتا ہے۔ ورتل القرآن ترتیلا ترتیل کے معنی ہیں تھام تھام کر پڑھنا صحابہؓ کے زمانہ میں ایک یہ بھی طریق حصول نسبت کا تھا کہ قرآن اور نماز پر مداومت اور محافظت کرتے تھے چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں دریافت کرنا کہ آج کل کے صوفیہ کے طریقوں میں سے کون سا طریقہ آپ کے موافق ہے اور اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد کہ ہمارے زمانے میں تقرب کا ذریعہ ذکر کے ساتھ قرآن اور نماز بھی تھا اور اب صرف ذکر پر اکتفا کر لیا ہے مشہور ہے اور اس تغیر کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ صحابہ کے قلوب بہ برکت صحبت نبویؐ اس قابل تھے

کہ ان کو اور قیود کو جو بعد میں حادث ہوئیں ضرورت نہ تھی ان کے قلوب میں صحبت نبویؐ کے فیض سے خلوص پیدا ہو چکا تھا وہ حضرات تلاوت قرآن اور کثرت نوافل سے بھی نسبت حاصل کر سکتے تھے ان کو اذکار کے قیود زائد کی حاجت نہ تھی برخلاف بعد کے لوگوں کے کہ ان میں وہ خلوص بدوں اہتمام کے پیدا نہیں ہو سکتا اس لئے صوفیہ کرام نے جو اپنے فن کے مجتہد گزرے ہیں اذکار اشغال خاصہ اور ان کی قیود ایجاد کیں اس وجہ سے کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلوت میں جب ایک ہی اسم کا بتکرار ورد کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ضرب و جہر وغیرہ قیود مناسبہ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے اور اس کی تاثیر نفس و قلب میں واقع و اشیت ہوتی ہے اور رقت و سوز پیدا ہو کر موجب محبت ہو جاتا اور محبت سے عبادت میں اخلاص پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ عبادت خالص کا حکم فرماتے ہیں۔ وما امر و الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين و امرت ان اعبد الخ وغيره من الا آیات پس معلوم ہوا کہ حضرات صوفیہ نے یہ قیود ذکر کے طور پر معالجہ تجویز فرمائی ہیں اور اصل مقصد وہی اخلاص ہے پس اگر کسی شخص کو ان قیود سے مناسبت نہ ہو یا بغیر ان قیود کے کسی کو اذکار مسنونہ نوافل و تلاوت قرآن میں پورا اخلاص پیدا ہو سکتا ہے تو صوفیہ کرام ایسے شخص کے لئے ان قیود کی ضرورت نہیں سمجھتے پس اب معلوم ہو گیا کہ یہ تمام قیود اصلاح و تقویت کے واسطے علاجاً تجویز کئے گئے ہیں کوئی شرعی امر قربت مقصود نہیں سمجھا جاتا جو بدعت کہا جائے۔

اب کامل کی توجہ الی الخلق میں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ اشتغال بالحق اس کو یا حق سے مانع ہوگا سو اس شبہ کی منتہی کامل کے حق میں گنجائش نہیں کیوں کہ منتہی کی سبب وسعت صدر کے یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کو شغل خلق یا یا حق سے مانع نہیں ہوتا اور نیز خلق کے ساتھ اس کا مشغول ہونا بھی بامر حق ہوتا ہے اور اس کو مقصود اس سے امتثال امر اور رضائے حق جل و علا ہی ہوتی ہے اور خلق کی طرف اس کی توجہ خدا ہی کے لئے ہوتی ہے اس لئے اس کو اشتغال بالخلق مانع عن الحق نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اشتغال خود حقوق خلق سے ہے اور اس آیت میں سجا طویلا بطور جملہ معترضہ کے مخلوق کے اس حق کی طرف اشارہ ہے اور مخلوق کا وہ حق یہ ہے کہ نصیح عام تربیت ارشاد لیکن اس حق خلق میں حق خالق کو نہ بھولنا چاہیے چنانچہ یہاں بھی مخلوق کے حقوق کے بیان سے پہلے قم ایل الخ میں حقوق اللہ بیان کئے گئے تھے اور مخلوق کے حقوق کے بعد بھی و اذکر اسم ربک فرمایا گیا ہے تو گویا یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اس شغل میں ہمیں نہ بھول جانا اول آخردونوں جگہ یاد دلا یا گیا ہے اور و اذکر اسم ربک میں اکثر مفسرین لفظ اسم کو زائد کہتے ہیں اور بعض زائد نہیں قرار دیتے اور اس اختلاف سے یہاں ایک عجیب مسئلہ مستفاد ہو گیا اور اختلاف امتی رحمۃ کا ظہور ہو گیا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ اہم قول کا تو موافق حالت منتہی کے ہے اور عدم زیادہ کا قول موافق حالت مبتدی کے ہے کیونکہ مبتدی کو خود سعی اور مذکور کا تصور کم

جما ہے اس کے لئے یہی کافی ہے کہ اسم ہی کا تصور ہو جائے برخلاف منہی کے کہ اس کو ملاحظہ ذات بلا واسطہ بہل ہے اور حدیث ان تعبد اللہ کانک تراہ میں مشہور توجیہ پر منہی کا طریق اور اس کا بیان ہے اور علم کے لئے حضور کا ایک آسان اور بہل طریقہ خدا کے فضل سے سمجھ میں آیا ہے اور وہ یہ کہ آدمی یہ خیال کر لے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مثلاً فرمائش کی ہے اور میں اس فرمائش پر اس کو سنا رہا ہوں اس سے بہت آسانی سے حضور میسر ہو جاتا ہے اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ وتبتل الیہ تبتیلاً اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تجمل کو صرف واذکر اسم کے متعلق کیا جائے تو اس صورت میں تجمل سے اشارہ ہوگا مراقبہ کی طرف یعنی ذکر کیساتھ مراقبہ ہو اور ایک یہ کہ تجمل کو مستقل حکم کہا جائے مطلب یہ ہوگا کہ علاوہ احکام مذکورہ کے یہ بھی حکم ہے کہ سب سے قطع تعلق کرو بایں معنی کہ سب کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تعلق علمی اور جہی سے مغلوب ہو جائے اور اثر اس مغلوبیت کا تعارض مقاصد کے وقت معلوم ہوتا ہے مثلاً ایک وقت میں دو کام تضاد پیش آئے ایک کام تو اللہ تعالیٰ کے متعلق کا ہے اور دوسرے غیر اللہ کے متعلق کا اور دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو تو ایسے وقت پر اللہ کے کام کو اختیار کرنا اور خلاف مرضی حق کو چھوڑ دینا بس یہی معنی ہیں قطع تعلق کے نہ یہ کہ کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے۔

تعلق حجاب است ذی حاصلے چو پیوندھا بگلسی واصلے

تعلق غیر اللہ حجاب لا حاصل ہیں ان تعلقات کو قطع کر کے تم واصل ہو جاؤ گے البتہ اخلاط میں افراط پیدا کرنا منع ہے اس کے آگے فرماتے ہیں مشرق اور مغرب کا وہی مالک ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو اسی کو اپنے کام کرنے کے لئے معبود قرار دیتے ہیں۔

معمول اہل تصوف

جس کا حاصل تبلیغ دین اور ارشاد و تربیت اور ہے چونکہ موافقین سے تعلق محبت ہے اس کے حقوق بوجہ اس کے کہ وہ حالت طبعی ہے تقاضائے حب کی وجہ سے خود بخود ادا ہو جاتے ہیں اس لئے اس میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہ ہوئی البتہ مخالف کے معاملہ میں ممکن تھا کہ کچھ افراط تفریط ہو جاتی اس لئے اس کا بیان اہتمام سے فرماتے ہیں۔ واصر علی ما یقولون و اھجر ہم ہجرأ جمیلاً مطلب یہ کہ مخالف کی ایذا پر صبر کیجئے اور ان سے علیحدہ رہئے اچھے طور پر کہیں ایسا نہ ہو کہ سختی سے ان کی آتش عناد اور بھڑک اٹھے اور زیادہ تکلیف پہنچائیں ہجر جمیل سے مراد قطع تعلق ہے اس طرح پر کہ قلب پر تنگی نہ ہو پھر جب صبر کی تعلیم دی گئی تو اس تسہیل کے لئے حضور ﷺ کو اپنے انتقام لینے کی خبر سنا کر آپ کو تسلی بھی فرمائی جاتی ہے کہ وذر نی و المکذبین اولی النعمة و مهلهم قليلاً یعنی مخالفین کے معاملے کو ہم پر چھوڑ دیجئے ہم ان سے پورا بدلہ لے لیں گے یہ

خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اہل حق کے مخالفین سے پورا انتقام لیتے ہیں اس لئے بھی مناسب یہی ہے صبر اختیار کیا جائے کیونکہ جب اپنے سے بالادست بدلہ لینے والا موجود ہے تو کیوں فکر کیجئے خدا تعالیٰ کی اس سنت کے مخالف کو آخرت اور دنیا دونوں میں رسوائی ہو جاتی ہے۔

بس تجربہ کر دیم دیر مکافات بادرد کشان ہر کہ در افتاد بر افتاد

بچ توے را خدا رسوا نہ کرد تا دلے صلحہ لے نیامد بدرد

غرض اہل تصوف کی معمول یہ چند چیزیں ہوئیں جن کا بیان اس مقام پر ہوا قیام اللیل یعنی تہجد تلاوت قرآن تبلیغ دین ذکر و تہنل توکل صبر اس لئے اس مجموعہ بیان کو جو کہ اہل تصوف کے معمولات کو بفضلہ حاوی اور شامل ہے سیرۃ الصوفی کے لقب سے ملقب کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور یایہا المزمئل میں دو لطیفے معلوم ہوئے ایک یہ کہ جس طرح آپ بوجہ غایت حزن و الم اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھے اسی طرح بعض اہل طریق کا معمول ہوتا ہے کہ چادر ایسے طور پر لپیٹ لیتے ہیں کہ نظر منتشر نہ ہو اور اس کا قلب منتشر نہ ہو کہ جمعیت کے ساتھ ذکر میں لگا رہے دوسرے لطیفہ یہ المزمئل کے معنی عام ہیں کبھل اوڑھنا بھی ہوتا ہے۔ تو یایہا المزمئل میں اشارہ ہوگا یایہا الصوفی ہے کیونکہ لفظ صوفی میں گواختلاف ہے مگر ظاہر یہی ہوتا ہے کہ مراد موٹا کپڑا کبھل وغیرہ مراد لیا جائے پس صوفی اور مزمئل متقارب المعنی ہوئے۔ (سیرت الصوفی)

وَ اذْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبْتَئِلُ اِلَيْهِ تَبْتِيلاً

ترجمہ: اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اس کی طرف متوجہ رہو۔

تفسیری نکات

انقطاع غیر اللہ

چنانچہ اس میں ایک جملہ تو واذکر اسم ربک ہے اس میں ذکر اللہ کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے اور تبتل الیہ تبتیلاً میں انقطاع کا حکم ہے۔ کیونکہ لغت میں تبتل کے معنی انقطاع ہی کے ہیں۔ رہا یہ کہ انقطاع کس سے؟ تو ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ سے انقطاع تو مراد نہیں کیونکہ الیہ میں صلہ الی خود بتلا رہا ہے کہ انقطاع کے بعد حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا امر ہے پس انقطاع غیر اللہ سے مراد ہوگا۔ بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو صرف تبتل الیہ یہی ایک جملہ دونوں باتوں سے بیان کے لئے کافی تھا کیونکہ جن لوگوں کی نظر عربیت پر ہے وہ جانتے ہیں کہ تبتل و انقطاع کا اصلی صلہ عن ہے جو اس چیز پر

داخل ہوتا ہے جس سے تعلق قطع کیا جاتا ہے اور اس کا اصلی صلہ الی نہیں ہے بلکہ یہ عارضی صلہ ہے اور جس وقت اس کے بعد الی ہوتا ہے اور اس وقت یہ معنی وصول کو متضمن ہوتا ہے اس کو اہل بلاغت تضمین کہتے ہیں پھر کبھی تو ایسے ہوتا ہے کہ متضمن و متضمن دونوں کا صلہ مذکور ہوتا ہے۔ اس وقت تجمل کا استعمال عن والی دونوں کے ساتھ ہوگا اور کبھی صرف الی مذکور ہوتا ہے جو کہ معنی وصول کا صلہ ہے جس کو تجمل کے ضمن میں لیا گیا ہے اور اس کا مدخول وہ ہوتا ہے جس سے وصل ہوگا۔ اور اصلی صلہ یعنی عن مع اپنے مدخول کے حذف کر دیا جاتا ہے مگر لفظوں ہی سے حذف ہوتا ہے ارادہ سے حذف نہیں ہوتا بلکہ ارادہ میں ملحوظ ہوتا ہے اور اس کو حذف اس لئے کر دیتے ہیں کہ وہ تو اس لفظ کا اصلی صلہ ہے اگر محذوف بھی ہوگا تو سننے والے خود سمجھ لیں گے چنانچہ یہاں ایسا ہی ہوا ہے کہ تجمل کا عارضی صلہ الی مذکور ہے اور اصل صلہ عن مقدر ہے لفظ الی سے معلوم ہو گیا کہ تجمل معنی وصل کو متضمن ہے پس معنی یہ ہوئے کہ تجمل عن الخلق الیہ یعنی مخلوق سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے تو چونکہ یہاں معنی انقطاع لفظ تجمل سے اور معنی وصل صلہ الی سے مفہوم ہو رہے ہیں۔ اس لئے یہی ایک جملہ وصل و فصل دونوں پر دلالت کر رہا ہے۔

طریق توجہ

اب سوال ہوگا کہ پھر و اذکر اسم ربک کی کیا ضرورت تھی کہ کیا یہ زائد ہوا تو خوب سمجھ لو کہ یہ بھی زائد نہیں کیونکہ گو تجمل الیہ میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا امر ہو گیا مگر اس میں طریق توجہ کا ذکر نہ تھا و اذکر اسم ربک میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور اس کے بتلانے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ توجہ کے جتنے طریقے ہیں یہاں سب معذرت ہیں توجہ کا ایک طریقہ تو مشاہدہ یعنی رویت ہے اور یہاں حق تعالیٰ کا یہ مشاہدہ نہیں ہو سکتا ہاں آخرت میں ہوگا چنانچہ حدیث مسلم میں ہے لن ترور ربکم حتی تموتوا

ہرگز نہ دیکھو گے اپنے رب کو مرنے سے پہلے اس سے جیسے دنیا میں مشاہدہ کی نفی ہوئی ایسے ہی مرنے کے بعد رویت کا اثبات بھی ہو رہا ہے۔

تجمل الیہ میں وصل و فصل دونوں مذکور ہیں اور یہی خلاصہ ہے طریق کا مگر اس جگہ طریق کا مبداء و منتہی بتلایا گیا ہے کہ فصل مبداء طریق ہے اور وصل منتہی اور ان دونوں کے بیچ میں کچھ وسائط بھی ہیں کیونکہ فصل کے درجات ہیں ناقص اور متوسط اور اعلیٰ پھر جیسا جیسا فصل ہوتا جائے گا ویسا ویسا وصل حاصل ہوتا جائے گا جب تک فصل ناقص ہے وصل بھی ناقص ہے اور جب فصل متوسط ہوگا وصل بھی متوسط ہوتا جائے گا اور جس دن فصل کامل ہو جائے گا فوراً وصل بھی کامل ہو جائے گا۔

میں دیکھتا ہوں کہ مشائخ کا مریدوں کے اجتماع و ہجوم سے جی نہیں گھبراتا نہ ان کی تعظیم و تکریم سے الجھن ہوتی ہے حالانکہ ضرورت ہے کہ کوئی وقت ایسا ہو کہ جس میں مخلوق سے یکسو ہو کر خالق کی طرف متوجہ رہا جائے بھلا اور تو کس شمار میں ہیں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی امر ہے و تبتل الیہ تبشیرا جس میں مفعول مطلق تاکید کے لئے حاصل یہ ہوا کہ مخلوق سے کامل طور پر منقطع ہو کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اور ظاہر ہے کہ کامل توجہ بدوں تفکیک تعلقات کے ہرگز نہیں ہو سکتی تو مشائخ اور سالکین کو تعلقات قائم کرنے کا اہتمام نہ ہونا چاہیے اور لوگوں کے اجتماع و ہجوم سے پریشانی اور تعظیم وغیرہ سے الجھن ہونی چاہیے یہ مذاق پیدا کرو کیونکہ کمال وصول بدوں اس کے نہیں ہو سکتا سوا اگر ان آفات سے بچنا چاہتے ہوتو تجربہ کی بناء پر میری رائے یہ ہے کہ کٹے ملا بن کر رہو کہ نہ ہونہ تعویذ گنڈوں کا سلسلہ ہو درویشوں کا رنگ نہ اختیار کرو اس سے ہجوم خلق ہوتا ہے بلکہ ملانے بن کر رہو تا کہ لوگ صورت دیکھ کر یہ سمجھیں کہ یہ سب خشک مولوی ہیں اور متعلقین کو بھی ایسا بننے کی تاکید کرو۔

ضرورت وصل و فصل

خلاصہ یہ ہے کہ وصل و فصل دونوں کا اہتمام کرو۔ خدا سے تعلق بڑھاؤ اور غیر سے تعلق کم کرو اور اس کا طریقہ کسی محقق سے پوچھو اور اگر شیخ میسر نہ ہو تو محققین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے کام شروع کرو۔ ان شاء اللہ ناکامی نہ ہوگی اور اگر مشائخ محققین موجود ہوں تو ان سے مل کر طریق معلوم کرو اگر ملنا نہ ہو سکے تو خط و کتابت سے مراجعت کرو اور عمل کا اہتمام کرو کیونکہ بدوں عمل کے باتیں یاد کر لینا اور تصوف کے مسائل رٹ لینا محض بے کار ہے اس طریق میں باتیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ صاحب حال ہونے کی ضرورت ہے پھر حال بھی خود مطلوب نہیں بلکہ اصل مطلوب عمل ہے کیفیات و احوال کی ضرورت بھی عمل ہی کے لئے ہے ورنہ خود کیفیات احوال مقصود نہیں ہیں مگر چونکہ حال سے عمل میں سہولت ہو جاتی ہے اس لئے صاحب حال ہونے کی ضرورت ہے بدوں حال کے عادتہ کام نہیں چلتا۔

اور یاد رکھو کہ حال بھی عمل ہی سے پیدا ہوتا ہے بدوں عمل کے حال وغیرہ کچھ حاصل نہیں ہوتا عمل ہی کی برکت سے ظاہر حال بن جاتا ہے اس پر شاید یہ شبہ ہو کہ ابھی تو تم نے عمل کے لئے حال کی ضرورت بتلائی تھی اور اب حال کے لئے عمل کو ضروری کر دیا یہ تو دور ہو گیا تو بات یہ ہے کہ دور جب لازم آتا ہے کہ موقوف و موقوف علیہ متحد ہوں اور یہاں ایسا نہیں بلکہ یہاں حصول حال اختیار عمل پر موقوف نہیں عمل بدوں حال کے بھی ہو سکتا ہے گو مشقت سے ہو تو ایک جگہ حصول موقوف ہے اور دوسری جگہ سہولت و دوام اس لئے دور نہیں پس حاصل یہ ہوا کہ اول

تو ہمت کر کے عمل میں لگے یہاں تک کہ حال پیدا ہو جائے پھر حال پیدا ہونے کے بعد عمل میں ہمت و مجاہدہ کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ سہولت سے ہونے لگے گا۔

اب میں ختم کرتا ہوں دعا کرو کہ حق تعالیٰ ہم کو حال و عمل عطا فرمائیں۔ (آمین)

ذات حق کی طرف توجہ کا طریقہ

واذکر اسم ربک میں بھی یہی طریقہ بتلایا گیا ہے اس لئے یہ جملہ زیادہ نہیں۔ حاصل طریقہ کا یہ ہے کہ گو ذات حق کی طرف توجہ تام نہیں ہو سکتی مگر تم اس کو یاد ہی کرتے رہو۔ بس یہی توجہ ذکر کی کافی ہے۔ اور اسی سے مطلوب حاصل ہو جائے گا۔ گو ذکر کے وقت تمہارے ذہن میں ذات کا تصور حقیقی نہ ہوگا۔ بالوجہ ہی ادراک ہوگا۔ مگر یہی کافی ہے بلکہ اگر رسمی کا تصور بالکل نہ ہو۔ محض اسم اللہ ہی کا تصور ہو تو یہ بھی کافی ہے اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اس جملہ میں لفظ اسم بھی زائد نہیں گو بعض نے اس کو زائد کہا ہے مگر اسلم و راجح یہ ہے کہ زائد نہ ہو کیونکہ توجہ الی اللہ کا طریقہ ابتداء میں یہی ہے۔ کہ توجہ الی الاسم کی جائے یہ عقدہ حضرت حاجی صاحب کی برکت سے حل ہوا۔ حضرت فرماتے تھے کہ ذکر میں اول تو توجہ الی المذکور چاہئے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو توجہ الی الذکر ہی کر لے اس سے بھی شدہ شدہ مذکور کی طرف توجہ ہو جاتی ہے گو اس کی توجہ ذکر کی طرف ہے بلکہ اگر توجہ الی المذکور کے ساتھ بھی توجہ الی الذکر ہو تب بھی اس کو توجہ الی المذکور میں مخل سمجھ کر اس کی نفی نہ کرے کیونکہ بالذات اس کی توجہ مذکور ہی کی طرف ہوگی اور ذکر کی طرف طبعاً توجہ ہے۔

کامل ذکر کیلئے خلوت ضروری ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان لک فی النہار سبحاً طویلاً واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلاً۔ تبتیل سے پہلے ان لک فی النہار سبحاً طویلاً خرمایا یعنی دن میں کام زیادہ رہتا ہے اور اس وجہ سے ذکر و تبتیل کے لئے فراغ نہیں ہوتا اس لئے شب کا وقت اس کے واسطے تجویز کیا گیا اور اس کا راز یہ ہے کہ برکت تعلیم کے لئے ضرورت ہے نور کی اور نور پیدا ہوتا ہے ذکر کامل سے اور ذکر کامل کے لئے ضرورت ہے خلوت کی۔ اس لئے بزرگوں نے یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ قلب کو بجز ذات واحد کے کسی طرف متوجہ نہ کرنا چاہیے اور وہ ذات حق تعالیٰ کی ہے اسی کو فرماتے ہیں۔

دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

دل آرمیکہ داری دل درو بند

دوسرے یہ کہ اذکر واللہ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) یا واذکر اسم ربک (اپنے رب کے نام کی یاد کرو) میں حق تعالیٰ نے ذکر کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے خواہ لسان ہو یا اور کچھ نیز ذکر باعتبار لغت کے عام بھی ہے۔

ذکر قلبی و ذکر لسانی دونوں کو بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ ذکر کے اصلی معنی ذکر قلبی ہی کے ہیں اور جہاں کہیں ذکر لسانی مراد ہے وہاں قرآن سے اس پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ ذکر کے معنی ہیں یا ذاب دیکھ لیجئے کہ یاد کس کا فعل ہے زبان کا یا قلب کا۔ پس اب ذکر قلبی کے لئے تو ثبوت کی ضرورت نہ رہی۔ البتہ ذکر کا لسانی ہونا محتاج دلیل ہو گیا۔

اقسام ذکر

ذکر کے متعلق اہل علم کو ایک اور شبہ ہو گیا ہے وہ یہ کہ انہوں نے وا ذکر اسم ربک (اپنے رب کے نام کو یاد کرو) میں لفظ اسم کو زائد رکھا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زائد ماننے کی ضرورت نہیں ہے جس کی سہل توجیہ یہ ہے کہ ذکر دو قسم کے ہیں ایک مبتدی اور ایک منتہی۔ تو اسم ربک میں مبتدی کی حالت کا اعتبار کیا گیا ہے۔ کیونکہ مبتدی کی اور حالت ہے اور منتہی کی اور۔ اس لئے یوں کیوں نہ کہا جاوے کہ مبتدی کے لئے وا ذکر اسم ربک ہے اور منتہی کے لئے وتبتل الیہ تبتیلاً ہے کیونکہ مبتدی کے لئے یہی ذکر کا درجہ بہت ہے کہ محبوب کا نام اس کی زبان پر آ جاوے یا قلب میں نام آ جائے۔ ذکر لفظی کی بھی کئی صورتیں ہیں ایک ذکر لفظی زبان سے ایک قلب سے۔ ایک ذکر منطوق ہے اور ایک متصور۔ منطوق تو ظاہر ہے متصور مثال سے سمجھ لیجئے۔

اب ذکر کی اقسام چند ہو گئیں۔ ایک لسانی ایک قلبی اور ذکر قلبی کی خود دو قسمیں ہیں۔ ایک ذکر قلبی لفظی، ایک ذکر قلبی نفسی اور ان اقسام میں سے ذکر لسانی بھی غیر موقت نہیں بلکہ بعض احوال کے لحاظ سے وہ بھی موقت ہے کیونکہ نیند کے غلبہ میں اور بول و براز و جماع و مواقع قاذورات میں زبان سے ذکر کرنے کی ممانعت ہے۔ البتہ ذکر قلبی کی کسی حال میں بھی ممانعت نہیں ہر وقت اجازت ہے یہ بیشک محیط کل اور ہر جہت سے غیر موقت ہے پس ذکر قلبی ہی اپنے دونوں قسموں کے ساتھ ایک ایسا مشغلہ ہے جو ہر وقت ہو سکتا ہے۔ گو سونے کے بعد نہ ہو۔ سو اس حالت میں انسان مکلف ہی نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ کھاتے وقت بھی ہو سکتا ہے بلکہ یہ ذکر لسانی سے بڑھا ہوا ہے مثلاً جہاں ریا کا شبہ ہو ایک شخص ہے کہ زبان سے تو ذکر کرتا ہے مگر قلب متوجہ نہیں ہوتا تو اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ قلب سے ذکر کرے اور زبان سے نہ کرے تو ایسے شخص کے اعتبار سے محض ذکر قلبی ہی افضل ہے۔

مگر مہربانی کر کے اس مسئلہ کو نماز کی قراءت میں متعدی نہ کر لیجئے کیونکہ نماز میں قراءت و تکبیرات و تشہد وغیرہ اگر کوئی شخص قلب میں پڑھ لے اور زبان سے ادا نہ کرے تو نماز نہ ہوگی۔ ہاں گونگا البتہ معذور ہے اس کی نماز محض تصور ہی سے ہو جاوے گی۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۝

ترجمہ: وہ مشرق اور مغرب کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں تو اسی کو اپنے کام سپرد کر دینے کے لئے قرار دیئے رہو۔

قبض میں حال سلب نہیں ہوتا

مشرق و مغرب کے ذکر میں اشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح شمس میں طلوع اور غروب ہوتا ہے اسی طرح حالات میں بھی قبض و وسط اسی کے مشابہ ہوتا ہے یعنی قبض میں حال سلب نہیں ہوتا بلکہ مستور ہو جاتا ہے مثل آفتاب کے کہ غروب ہو جاتا ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثِي اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ

وَتُلُثُهَا وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۝

ترجمہ: آپ کے پروردگار کو معلوم ہے کہ آپ کبھی دو تہائی رات سے کچھ کم جاگتے ہیں کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات جاگتے ہیں اور ایک جماعت بھی ان لوگوں میں سے جو آپ کے ساتھ ہے۔

تفسیری نکات

تہجد کیلئے وقت متعین کرنا ضروری نہیں

اس کے بعد فرماتے ہیں واللہ یقدر اللیل والنہار کہ رات اور دن کا پورا اندازہ حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں یہ جملہ بے کار نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اندازہ ٹھیک طور پر نہیں کر سکتے۔ کہ ہمیشہ ایک ہی وقت پر اٹھو اس لئے کسی خاص وقت کی تعیین لازم نہیں کی جاتی جب آنکھ کھل جائے اسی وقت اٹھ جانا چاہیے یہی معنی ہیں اس کے جو فرمایا ہے علم ان لن تحصوه فتاب علیکم فاقراء واما تیسر من القرآن اور پھر بیماروں کو اور کسب معاش کرنے والوں کو وقت تھی انکی آنکھ بعض دفعہ صبح کے قریب کھلتی ہے تو ارشاد فرماتے ہیں۔

علم ان سیکون منکم مرضی واکھرون یضربون فی الارض یتغون من فضل اللہ

واکھرون یقاتلون فی سبیل اللہ فاقروا اما تیسر منہ

یعنی بیماروں اور مسافروں کو زیادہ بیداری معاف ہے ان کی آنکھ کھل جائے صبح سے پہلے پہلے تو وہ جتنا قرآن پڑھ سکیں نماز میں پڑھ لیا کریں چاہے دو رکعت ہی پڑھ لیا کریں اس سے بھی کامل ثواب مل جائے گا اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو حدیث میں آتا ہے کہ بعد وتر کے دو رکعت پڑھ لیا کرے۔ اس کی نسبت کفتاہ وارد ہے جس کی تفسیر یہ ہے کہ اس سے بھی تہجد کا ثواب مل جاتا ہے۔ سبحان اللہ ہماری روٹیوں کی بھی رعایت ہے کہ تجارت کے لئے سفر کرو تو طویل بیداری معاف ہے جتنا ہو سکے کر لیا کرو کوئی طبیب ایسا ہے جو اسے یوں کہہ دے کہ اس نسخہ میں آدھاپی لو یا ربع پی لو تو صحت کے لئے کافی ہے ایسا کوئی طبیب نہ ملے گا وہ تو قدح ہی پلاوے گا مگر حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ رعایت فرماتے جاتے ہیں کہ زیادہ نہ ہو سکے تو اخیر شب میں دو رکعت ہی پڑھ لو اتنا بھی نہ ہو سکے تو سونے سے پہلے وتر کے بعد دو رکعت پڑھ لو یا رات کو دو تین بار سبحان اللہ ہی کہہ لو بس کافی ہے غرض یہاں بھی ترک منام کے ساتھ فعل مشروع ہوا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں فرمایا۔

تخلیہ مقدم ہے یا تخلیہ

البتہ شیوخ کا اس میں اختلاف ہے کہ تخلیہ کو مقدم کیا جائے اور تخلیہ کو موخر اور مفید دونوں طریق ہیں خواہ تخلیہ کو مقدم کیا جائے یا تخلیہ کو کیونکہ ان دونوں میں جانبین سے استلزام ہے جیسے ایک بوتل میں پانی بھرا ہو اور ہم پانی نکال کر اس میں ہوا بھرنا چاہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پہلے پانی کو نکال دو ہوا خود بخود بھر جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی آلہ کے ذریعہ سے پہلے ہوا بھرنا شروع کرو پانی خود ہی نکل جائے گا۔ اسی طرح فضائل کے حاصل کرنے سے رذائل خود بخود زائل ہو جاتے ہیں مثلاً کسی نے سخاوت کی صفت حاصل کر لی تو بخل جاتا رہے گا اور رذائل کے زائل کرنے سے فضائل خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بخل زائل ہو گیا تو سخاوت حاصل ہو جائے گی غرض دونوں طریق مفید ہیں مگر چشتیہ نے تخلیہ کو مقدم کیا ہے (اور یہ آیت بظاہر مؤید ہے) اور نقشبندیہ نے تخلیہ کو مقدم کیا اور آیت و اذکر اسم ربک و تبسّل الیہ تبسّلاً (اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ) کا ظاہر ان کو مؤید ہے۔ (زکوٰۃ النسخ)

سُورَةُ الْقِيَامَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ ۱۱ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۚ ۱۲ ۝

لَا تُحْرِكُهُ بِهِ لِسَانُكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۚ ۱۳ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ ۱۴ ۝

فَإِذَا قُرَأَ لَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ ۱۵ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۚ ۱۶ ۝

ترجمہ: بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خود مطلع ہوگا گو باقتضائے طبیعت اس وقت بھی (اپنے حیلے (حوالے) پیش لائے اور اے پیغمبر آپ قبل اختتام وحی قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اس کو جلدی لیں ہمارے ذمہ ہے (آپ کے قلب میں) اس کا جمع کر دینا اور پڑھوادینا جب ہم اسے پڑھیں تو آپ اس کی پیروی کریں پھر اس کا بیان کرادینا ہمارے ذمہ ہے۔

تفسیری نکات

قیامت میں ہر شخص اپنے اعمال پر مطلع ہو جائے گا

چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے سورہ قیامت میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان کیا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا اپنے اعمال پر اسے اطلاع ہوگی اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کلام جتلا دیئے جائیں گے پھر فرماتے ہیں بل الانسان على نفسه بصيرة ولو ألقى معاذيره. یعنی (انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ اس دن انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خود واقف ہے) کیونکہ اس

وقت حقائق کا انکشاف ہو جائے گا اگرچہ وہ (باقضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے جیسے کفار کہیں گے 'واللہ! ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں۔ غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہوگا اس لئے یہ جتنا نامحض قطع جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لئے۔ یہاں تک تو قیامت ہی کے متعلق مضمون ہے اس کے بعد فرماتے ہیں۔ لا تحروک به لسانک لتعجل به ان علینا جمعه وقرانه فاذا قراناہ فاتبع قرانه ثم ان علینا بیانہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کو یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جمادینا اور زبان سے پڑھو ادینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتے کی قراءت کا اتباع کیجئے۔ پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے۔ کلابل تحبون العاجلة و تلرون الاخرة کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں وجوه یومئذ ناضرة الی ربھا ناظرة 'بعضوں کے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ تو لا تحروک به لسانک سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے۔ لوگ اس مقام کے ربط میں تھک تھک گئے ہیں اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے۔

کلامیکہ محتاج معنی باشد لا یعنی ست

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے۔ صاحبو! اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سالقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے لیکن جو باپ ہوا ہوگا وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تشبیہ کر دی اس طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے اور حضور اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں۔ جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں۔ یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں۔ قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا۔ تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقتضایہ

تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہو تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی مگر پھر بھی باوجود اس کے ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا ہی کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے چنانچہ جو رسالے ربط کے باب میں لکھے گئے ہیں ان سے اس آیت کا مضمون قیامت سے ربط معلوم ہو سکتا ہے میں نے بھی اپنے ایک رسالہ عربی میں اور اپنی تفسیر کے اندر اردو میں اس کا ماقبل سے ارتباط بیان کیا ہے جو کہ تبرع اور احسان کے درجہ میں ہے ورنہ یہاں ربط کی ضرورت ہی نہ تھی۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب ربط کی ضرورت نہ تھی تو ممکن ہے کہ یہ روابط سب مختراع ہوں پھر ان کی حاجت ہی کیا تھی؟ (کیونکہ تقریر سابق سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرط شفقت کا مقتضایہ ہے کہ ترتب و ربط کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ مخاطب کی ضرورت کے موافق کلام کی جائے چاہے ربط ہو یا نہ ہو اور قرآن کا طرز کلام یہی ہے تو اس صورت میں جو کچھ ربط بیان کیا جائے گا وہ مختراع ہوگا کیونکہ متکلم نے ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں) اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مختراع نہیں ہیں۔

کلام اللہ میں طرز نصیحت ہے طرز تصنیف نہیں

آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوتی تو جبرئیلؑ بحکم خداوندی حضورؐ سے یہ کہتے کہ اس آیت کو مثلاً سورۃ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جائے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورت کیساتھ و علیٰ ہذا تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کیساتھ ملایا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے کیونکہ اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہو تو ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا تو عجیب بے نظیر کلام ہے کہ باوجود ضرورت ربط نہ ہونے کے پھر بھی اس میں ربط اور پورا ربط ہے پس خدا تعالیٰ کے کلام میں اس مستقل دلیل سے ہم ربط کے قائل ہیں لیکن اگر ربط نہ بھی ہوتا تب بھی قرآن پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ قرآن میں طرز تصنیف نہیں اختیار کیا گیا بلکہ طرز نصیحت مع لحاظ شفقت اختیار کیا گیا ہے۔

قرآن کا طرز کلام

اس میں ضرورت مخاطب کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے جس کی بے ربطی ہزار ربط سے افضل ہوتی ہے اور یہی منشاء شفقت ہے اس امر کا کہ قرآن کی ہر تعلیم کامل ہے جس میں تمام پہلوؤں کی پوری پوری رعایت کی

جاتی ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ ہر سورت میں بہت سے احکام بیان فرما کر اخیر میں ایسی بات بیان فرماتے ہیں جو سب کی جامع ہوتی ہے اور جس پر عمل کرنے سے تمام احکام مذکورہ میں سہولت ہو جاتی ہے۔

حدیث وحی غیر متلو ہے

پس حدیث تو چونکہ وحی ہے اگرچہ غیر متلو ہے اس لئے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی شرح ہے اور اس لئے اس کا حکم بھی قرآن شریف کا سا ہے اور مسائل فقہ چونکہ انہی اصول پر مبنی ہیں جو قرآن و حدیث میں ہیں اس لئے وہ بھی حکم میں وحی کے ہوں گے تو وحی کبھی جلی ہوتی ہے اور کبھی خفی۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں ثم ان علينا بیانہ چنانچہ جب حضور پر آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوه بحاسبکم بہ اللہ نازل ہوئی تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ شاید وساوس پر بھی گرفت ہو۔ اس لئے بہت گھبرائے ان کی گھبراہٹ پر دوسری آیت نازل ہوئی جس نے اس کی تفسیر کر دی۔ لا یشکلف اللہ نفسا الا وسعها اس آیت نے بتلادیا کہ وساوس پر جب تک کہ وہ دوسو سے کہ درجے میں رہیں مواخذہ نہ ہوگا نیز حدیث کے ذریعے سے حضور نے اس کی تفسیر فرمائی۔

ان اللہ تجاوز عن امتی عما وسوس صدورہا مانم تعد او تتکلم او کما قال پس حدیث قرآن کی تفسیر ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور بعض چیزیں چونکہ حدیث میں بھی مجمل رہ گئی تھیں مثلاً مسائل ربو میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مثلاً بمثل ید ابیدو الفضل ربوا اور دوسری جگہ یہ فرمایا کہ دعوا الربوا والرہبہ اس سے معلوم ہوا کہ ربوا حرام ہے مگر اس کی جزئیات کا پتہ اس سے نہیں چلتا تھا۔ ہمارے فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بمثل اور ید ابید سے سب جزئیات کو نکال دیا جن کو عوام الناس نہ سمجھ سکتے تھے اور اسی لئے علم اصول مدون کیا۔ نیز یہ بھی کہہ دیا کہ القیاس مظہر لا مثبت جس میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ جو کچھ کہا ہے حدیث و قرآن ہی کی تفسیر ہے اسی طرح حضور ﷺ کے متعلق جا بجا قرآن میں یہ ارشاد فرمایا کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وحی سے فرماتے ہیں کوئی بات وحی کے خلاف نہیں تو اس سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو حدیث یا فقہ کو نہیں مانتے اور محدثین اور فقہا پر اعتراض کرتے ہیں۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۖ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۗ ط

ترجمہ: (اے منکرو) ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو۔

تفسیری نکات

کسب دنیا اور حب دنیا

اصل یہ ہے کہ وہ حب دنیا ہے جس کی مذمت اس آیت میں ہے اور آیت سے حدیث حب دنیا اس کل خطیہ (حب دنیا تمام گناہوں کی جڑ ہے) کی تصریح بھی ہوگئی ایک تو ہے کسب دنیا اور ایک ہے حب دنیا تو کسب دنیا تو جائز ہے حب دنیا ناجائز اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو پائخانہ میں بہ ضرورت طبیعت بیٹھنا اور ایک پائخانہ کو پیارا سمجھ کر اس میں جی لگا کر بیٹھنا پہلی صورت جائز دوسری ناجائز۔ اسی طرح دنیا کو کمانا تو جائز ہے لیکن اس کو مرغوب و محبوب سمجھنا حرام ہے۔ قرآن شریف میں ان ہی الفاظ سے وضاحت کی گئی ہے یعنی کلابل تحبون العاجلة و تذرون الاخرة یعنی تم لوگ دنیا کو محبوب سمجھتے ہو اور آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہو اور اس خصوص میں ایک شبہ کا احتمال ہے یہ کہ بعض آدمی یہ سن کر کہ یہ آیت کفار کے متعلق ہے کہنے لگتے ہیں کہ کفار کے متعلق آیات سے ہم کو کیا تعلق اسی طرح اگر وہ کسی ترجمہ قرآن میں دیکھ لیتے ہیں کہ یہ آیت مکی ہے وہ خیال کر لیتے ہیں کہ مکی آیت سے ہم کو کیا تعلق اس لئے اس پر اس کے متعلق بھی کچھ بیان کر دینا ضروری ہے خداوند تعالیٰ کو کسی کی ذات سے محبت و عداوت نہیں ہے بلکہ اس کی بناء اعمال ہیں اور جو بعض احکام کا مورد اگرچہ خاص ہوتا ہے لیکن الفاظ کے عموم سے حکم عام ہوتا ہے اس لئے کفار کی شان میں جو بعض آیات اتری ہیں وہ اگرچہ باعتبار مورد کے خاص ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے جس عمل پر کفار کی شکایت ہے اگر وہ عمل ہم میں بھی ہے تو ہم کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

حب دنیا کا مغموم

مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں لوگوں کے جزئی شکوک اور شبہات کا جواب دوں لیکن تیرا خاص اس مقام کے اقتضاء سے اتنا کہوں کہ تحبون العاجلة بعد بطور تفسیر کے تذرون الاخرة بڑھادینے سے حب دنیا اس کل خطیہ کے متعلق شبہات کا جواب ہو گیا کہ حب دنیا وہی ہے جس میں ترک آخرت ہونہ کہ کسب دنیا پس کسب دنیا جائز ہے اور حب دنیا ناجائز کسب اور حب میں وہی فرق ہے جو کہ غلیظ اور صاف کرنے اور کمانے اور اس کے کھانے میں کہ اول برائے دوسرا اور معیوب ہے اور یہی وجہ ہے کہ تحبون العاجلة فرمایا تکسبون العاجلة نہیں فرمایا اب اپنے اوپر منطبق کر لیجئے اور دیکھئے کہ آپ تحبون کے مصداق ہیں یا

تکسیوں کے۔ اس انطباق میں عوام سے تو کچھ خوف اور اندیشہ اس لئے نہیں کہ ان کو کچھ خبر ہی نہیں ان بے چاروں سے جو بات کہہ دی گئی انہوں نے سن لی اور عمل کر لیا اور علماء سے اس لئے خوف نہیں کہ ان حضرات کی نظریں اصل حقیقت تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں البتہ ان نیم خواندہ لوگوں سے جو بوجہ نیم ہونے کے تلخ بھی ہیں ڈر لگتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ دیکھ کر یہ نہ کہہ دیں کہ ہم کو یہ آیت سن کر اپنی حالت پر منطبق کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ہم اس کے مخاطب ہی نہیں کیونکہ یہ آیت مکی ہے لہذا کفار اس کے مخاطب ہوں گے ہم مسلمان اس کے مخاطب نہیں ہو سکتے ہم سے اس آیت کو کیا تعلق لہذا اس کے متعلق عرض کرتا ہوں اور میں نے اس مضمون کو متعدد مرتبہ اس کے قبل بھی بعض جلسوں میں بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر لوگ آیات کے متعلق یہ سن کر کفار کو خطاب کیا گیا تھا بے فکر ہو جاتے ہیں حالانکہ اس سے بے فکر نہیں ہونا چاہیے بلکہ زیادہ فکر میں پڑ جانا چاہیے اور زیادہ اثر لینا چاہیے کیونکہ جب کوئی آیت عتابیہ کفار کی شان میں نازل ہوتی ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس آیت کے مضمون کا خطاب کفار کو ان کی ذات کی وجہ سے ہوا ہے یا کسی صفت کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ذات کی وجہ سے یہ خطاب نہیں ہوا اور نہ ہر انسان کو گو وہ متقی ہی ہو اس کا خطاب ہوتا کیونکہ ذاتاً سب متحد ہیں اور لازم باطل ہے پس معلوم ہوا کہ کسی صفت کی وجہ سے یہ خطاب ہوا ہے اور کوئی حالت خاصہ اس مضمون کے ترتیب کی علت ہے تو اگر وہ علت کفار کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھی پائی جائے گی تو اس جگہ بھی یہ مضمون مرتب ہوگا مثلاً اسی آیت میں وعید کا مدار حب العاجلہ ہے لہذا اگر حب العاجلہ تمہارے اندر پائی جائے گی تو تم بھی وعید کے تحت داخل ہو گے پس اب غور کر لو اور اگر اپنے اندر حب عاجلہ دیکھو تو بہت جلد اس کا علاج کرو اور اپنی حالت پر افسوس کرو کہ جو امور اس زمانے میں کفار میں ہوتے تھے وہ آج تمہارے یعنی مسلمانوں کے اندر موجود ہیں۔ اسی طرح حدیث من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر کسی نے جان بوجہ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کا کام کیا (میں تاویل کر کے لوگ بے فکر ہو گئے ہیں حالانکہ یہ بے فکری کی بات نہیں بلکہ اگر تاویل اس میں نہ ہوتی اور حقیقی معنی مراد ہوتے تو کچھ زیادتی نہ تھی کیونکہ اگر کسی چہمار کو چہمار کہہ دیا جائے تو اس کو کچھ غیرت نہ آئے گی اور اگر کسی شریف کو چہمار کہہ دیا جائے تو اس کو مر رہنا چاہیے تو تاویل کرنے سے وعید میں من وجہ زیادہ شدت ہو گئی اور زجر بڑھ گیا مگر افسوس ہے کہ ہم لوگ فہم سے کام نہیں لیتے بحمد اللہ شیم خوانوں کا شبہ تو رفع ہوا لیکن ایک شبہ تین پاؤ خوانوں کا رہ گیا ہے کہ تجہون اور تذرون سے مطلق محبت اور ترک مراد نہیں بلکہ یہ دونوں لفظ خاص ہیں یعنی وہ ترک مراد ہے جو اعتقاداً ہوا اسی طرح محبت سے وہ محبت مراد ہے جو اعتقاداً بقائے دوام کے ساتھ ہو اور ہم میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں کیونکہ ہم بحمد اللہ قیامت کے قائل ہیں دنیا کو فانی جانتے ہیں اس کا جواب ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں کوئی قید نہیں اور تمہارے پاس قید کی کوئی دلیل نہیں اور بلا دلیل کوئی دعوے مسموع نہیں ہوتا پس اس قسم کی قید لگانا قرآن شریف کے مقصود کو باطل کرتا ہے اور یہ ایسی مثال ہے کہ ایک شخص نے کسی جگہ پر پہنچ کر ایک مجمع میں بیٹھ کر کہنا شروع کیا کہ میں جب یہاں آیا تو ایک عورت سے میری آشنائی ہوئی اور میں اس کے گھر

جایا کرتا تھا اور اس کا گھر ایسا ایسا تھا اور اس کا شوہر ایک بار آ گیا تھا اور اس نے مجھ کو اس اس طرح چھپا دیا تھا اور اس موقع پر اس عورت کا شوہر بھی تھا اور اس کے پکڑنے کی فکر میں تھا اب یہ اقراری مجرم مجمع کے سامنے ہو گیا جرم ثابت ہونے میں کوئی حجت باقی نہ رہی اس عورت کو خبر ہوئی اور کچھ اشارہ کر دیا جس کو یہ سمجھ گیا اور تمام قصہ ختم کر کے اخیر میں کہہ دیا کہ بس اتنے میں آنکھ کھل گئی تو کچھ بھی نہ تھا لوگوں نے کہا کہ کیا یہ سب خواب تھا کہنے لگا اور نہیں تو بھلا میں غریب پر دیسی مجھ کو کون پوچھتا ہے تو ایسی تاویل آپ حضرات ہی کو مبارک ہو ہمارا مذہب ہے کہ المطلق یجری علی اطلاقہ (جس میں کوئی شرط اور قید نہ ہو وہ عام ہی رہے گا البتہ اگر عمل کی اباحت کہیں قرآن شریف یا حدیث شریف میں مذکور ہوتی تو البتہ رفع تعارض کے لئے اس موقع پر قید مذکور لگا کر تاویل کی جاتی اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مسئلہ اجرائی مطلق علی الاطلاق ہر جگہ نہیں بلکہ اس مقام پر ہے کہ جہاں مطلق کو اطلاق پر رکھنے میں کسی دوسری آیت یا حدیث سے تعارض واقع نہ ہو اور اگر تعارض ہوگا تو مطلق اپنے اطلاق پر نہ رہے گا غرض یہ ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی مرضی کے موافق چاہیں اور جس طرح چاہیں کر لیں مگر افسوس ہے کہ ہم کو اس کی ذرا پروا نہیں وہ حالت رہی ہے کہ

برہوا تاویل قرآن میکنی پس و کژشد از تو معنی سنی
چوں ندارد جان تو قندیل ہا بہرینش میکنی تاویلہا
کردہ تاویل لفظ بکر را خویش را تاویل کن نے ذکر را
(تیرے پاس روشنی کے لئے قندیلیں نہیں ہیں تو تو اپنی عقل کے لئے تاویلیں گھڑ رہا ہے)

اور میں علی سبیل التنزیل کہتا ہوں کہ اگر یہ معنی مطلق نہ بھی ہوں اور تذرون مقید ہوا عقادی ترک کے ساتھ۔ تب بھی آپ کو بے فکری نہ ہونا چاہیے کیونکہ جس دل میں درد نہ ہوتا ہے اس کو تھوڑے سے التفات سے تنبیہ ہو جاتا ہے گو وہاں دوسری ہی حالت کا بیان ہو مشہور ہے کہ ع عشق ست و ہزار بدگمانی

حضرت شبلی رحمۃ اللہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سبزی فروش صد اگانا ہوا نکلا الخیار العشرة بدائق جس کے معنی یہ ہیں کہ دس گلڑیاں ایک دانق کی عوض لیکن حضرت شبلی رحمۃ اللہ نے سن کر ایک چیخ ماری اور رونے لگے اور فرمایا کہ جب دس پسندیدہ آدمیوں کی یہ حالت ہے تو ہم گنہگار کس شمار میں ہیں۔ ان کا ذہن منتقل ہوا خیار کے دوسرے معنی کی طرف یعنی نیک لوگ۔ ان لوگوں کے دل میں ہر وقت وہی ایک بات رچی رہتی ہے حضرت جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی ہر کہ پیدا میشود دور پندارم توئی

سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی۔

کلام پاک میں مکرر آیات کے اعتراض کا عجیب جواب

کسی مسلمان بادشاہ کے زمانہ میں ایک ملحد نے قرآن پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں مکرر آیات بھی موجود ہیں۔ یہ خدا کا کلام نہیں معلوم ہوتا بادشاہ نے اس کو گرفتار کر کے بلایا اور پوچھا کہ قرآن پر تجھ کو کیا شبہ ہے بیان کر۔ اس نے یہی کہا کہ قرآن میں بعض جگہ مکررات موجود ہیں اس لئے یہ خدا کا کلام نہیں معلوم ہوتا۔ خدا تعالیٰ کو مکررات لانے کی کیا ضرورت تھی۔ بادشاہ نے جلا دیکھ دیا کہ اس شخص کے اعضاء مکررہ میں سے ایک ایک کاٹ دو۔ ایک ہاتھ رہنے دو اور ایک پیر۔ ایک آنکھ رہنے دو اور ایک کان کیونکہ یہ خدا کا بنایا ہوا نہیں معلوم ہوتا خدا تعالیٰ کو مکررات کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اس میں اضافہ کیا ہے لہذا مکررات کو حذف کر دو اور ایک ایک عضو رہنے دو۔ واقعی خوب سزا دی۔ اسی طرح آج کل ہمارے بھائیوں نے دین میں انتخاب کیا ہے کوئی نماز کو ضروری سمجھتا ہے اور نماز ہی کی پابندی کرتا ہے نہ زکوٰۃ دے نہ حج کرے نہ معاملات میں سود اور رشوت سے پرہیز کرے۔ کوئی روزہ کو ضروری سمجھتا ہے اور رمضان میں روزہ کا خوب اہتمام کرتا ہے اور بقیہ اعمال و طاعات کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے کوئی حج کو۔ (الہدیٰ والمغفرہ ملحقہ مواظفہ فاضل علم ص ۱۳۶)

واما من خاف مقام ربہ و نہی النفس عن الهوی

اس میں دو کام فرماتے ہیں جو تمام طرق کو جامع ہیں۔ ایک اپنے مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف۔ دوسرا نہی النفس عن الهوی الف لام عوض مضاف الیہ ہے اے عن ہواہا نفس کو اس کی خواہشوں سے روکنا۔ یہ دونوں عمل جملہ طرق حصول جنت کو جامع ہیں۔

ہر چند کہ یہ دونوں عمل افراد بہت سے رکھتے ہیں۔ اور تفصیل کرتے وقت افراد میں کچھ کمی نہ ہوگی مگر اس اختصار کی منفعت یہ ہے کہ جب یہ دونوں مضمون ذہن نشین ہو جائیں تو ہر فرد عمل میں اس کی رعایت رکھنے سے نیک و بد میں تمیز سہولت سے ہو جائے گی۔ گر میں یہی ہوا کرتا ہے کہ افراد کم نہیں ہو جاتے صرف طریق شناخت میں اختصار و سہولت ہو جاتی ہے۔

دیکھئے کتنی سہولت ہو گئی۔ جب آدمی کے دل میں خوف ہوگا کہ مجھے ہر عمل پر حق سبحانہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہوگا تو ہر کام کو تامل کے ساتھ کرے گا اور خیال رکھے گا کہ یہ کام کہیں خلاف مرضی باری تعالیٰ نہ ہو۔ اس سے ایک بصیرت پیدا ہو جائے گی کہ ہر برے عمل کو پہچان لے گا۔ اور اس سے بچ جائے گا۔

(علاج الحرس بالمحقہ مؤاعظ حقیقت مال و جاہ ص ۳۹۲)

امامن خاف مقام ربہ و نہی النفس من الهویٰ فان الجنة ہی الماویٰ (النزعات آیت نمبر ۳۹) اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا۔

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ نفس بری بلا ہے اس سے ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے عجیب بات ہے کہ جس قدر انسان ریاضات مجاہدات عبادات میں مشغول ہوتا ہے اسی قدر اس کے اندر بھی ایک طاقت ادراک کی پیدا ہوتی رہتی ہے اور اس لطافت سے اس کے کید بھی نہایت لطیف صورت میں پیدا ہونے لگتے ہیں اس لئے یہ بڑی ہی خطرناک چیز ہے۔ اور اس کا علاج بجز قوت اور ہمت کے کچھ نہیں شیطان تو لا حول سے بھاگ جاتا ہے مغلوب ہو جاتا ہے مگر یہ ظالم بجز مقابلہ کے اور وہ بھی ہمت اور قوت سے ہو قبضہ میں نہیں آتا اور ایک چیز سے تو یہ بالخاصہ بہت جلد پھول کر گدھا بن جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب اس کی مدح کی جاتی ہے اس لئے بزرگوں نے اس مدح سے بچنے کی خصوصیت کے ساتھ ہمیشہ کوشش کی ہے۔ مدح سے اس میں فرعونیت پیدا ہوتی ہے یہ فرعون ہو جاتا ہے۔ نفس اور شیطان کے فرق میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے واما من خاف مقام ربہ و نہی النفس عن الهویٰ فان الجنة ہی الماویٰ جس سے نفس کی قوت معلوم ہوتی ہے کہ اس کے لئے کف اور ضبط کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اور شیطان کے حق میں فرماتے ہیں ان کید الشیطان کان ضعیفاً اس کے لئے ضعف کو ثابت کیا ہے اور نفس کی یہ خاصیت کہ یہ مدح سے فرعون ہو جاتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں۔

نفس از بس مدح فرعون شد کن ذلیل النفس ہونا لاسد

(الافاضات الیومیہ ج ۹ ص ۲۱۲۰)

سُورَةُ عَبَسَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۱۱ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی ۱۲ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ یَزْكٰی ۱۳

اَوْ یَدَّكُرُ فَنفَعَهُ الذِّكْرٰی ۱۴ اَمَّا مَنْ اَسْتَعْنٰی ۱۵ فَانْتَ لَهُ

تَصَدِّی ۱۶ وَمَا عَلٰیكَ اِلَّا یَزْكٰی ۱۷ وَاَمَّا مَنْ جَاءَكَ یَسْعٰی ۱۸

وَهُوَ یَخْشٰی ۱۹ فَانْتَ عَنْهُ تَلَهٰی ۲۰ كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۲۱

ترجمہ: پیغمبر ﷺ چیں بچیں ہو گئے اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا شاید نابینا آپ کی تعلیم سے پورے طور پر سنور جاتا یا کسی خاص امر میں نصیحت قبول کرتا سو اس کو نصیحت کرنا (کچھ نہ کچھ) فائدہ پہنچاتا۔ تو جو شخص دین سے بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں کہ وہ نہ سنورے اور جو شخص آپ کے پاس دین کے شوق میں دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا ہے آپ ﷺ اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں (آپ آئندہ) ہرگز ایسا نہ کیجئے قرآن (محض ایک) نصیحت کی چیز ہے سو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے۔

تفسیری نکات تعلیمِ اِکمل

اسی سلسلہ میں ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام سے کبھی حقیقی غلطی نہیں ہوئی عرض کیا کہ حضرت والا مثال میں کوئی ایسا واقعہ بیان فرمائیں جس

سے اس کی توضیح ہو۔ فرمایا کہ ایک مرتبہ جناب رسول ﷺ ایک کافر رئیس کو اسلام کی تعلیم فرما رہے تھے ایسے وقت میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم اعمیٰ نے آ کر با آواز بلند عرض کیا علمنی یا رسول اللہ مما علمک اللہ یہ سن کر حضور کے چہرہ مبارک پر ترش روی کے آثار پیدا ہو گئے جس کا نشانہ یہ تھا کہ میں اس وقت اصول اسلام کی تعلیم کر رہا ہوں اور یہ فروع کی تعلیم چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اصول مقدم ہیں فروع پر۔ اس پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ اِنْ جَاءَہٗ اِلَّا عَمٰی وَاٰیۡدِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزِکٰی۔ اُوۡیۡذِکَ فِتۡنَہٗہُ الذِّکۡرٰی۔ اَمَا مِنْ اَسۡتَغۡنٰی فَاِنۡتَ لَہٗ تَصۡدٰی۔ وَاٰیۡکَ اِلَّا یَزِکٰی۔ وَاَمَا مِنْ جِآءَکَ یَسۡعٰی۔ وَاٰیۡکَ اِلَّا یَزِکٰی۔ فَاِنۡتَ عَنْہٗ تَلٰہٰی۔ کَلَّا اِلٰہَا تَذِکۡرَہٗ۔ فَمَنْ شِآءَ ذِکۡرَہٗ۔ اَبۡ دَکِیۡہِ لَیۡجۡہِ کہ یہ تعلیم حضور کی طاعت تھی یا غیر طاعت ظاہر ہے کہ طاعت تھی لیکن یہ خطاب عتاب اصول کی تقدیم فروع پر علی الاطلاق نہیں بلکہ اس مقام پر ہے جہاں دونوں کا اثر متماثل ہو باقی تعلیم فروع کا نفع یقینی ہو اور تعلیم اصول کا محتمل وہاں یہ مقدم ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں ایسا ہی تھا اس لئے حق تعالیٰ نے شکایت فرمائی کہ طرق تعلیم میں افضل کو چھوڑ کر غیر افضل کی طرف کیوں متوجہ ہوئے تو آپ کا عمل بھی طاعت تھا۔ مگر دوسری طاعات اس سے اکمل تھی اس سے ثابت ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام کے تمام اعمال فی نفسہ حسنات اور طاعات اس سے اکمل تھی اس سے ثابت ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام کے تمام اعمال فی نفسہ حسنات اور طاعات ہیں لیکن بڑی طاعت کے مقابلہ میں چھوٹی طاعت کو غلطی فرمایا۔ سائل نے عرض کیا کہ فی الحقیقت یہ مسئلہ خوب صاف ہو گیا۔ پھر عرض کیا کہ وہ صحابی تو خوش ہوئے ہوں گے کہ ہماری وجہ سے حق جل علی شانہ نے ایسا فرمایا۔ فرمایا کہ وہ حضرات اس پر خوش ہونے والے نہ تھے ان حضرات کو حضور سے اس قدر تعلق اور محبت تھی کہ ایسے موقع پر شرمندہ ہوتے تھے کہ ہماری وجہ سے حضور کو ایسا خطاب کیا گیا اپنے پر قیاس نہ کرنا چاہیے اس کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

کار پا کاں را قیاس از خود مکیر
گر چہ ماند در نوشتن شیر و شیر

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اجتہادی غلطی پر تنبیہ

فرمایا عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ میں حضور ﷺ کی اجتہادی لغزش تھی کیونکہ یہاں دو قاعدے ہیں۔ ایک یہ کہ تعلیم اصول مقدم ہوتی ہے تعلیم فروع سے۔ اس قاعدہ کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر کو تبلیغ فرمائی۔ کیونکہ اس کو حضور ﷺ تبلیغ فرما رہے تھے اور ابن مکتوم مسلمان تھے ان کو فروع کی تعلیم ہوتی۔ گو وہ فروع بھی کسی دوسری شے کی بہ نسبت اصل ہو۔ مگر اسلام کی نسبت تو فرع ہے جیسے اصول فقہ فقہ کے لئے اصلی ہے مگر علم کلام کی بہ نسبت فرع ہے اور دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ نفع متیقن مقدم ہوتا ہے نفع متوہم سے۔ اس وقت اس قاعدہ کی

طرف توجہ نہ ہوئی۔ تو اب حاصل یہ ہے کہ تعلیم اصول فروع سے مقدم ہے بشرطیکہ تاثیر نفع میں دونوں برابر ہوں اور جب علم فروع میں نفع یقینی تو یہ مقدم ہوگی۔ اگر یہ شبہ ہو کہ اجتہادی لغزش پر حضور ﷺ کو ملامت کیوں فرمایا گیا تو جواب یہ ہے اگر حضور ﷺ پر ایک شبہ کا کہ حضور ﷺ نے اعمیٰ کی دل شکنی کی۔ لفظ اعمیٰ میں جواب کی طرف اشارہ کہ حضور ﷺ نے زبان سے کچھ نہیں فرمایا۔ صرف تیوری پر بل ڈالے اور چونکہ وہ نابینا تھے اس لئے ان کو تیوری چڑھانے کی خبر نہیں ہوئی تو ان کی دل شکنی بھی نہ ہوئی کیونکہ وہ تو اعمیٰ تھے ہاں اگر بینا ہوتے تو بیشک دل شکنی ہوتی۔ (الکلام الحسن)

عظمت سرکارِ دو عالم ﷺ

جس واقعہ میں نازل ہوئی ہے وہ کیسی معمولی بات تھی کہ جس پر عتاب ہونے کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ مگر عتاب ہوا اور عتاب بھی عجیب و غریب عنوان سے کہ غائب کے صیغہ کے ساتھ عتاب فرمایا۔ معنی یہ ہیں کہ ایک شخص ہیں کہ انہوں نے ترش روئی کی اور منہ پھیر لیا عبت و تولیت صیغہ حاضر کا نہیں لائے۔ اس میں آپ کی عظمت و وقعت کی کس قدر رعایت فرمائی کہ اوروں کو پتہ نہ چلے کہ کس کو عتاب ہوا۔

شان نزول

جس پر سورہ عبس و تولی نازل ہوئی کہ عبداللہ بن ام مکتوم آئے یہ نابینا تھے اور طالب تھے نابیناؤں کو بعض اوقات موقع کا اندازہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے حضور سے کچھ پوچھنا چاہا اس وقت حضور کے پاس کچھ لوگ اور بیٹھے تھے آپ ان کی اصلاح کی طرف متوجہ تھے۔ انہوں نے کچھ سوال کیا آپ کو بے موقع سوال سے ایک گوند ناگواری ہوئی کیونکہ آپ تبلیغ اصول میں مشغول تھے اور یہ فروع کا سوال کرتے تھے اور اصول مقدم ہیں فروع پر لیکن یہاں سائل نابینا تھے جن کو حضور کا مشغول یا فارغ ہونا۔ معلوم نہ تھا اس لئے وہ بھی اس فعل میں معذور تھے۔ اس پر یہ آیت اتری جس میں عتاب ہے اور بطور شکایت نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے برامانا اور منہ پھیر لیا کیا مزہ کا عتاب ہے۔ جس میں آگے حضور کے عذر کا بھی بیان ہے کہ ایسا کیوں ہوا ان جساء ہ الا عمی۔ اعمیٰ کے لفظ میں اشارہ ہو گیا کہ آپ کے عبوس کی اس سائل کو اطلاع بھی نہیں ہوئی جس سے ان کو ناگواری ہوتی۔ غرض کوئی تکلیف سائل کو نہیں ہوئی باقی یہ کہ پھر کیوں عتاب ہوا تو وہ عتاب اس پر ہوا کہ ایسی شکل بنائی کیونکہ اگر وہ سو جھاکا ہوتا تو برامانا کس قدر اخلاق کی تعلیم ہے کہ عبوس کی صورت بنانے سے بھی منع فرمایا گیا اور حضور کی شانِ محبت الہی کو دیکھئے کہ اس واقعہ کے بعد یہ حالت تھی کہ جب کبھی عبداللہ بن ام مکتوم آتے تو آپ اپنی ردائے مبارک ان کے واسطے بچھا دیتے۔ اور فرماتے مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی یعنی

مرحبا اس شخص کو جس کے بارہ میں مجھ پر میرے رب نے عتاب کیا اس پر لطف عتاب کا مزہ کوئی دوسرا کیا جان سکتا ہے میں کبھی کبھی بعضے اندھے آدمیوں کے پاس کو گزرتا ہوں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ سلام نہیں کرتا اس خیال سے کہ وہ مجھے مشغول کر لیں گے مگر اس وقت سورہ عبس کو یاد کر کے شرماتا ہوں اور اسی واقعہ میں حضور کی شفقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اس وقت جن لوگوں سے حضور بات کر رہے تھے وہ مسلمان نہ تھے حضور نے ان کو ایک اہل دین کے مقابلہ میں خطاب میں مقدم رکھا تو یہ کس قدر شفقت ہے کہ دشمنوں کے ساتھ برتاؤ ہے کہ دوستوں سے ان کو مقدم رکھا جاتا ہے۔ غرض یہ نظائر ہیں حضور کی شفقت اور نرمی اور اخلاق کے۔

ضرورت آزادی و اعتدال

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں و ان کان کبر علیک اعراضہم فان استطعت ان تبغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتہم بآیة اور ایک جگہ فرماتے ہیں ولقد نعلم انک بضیق صدرک بما یقولون غرض جا بجا قرآن میں مصرح ہے کہ اس کا شدید اہتمام نہ کیجئے کہ ہدایت ہو ہی جائے اور اس تعلیم خداوندی میں ایک راز ہے وہ یہ کہ آزادی اور اعتدال سے کام کرتا رہے ورنہ جو کام کر رہا ہے غلو کرنے سے کہیں تنگ ہو کر اس کو چھوڑ نہ بیٹھے اور اعتدال کی صورت میں ہمیشہ کر سکتا ہے۔ اسی بنا پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس ثمرہ کے منتظر نہ رہنا چاہیے جس کو اہل ظاہر ثمرہ کہتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ انک لا تہدی من احببت ولكن الله یهدی من یشاء سبحان اللہ کیا پاکیزہ اور پر مغز تعلیم ہے چنانچہ یہ فرما کر کہ ولقد نعلم انک بضیق صدرک اس سے بچا دیا کہ ضیق صدر میں کیوں مبتلا ہو جائے چھوڑیے اس کو جیسے لڑکا پڑھنا نہ چاہے اور استاد پڑھانا چاہے تو سخت کوفت ہوتی ہے بس اس کا علاج یہ ہی ہے کہ ایک دو بار تقریر کر دے اور کہہ دے کہ جاؤ بھاگو بلا ضرورت دوسروں کی فکر میں پڑتا اس کی نسبت ماموں صاحب فرمایا کرتے تھے کہ دوسروں کی جوتیوں کی حفاظت کی بدولت کہیں اپنی گٹھڑی نہ اٹھوادینا۔

اب ایک سوال یہ باقی رہا کہ جب حضور ﷺ ایک ایسے اہم کام میں مشغول تھے جو ان صحابی کی تعلیم سے مقدم تھا تو ان صحابی کا اس اہم کام میں نخل ہونا۔ ضرور موجب گرانی تھا۔ اور حضور ﷺ اس ناگواری میں مصیب تھے پھر عتاب آپ پر کیوں ہوا۔ ان صحابی پر ہونا چاہیے تھا کہ یہ ایسے ناوقت کیوں آئے اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ اعمیٰ میں ان صحابی کا عذر مذکور ہے۔ کہ وہ بوجہ نابینا ہونے کے معذور تھے۔ ان کو یہ خبر نہ تھی کہ حضور اس وقت کس کام میں مشغول ہیں اور دوسرا جواب حق تعالیٰ نے آگے بیان فرمایا ہے۔ اما من استغنی فانئنا لہ تصدی وما علیک ان لایزکی جس کا حاصل یہ ہے کہ جن کفار کو آپ تبلیغ فرما رہے تھے وہ

طالب نہ تھے محض حضور کا دل چاہتا تھا۔ کہ وہ ایمان لے آئیں لیکن وہ خود حق سے اعراض کرتے تھے اور صحابی طالب حق تھے۔ اس صورت میں کفار کی اصلاح موہوم اور صحابی کی اصلاح متیقن تھی تو آپ نے اصلاح موہوم کا اس درجہ اہتمام کیوں فرمایا۔ کہ اس وقت طالب حق کا آنا گراں ہونے لگا۔ اگر ان غریبوں کے آنے سے وہ چلے جاتے۔ تو آپ ﷺ کی جوتی سے۔ آپ کو بھی ان کے ساتھ استغنا کا برتاؤ کرنا چاہیے تھا اور صحابی کی تعلیم میں مشغول ہو جانا چاہیے تھا جس کی اصلاح یقینی تھی پس یہاں سے یہ مسئلہ بتلا دیا گیا کہ منفعت موہومہ پر منفعت متیقنہ کو مقدم کرنا چاہیے۔

سُورَةُ التَّكْوِيْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۴

ترجمہ: اور تم بدوں خداے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔

تفسیری نکات مشیت کی دو قسمیں

فرمایا مشیت دو ہیں مشیت عباد مشیت رب بندہ کے افعال بمشیت بندہ ہیں مگر وہ مشیت معلول ہے۔ مشیت رب قال اللہ تعالیٰ و ما تشاءون الا ان يشاء الله رب العالمين اور بندوں کے افعال مشیت بندہ کہلانے کی وجہ یہ کہ یہ مشیت اول افعال کی علت قریب ہے اور مشیت رب علت بعیدہ اور نسبت علت قریبہ کی طرف کیا کرتے ہیں قدریہ اور جبریہ ایک ایک مشیت پر نظر کر کے راہ حق سے بہک گئے۔ اہل سنت و جماعت کی نظر دونوں مشیتوں پر ہے صراط مستقیم پر قائم رہے۔

سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحِفْظِیْنَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ ۝۱۱

ترجمہ: اور تم پر اپنے اعمال یاد رکھنے والے معزز لکھنے والے مقرر ہیں۔

تفسیری نکات

کراما کاتبین کے مقرر ہونے میں حکمت

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ اور قادر مطلق ہیں پھر باوجود اس کے جو اعمال لکھنے کے لئے یا عذاب کے لئے جو فرشتے مقرر فرمائے اس کی کیا وجہ ہے بظاہر تو یہ امر خلاف عقل معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ لکھنے کی توجہ ضرورت ہوتی جبکہ خود کو علم نہ ہوتا اور نیز دوسروں کے واسطے سے سزا دینے کی جب حاجت تھی جب کہ بالذات قدرت نہ ہوتی اور وہاں دونوں امر مفقود ہیں پھر اس کی کیا ضرورت ہے چنانچہ معتزلہ نے تو اسی بناء پر کتابت اعمال کا صاف انکار ہی کر دیا ہے۔ اور اہل سنت نے اس مسئلہ میں تحقیق کی ہے اور جن نصوص میں کتاب یا وزن اعمال کی خبر دی گئی ہے ان کا یا تو انکار کیا اور یا ان میں تاویل کی گئی ہے۔

علت سے متعلق ہمارا مذہب

اہل سنت کی طرف سے حقیقی جواب تو یہ ہے کہ نصوص میں جب وارد ہوا ہے تو حق ہے گو ہم کو اس کی علت معلوم نہیں اور نہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے ہمارا تو یہ مذہب ہے۔

زبان تازہ کردن باقرار تو

نیکی بخش علت از کار تو!

آپ کا ذکر کرنا چاہیے نہ آپ کے کاموں کی علت

بندوں کے ناز کا سبب

باقی حکمت کے مرتبہ میں جو بات حق تعالیٰ نے میرے قلب پر وارد فرمائی وہ یہ ہے کہ بندوں کو اپنے مالک تعالیٰ شانہ سے بے نہایت تعلق و خصوصیت ہے کہ اس قدر کسی سے نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور یہ خصوصیت اس درجہ پر ہے۔ کہ اس کی وجہ سے بندوں کو ایک ناز ہو گیا ہے۔

محبت کا مدار دیکھنے پر نہیں

ایک شخص نے مجھ سے پوچھا تھا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کو کیسے محبت ہو گئی ہم نے ان کو دیکھا تو ہے نہیں۔ میں نے کہا کہ محبت کا مدار دیکھنے پر نہیں ہے۔ دیکھو اپنی جان سے کیسی محبت ہے بلکہ حق تعالیٰ سے جان سے بھی زیادہ تعلق ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق اول ہوا ہے اور اس تعلق کی ہی وجہ سے اپنی جان سے تعلق ہوا (لان بینہما علاقة العلیة) لیکن ہم کو غایت تعلق و قرب کی وجہ سے ہے اس کا احساس نہیں ہے اس کی مثال محسوسات میں موجود ہے مگر اس سے پہلے اول یہ معلوم کرنا چاہیے۔ کہ یہ فلسفی مسئلہ ہے اور نیز مشاہدہ ہے انسان کی قوت باصرہ ادراک مبصرات میں مستقل نہیں ہے بلکہ بواسطہ کسی خارجی نور کے ادراک کرتی ہے خواہ وہ نور شمس کا ہو یا چراغ کا نجوم کا اسی واسطے تاریک مکان میں خواہ کتنا ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں کچھ بھی نظر نہیں آتا پس اولاً ہم کو ادراک اس نور کا ہوتا ہے اور اس کے واسطے سے دوسری اشیاء ہم کو نظر آتی ہیں۔ اب سمجھئے کہ ہم نے مثلاً دیوار کو دیکھا تو ہم تو سمجھتے ہیں کہ اول ہم نے دیوار کو دیکھا اور دیوار کے سوا کوئی شے ہم کو نظر نہیں آتی حالانکہ اول ادراک ضوشمس کا ہوا اور اس کے واسطے سے دیوار نظر آئی مگر ہم اس نور کو غایت قرب کی وجہ سے اس کو مدرک اول نہیں جانتے مری اول دیوار ہی کو جانتے ہیں اور جو اصلی علت رویت کی تھی وہ غایت قرب کی وجہ سے مدرک نہیں ہوتی لیکن وہ ضیاء ہو سکتی ہے انسا اقرب الیک من الجدار یعنی اے دیکھنے والے میں تجھ سے دیوار کی نسبت قریب تر ہوں پس معلوم ہوا کہ غایت قرب بھی بعض اوقات مانع ادراک ہو جاتا ہے پس ایسا ہی تعلق و قرب ہم کو ذات باری تعالیٰ سے ہے کہ وہ اس قدر قوی ہے کہ غایت قوت کی وجہ سے اس کا ہم کو ادراک نہیں ہوتا اور تمام اشیاء کے ادراک کا وہ واسطہ ہے۔

کر اماً کاتبین صفت ہے

ان علیکم لحافظین کر اماً کاتبین یعلمون مات فعلون یعنی بے شک تم پر نگہبان مسلط ہیں جو کریم الذات ہیں اور لکھنے والے ہیں جانتے ہیں وہ شے جو تم کرتے ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کر اماً

کاتبین ان کا نام نہیں ہے جیسا کہ عوام میں مشہور ہے بلکہ ان کی یہ صفت ہے اور اس صفت کا یہ بھی اثر ہے کہ وہ مخلوق کریم کسی سے کہتے نہیں صرف لکھنے والے ہیں اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ لکھتے ہوں لیکن ہمارے کروت کی ان کو خبر نہ ہو پریس کی طرح کوئی شے ان کے پاس ہوگی کہ جب کوئی عمل ہم سے ہو اور وہاں منطبع ہو گیا۔ اس کا جواب دیتے ہیں۔ **يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ** یعنی جو کچھ کرتے ہو وہ اس کو جانتے بھی ہیں۔ صاحبو اگر یہ مضمون پیش نظر ہو جاوے کہ فرشتے ہمارے اعمال کو دیکھ رہے اور لکھ رہے ہیں واللہ کوئی گناہ نہ ہو۔

شرم کا مینی

بڑے شرم کی بات ہے کہ ایک پاک مخلوق جو کہ ہماری جنس بھی نہیں مگر ذی شعور و ذی عقول ہیں ہماری نافرمانیاں اور ناپاکیاں دیکھے اور لکھے اور بالخصوص غیر قوم جو ہمارے ہم جنس نہیں ہیں ان سے تو اور بھی زیادہ شرمانا چاہیے۔ دیکھو اگر ہم پر کسی غیر قوم کی حکومت ہوتی تو ہم کو بہ نسبت اپنی قوم کے ان سے زیادہ خوف ہوتا ہے۔ یہ تو آیت کا حاصل ہو اور جو مینی شرم کا اس آیت کی تقریر میں بیان کیا گیا ہے یعنی مخلوق کو اطلاع ہونا ہمارے اعمال کی اس کی تقویت کے لئے اور بھی بعض مخلوقات کے ہمارے اعمال پر مطلع ہونے کا مضمون بیان کیا جاتا ہے کہ اور بھی ایک دوسری جماعت ہے جو ہمارے افعال پر مطلع ہوتی ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کا غایت قرب

اسی واسطے ارشاد ہے **نحن اقرب الیہ من جبل الورد** یعنی ہم انسان اس کی رگ جان سے زیادہ قریب تر ہیں اور فرماتے ہیں **و نحن اقرب الیہ منکم** ولکن لا تبصرون یعنی ہم تمہارے تم سے بھی زیادہ قریب ہیں لیکن تم بصیرت نہیں رکھتے غرض حق تعالیٰ کے ساتھ جان سے بھی زیادہ محبت ہے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محبت اگر ہو سکتی ہے تو وہ خدا ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے اور کسی شے کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی پس اس غایت قرب کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں کو اپنے خالق تعالیٰ شانہ پر ایک قسم کا ناز ہے جیسے بچہ کو غایت تعلق کی وجہ سے ماں پر ناز ہوتا ہے کہ شرم کم ہو جاتی ہے پس فی نفسہ تو اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ گناہ سے بچنے کا نہ تھا کہ بندہ اپنے خالق تعالیٰ شانہ سے شرم کر گناہ کو چھوڑ دیتا لیکن ناز نے اس شرم کا اثر کم کر دیا اور نیز ہمارا قصور فہم بھی عارض ہو گیا اس لئے یہ طریقہ کافی نہ ہو اور یہ قرب حاجب عن المعصیان نہ ہوا۔ اس لئے ضرورت ہوئی ایسے طریقہ کی کہ جو اس کے تدارک تلافی کر سکے۔

اعمال لکھنے کیلئے فرشتوں کے مقرر کرنے کا سبب

اور وہ طریقہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے اعمال کی کتابت کے لئے فرشتے مقرر فرمادئے اور پھر ہم کو

اس کی خبر کر دی گویا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اعمال کی صرف ہم کو ہی خبر نہیں بلکہ فرشتوں کو بھی خبر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ان علیکم لحافظین کراما کاتبین یعلمون ما تفعلون پس یہ معلوم ہو کر ہمارے افعال کی ملائکہ کو بھی خبر ہے نہایت غیرت اور شرم آدے گی اور اس کا استحصار اگر تام ہو جائے تو بالیقین گناہ سے احتراز ہو جائے اسی طرح گناہ پر سزا خود بھی دے سکتے تھے۔ مثلاً گناہ کرتے ہی ایسا درد پیدا ہوتا کہ بے قرار ہو جاتا لیکن یہ طریقہ بھی کافی نہ ہوتا۔ دیکھ لیجئے اگر باپ بیٹے کو سزا دے تو وہ زاجر نہیں بخلاف اس کے کہ استاد یا غیر اس کو سزا دے کہ وہ کافی ہوتا ہے اس لئے سزا دینے کے لئے بھی ملائکہ کو بھی مقرر فرمایا پس یہ ہے وہ مضمون جس پر بے ساختہ مجھ کو یہ شعر یاد آتا ہے۔

خوشر آن باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگران
(اچھا یہ ہوتا ہے کہ دوستوں کی باتیں دوسروں کی باتوں کے دوران بیان کر دی جائیں)

علماء محققین ہی نے مقاصد قرآن کو سمجھا ہے

چنانچہ ارشاد ہے یا ایہا الانسان ما غرک بربک الکریم یعنی اے انسان تجھ کو اپنے رب کریم کے ساتھ کس شے نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔ بعض اہل حال کو یہ آیت سن کر حال طاری ہو گیا ہے اور انہوں نے جواب میں کہا ہے غرنسی کر مک یعنی آپ کے کرم نے ہم کو مغرور کر دیا ہے علماء و محققین نے اس پر انکار بھی کیا ہے لیکن ان کا انکار بھی بے جا نہیں ان کا منصبی کام اور حق یہی ہے کہ علماء محققین ہی نے مقاصد قرآن کو سمجھا ہے بلکہ انتظام شرع تو اس کو مقتضی ہے کہ محض ظاہری علماء کے علوم کو بھی محض صوفیہ کے علوم پر مقدم رکھا جاوے اور احادیث سے مطلقاً حضرات علماء کے مناقب مفہوم ہوتے ہیں۔

بعض تو وہ تھے جن کو علم الہی سے تاثر ہوتا ہے ان کے لئے تو یہی کافی ہے ان کے لئے تو یہ ارشاد ہے ما غرک بربک الکریم بعض کو اس سے اثر ہوتا ہے کہ فرشتے دیکھ رہے ہیں ان کے لئے یہ ارشاد ہے ان علیکم لحافظین کراما کاتبین بعض وہ ہیں جو جزا و سزا ہونے سے خائف ہیں ان کے لئے ارشاد ہوا ان الابرار لفی نعیم و ان الفجار لفی جحیم۔ اب یہاں پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ فرشتے تو ہر وقت ساتھ نہیں رہتے۔ چنانچہ جب پانچا نہ میں جاتے ہیں تو فرشتے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور نیز مردوں کو بھی ضرور نہیں ہے کہ ہر وقت علم ہو۔ اس لئے اس کی ہم کو یہ بھی خبر دے دی کہ قیامت کے دن جب کہ تمام اولین و آخرین جمع ہوں گے وہاں اعلان کیا جاوے گا کما قال تعالیٰ و یقول الاشهاد ہو لاء الذین کذبوا علی ربہم الا لعنة اللہ علی الظالمین غرض جو مخلوق گناہوں کے جاننے سے باقی رہ گئی تھی وہ سب وہاں دیکھیں گے اور سنیں گے۔ اب آخرت کی نسبت شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت دور ہے۔

آخرت کے دو درجے

بات یہ ہے کہ آخرت کے دو درجے ہیں زمان آخرت اور مکان آخرت، سو زمان آخرت بھی گو کچھ دور تو نہیں ہے لیکن خیر اس کی نسبت بعید ہونے کا گمان ہو سکتا ہے لیکن مکان آخرت تو بالفعل ہی موجود ہے اس لئے اس آسمان دنیا سے آگے مکان آخرت ہی ہے تو اگر ذہن میں یہ مضمون جمالو کہ چھت پر گویا ایک کثیر مخلوق ہم کو دیکھ رہی ہے تو یہ مراقبہ بھی ان شاء اللہ گناہ سے بچنے کے لئے کافی ہوگا۔ اور آسمان کے چھت ہونے سے کوئی شبہ ہی نہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

جعل لكم الارض فراشا و السماء بناء غرض یہ ہے کہ جس طرح ہو سکے گناہ سے بچو۔ (الاقضاح لمحققہ لہ نجات) اور اس جواب سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ پاخانہ کے وقت کے اعمال پر مطلع نہ ہونا فرشتوں کا تسلیم کر لیا گیا ہے بلکہ یہ جواب تو آخر جواب ہے باقی اس وقت کے اعمال پر بھی فرشتے مطلع ہو جاتے ہیں اب یہ کہ کیونکر مطلع ہو جاتے ہیں سو حق تعالیٰ کسی طریق سے مطلع فرمادیتے ہیں۔

سُورَةُ الْمُطَفِّفِينَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّحَجُوبُونَ ﴿١٥﴾

ترجمہ: ہرگز ایسا نہیں یہ لوگ اس روز (ایک تو) اپنے رب کا دیدار دیکھنے سے روک لئے جائیں گے پھر صرف اسی پر اکتفا نہ ہوگا بلکہ یہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔

تفسیری نکات

دنیا کا کوئی انسان محبت خداوندی سے خالی نہیں

فرمایا کہ بعض اہل لطائف کا قول ہے کہ دنیا میں کوئی انسان خدا تعالیٰ کی محبت سے خالی نہیں ہے۔ مسلم کافر سب کو خدا تعالیٰ کی محبت ہے کسی کو کم کسی کو زیادہ اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ خدا تعالیٰ زجر و توبیخ کے لئے کفار کی شان میں فرماتے ہیں۔ کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون (پس اگر کفار خدا تعالیٰ کو دوست نہیں رکھتے تو اس حجاب کی وعید سے ان کو کیا زجر ہوا) اور اسی کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے حکمت مشروعیت حج کی نقل کی کہ وہ فرماتے تھے کہ ہر مسلمان کو ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ سے شدت کے ساتھ محبت ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اگر بالکل قرب و وصال نہ ہو تو یا محبت جاری رہتی ہے یا محبت ہلاک ہو جاتا ہے اور دونوں مضر ہیں اس لئے خدا تعالیٰ نے محبت و محبت کی حفاظت کی حکمت سے ایک مکان بنایا اور اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور جو معاملہ محبوب کے مشاہدے کے وقت عادتاً کیا جاتا ہے۔ یعنی طواف و تقبیل و التزام و مثل ذالک اس بیت کے ساتھ بھی مشروع فرمایا کہ محبت کو اگر پورا وصال نصیب نہ ہو تو اس معاملہ ہی سے کچھ تسکین ہو جائے اور اسی واسطے اس میں حجر اسود کو یمین اللہ کا لقب دیا کہ دست بوسی کے لئے بے قرار ہوں تو اس سے تسلی کر لیں۔

طواف کا حکم دیا کہ عاشق کی طبعی حالت ہے اور چونکہ عشق میں عادتاً مانع سے عداوت بھی ہوتی ہے اس لئے ایک مقام کو شیطان کی طرف سے منسوب کر کے اس کی رمی کا حکم دیا (رمی جمار) وغیرہ ذالک اور جب سفر حج اس حکمت سے مشروع ہوا تو اس سفر میں اگر ہزار ہا تکلیف بھی ہوں تو پروا نہ کرنی چاہیے۔

ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے

اگر کوئی یہ کہے کہ نعوذ باللہ ہم کو تو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں ہے تو میں کہوں گا تم غلط کہتے ہو کیونکہ ہر مسلمان کو خدا سے محبت ہے بلکہ کفار کو بھی اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔ اسی لئے تو کفار کو اللہ تعالیٰ نے یہ دھمکی دی ہے۔ کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون کہ کفار قیامت کے دن اللہ تعالیٰ (کے دیدار) سے محجوب رہیں گے۔ اگر ان کو محبت نہ ہوتی تو یہ دھمکی نہ دی جاتی۔ کیونکہ یہ دھمکی محبت ہی کے دل پر اثر کر سکتی ہے غیر محبت پر اس سے اثر نہیں ہو سکتا بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس کو غیر حق سے بھی محبت ہے اس کو بھی خدا ہی سے محبت ہے کیونکہ تمام مخلوق مظہر جمال الہی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو گنبد کے کلس پر آفتاب کی شاع پڑنے سے گنبد بھلا معلوم ہو اور بار بار اس کی چمک کو دیکھنے لگے تو حقیقت میں اس کو گنبد سے محبت نہیں بلکہ آفتاب سے محبت ہے۔ گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گنبد پر عاشق ہے۔

اسی طرح یہاں سمجھو کہ جس کسی کو کسی مخلوق کے ساتھ کسی کمال یا جمال کی وجہ سے محبت ہے حقیقت میں اس کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے کیونکہ مخلوق میں جو کچھ جمال و کمال ہے وہ جمال حق کا آئینہ ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ پس پشیم عاشقاں خود را تماشا کردہ اپنے حسن کو تو نے خوب رو لوگوں کے چہرے سے ظاہر کیا اور پھر عاشقوں کی آنکھ سے اپنے آپ کو دیکھا ہے۔

(مواظف نضائل صبر و شکر ص ۲۳۸۔ ما علیہ الصبر بالحقہ)

سورة البروج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالسَّمَاۤءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝۱

ترجمہ: قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔

تفسیری نکات بروج کی تفسیر

فرمایا۔ بعض مفسرین نے بروج کی تفسیر میں اہل بیت کا قول لے لیا ہے جس کا عربیہ میں کہیں نشان نہیں مزید برآں اس کے ساتھ نجوم کو بھی شامل کر لیا کہ خاص کو اکب کا خاص بروج سے تعلق مانا اور یہ اہل نجوم کا خیال ہے اور وہ بھی محض اس وہمی بناء پر کہ مثلاً شمس گرم ہے اور اسد کا مزاج بھی گرم ہے تو شمس کا تعلق اسد سے ہوگا اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے کیونکہ اسد جو گرم ہے تو حیوان ہے نہ کہ شکل اسد جو کو اکب کے اجتماع سے متخیل ہوگی۔ نیز اب وہ شکل بھی اہل فن کے نزدیک بروج میں مجتمع نہیں رہی۔ (الکلام الحسن ج ۱ ص ۶۶، ۶۷)

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدِ ۝۱۵

ترجمہ: عرش کا مالک اور عظمت والا ہے۔

تفسیری نکات اختلاف قراءت

فرمایا کہ غیر مقلدین اس امر کے مدعی ہیں کہ حضور ﷺ سے مواقع آیات میں وصل فرمانا یا غیر مواقع

آیات میں وقف فرمانا منقول نہیں ہے لیکن فواصل کا اختلاف قراءت اس دعوے کے ایک جزو کی قطعاً تردید کرتا ہے کیونکہ یہ امر مجمع علیہ ہیں۔ اختلاف قراءت آرائے امت سے نہیں بلکہ مسموع و منقول ہیں۔ حضور ﷺ سے اور اگر اجتہاد و رائے سے ہوتا تو اب بھی بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں متعدد اعراب ممکن ہیں۔ لیکن وہاں صرف ایک ہی قراءت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اب جن مقامات پر اختلاف ہے وہ مسموع ہے نیز علاوہ اجماع کے اختلاف قراءت متواتر منقول ہیں جن کے انکار کی گنجائش ہی نہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ذوالعرش المجید مجید کی دال پر آیت یقیناً ہے لیکن پھر بھی اس میں صحابہ سے دو قراءت منقول ہیں متواتر ابکسر الدال علی انه صفة اللعش و بضم الدال علی انه تابع لذو پس یہ اختلاف اس امر کو صاف بتلاتا ہے کہ حضور ﷺ نے اس موقع پر گاہ گاہ وصل بھی فرمایا ہے۔

سُورَةُ الْأَعْلَى

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ۖ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ۝

ترجمہ: بامراد ہوا جو شخص (قرآن سن کر خباثت عقائد و اخلاق) سے پاک ہو گیا اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور ذکر کرتا رہا۔

تفسیری نکات تین اعمال کا بیان

یہاں تین اعمال بیان کئے ہیں ایک تزکی ایک ذکر اسم ربہ ایک صلی یہاں پر تزکیہ سے عام مراد بھی لے سکتے ہیں ذمائم باطنی سے بھی تزکیہ ہو اور معاصی جوارج سے بھی۔ مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمائم باطنی سے پاکی مراد ہے چنانچہ ارشاد ہے ونفس وما سواها فالهمها فجورها وتقواها قد افلح من زكها۔ اور قسم ہے انسان کی جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا اور پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگار (دونوں باتوں کا) اس کو القاء کیا۔ یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے (جان) کو پاک کر لیا۔ زکھا میں مفعول کی ضمیر نفس کی طرف ہے کہ نفس کا تزکیہ کر لیا۔ اس آیت میں تصریح ہے کہ مدار فلاح کا تزکیہ نفس پر ہے اور ظاہر ہے کہ نفس کا تزکیہ اور اس کی پاکی ذمائم باطنی کے ازالہ سے ہوتی ہے۔

پہلی آیت میں تو تزکیہ باطن کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں ایک ظاہر اور دوسرا من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن دونوں کے تزکیہ کا ذکر ہے کیونکہ عمل تین حال سے خالی نہیں یا تو اس کا تعلق باطن سے ہے یا افعال جوارج سے اور یا زبان سے۔ اعمال جوارج تو ظاہر ہیں اور زبان برزخ ہے۔ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن اور حسا بھی چنانچہ اگر منہ بند رکھو تو زبان باطن میں داخل ہے اور منہ کھولو تو ظاہر میں خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ باطن کی

بھی اصلاح کرو اور ظاہر کی بھی۔ یعنی زبان جو ارج اور قلب کی درستی اور بجائے اس ساری فہرست کے ذکر اسم ربہ فصلی فرمایا کہ اگر اس کو اختیار کرو گے تو بآسانی تمام امور کی درستی پر قادر ہو جاؤ گے۔ ان سب کی فہرست یاد رکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

وساوس شیطان کا جواب

ذکر اسم ربہ فرمانے سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ ذات حق کا جب تصور نہیں ہو سکتا تو اس کی یاد کیسے ہو سکتی ہے۔ بعض سالکین کو اس قسم کے خطرات پیش آتے ہیں۔ یہ سب شیطان کے حیلے بہانے ہیں کہ وہ خدا کی یاد سے روکنا چاہتا ہے اس واسطے حق تعالیٰ نے اس جگہ اسم کا لفظ آیت میں بڑھا دیا کہ اگر کسی کا ذکر نہیں ہے تو اسم کا تو ممکن ہے اسی واسطے قرآن شریف میں فاذا کرونی اور واذا کوربک فی نفسک مطلب یہ کہ ذات کا تصور نہ ہو سکے تو صفات کا سہی اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اسم اور لفظ ہی کا سہی۔ اسی لفظی ذکر سے پھر حقیقی ذکر بھی نصیب ہو جاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس لفظی ذکر سے حقیقی ذکر کا قصد ہو۔ یہ قصد ہی ایسی چیز ہے کہ اس سے باطن میں اثر ضرور ہوتا ہے۔

ذکر نماز کا مقدمہ ہے

اس آیت میں ایک نکتہ اور ہے وہ یہ کہ فصلی میں توف لائے اور ذکر اسم ربہ میں واؤ۔ حالانکہ دونوں جگہ عطف ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ نماز بعض وجوہ سے مقصود اعظم ہے کیونکہ ذکر پر نماز کی اس طرح تفریح کی ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر مقدمہ ہے نماز کا اور اصل مقصود (نماز ہے پس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اول ذکر سے نماز کی قابلیت پیدا کی اور پھر نماز پڑھی۔ اس سے نماز کی مقصودیت عظمیٰ معلوم ہوئی دوسرے قد افلح من تزکی کے ساتھ و ذکر اسم ربہ فصلی کی قید لگانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ گو تزکیہ بہت بڑا عمل ہے مگر بغیر نماز کے فلاح کے لئے کافی نہیں ہاں جب کہ تزکیہ کے ساتھ نماز بھی پڑھی تو اس وقت سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری فلاح ہوگی نماز سبب عظمیٰ ہے فلاح کا۔ کیونکہ وہ بھی ذکر ہے۔ مگر یہ بات اسی وقت حاصل ہوگی جبکہ نماز کی تکمیل کرے وقت پر پڑھے جماعت کے ساتھ ادا کرے قرآن کی تصحیح کرے اور قلب کے متوجہ کرنے کی کوشش کرے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دے مگر نرمی سے دوسرے کو ذلیل مت سمجھے اگر کسی کو سیاست کرنا پڑے تو اس کو حقیر نہ سمجھے۔ پس امر بالمعروف اس طرح ہونا چاہیے اور اس طرح دوسروں کو بھی اپنے ساتھ فلاح میں لاؤ۔ (الصلوة بالحقۃ فضائل صوم و صلوة)

لہذا اولیٰ یہ ہے کہ یہاں بھی ذمائم باطنی ہی سے تزکیہ مراد ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظاہری اعمال کی

ضرورت نہیں جیسا کہ بعض لوگ آج کل کہتے ہیں۔ سوترکیہ باطن کا حکم دینے سے حق تعالیٰ کا یہ مقصود نہیں کہ تزرکیہ ظاہر ضروری نہیں۔ اگر یہ مقصود ہوتا تو آگے و ذکر اسم ربہ فصلی کیوں فرماتے بلکہ مقصود یہ ہے کہ نفس کا پاک کرنا اصل ہے اور ظاہر اس کی فرع ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر یسز کیہم فرمایا ہے تو اس سے بھی اسی قرینہ سے تزرکیہ نفس مراد ہے کیونکہ اصل چیز تو تزرکیہ باطن ہی ہے۔ اگر تزرکیہ باطن اصل چیز نہ ہوتی تو آپ حدیث میں یہ کیوں فرماتے۔

التقویٰ ہہنا و اشار الی صدرہ کہ تقویٰ یہاں پر ہے اور آپ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ الغنی غنی النفس (کہ غنا نفس کا غنا ہے) اس کا یہ مطلب نہیں کہ غنا ظاہری چیز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل غنا تو نفس ہی کا ہے اور جب نفس میں غنا ہوتا ہے تو پھر ویسے ہی افعال صادر ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ مطلب نہیں کہ تقویٰ ظاہری کوئی چیز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کی جڑ تو قلب میں ہے اور جب تقویٰ قلب میں ہوتا ہے تو افعال بھی اچھے ہی صادر ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے کہ اگر تقویٰ قلب میں نہ ہوگا تو اچھے افعال کے صادر ہونے کا تقاضا نہ ہوگا۔

پس و ذکر اسم ربہ فصلی میں تزرکیہ ظاہر اور تزرکیہ ماہوبین الظاہر والباطن (یعنی برزخ) دونوں کا ذکر ہو گیا۔ فصلی تو ظاہر کے متعلق ہے اور ذکر اسم ربہ زبان کے متعلق جو کہ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے غرض دونوں قسم کے تزرکیہ کا ذکر اس آیت میں آ گیا۔

پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ باطن کی بھی اصلاح کرو اور ظاہر کی بھی اصلاح کرو اور ایسی چیز کی بھی اصلاح کرو جب من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے حاصل یہ تین فعل ہیں۔

۱۔ زبان کی درستی ۲۔ جوارح کی درستی ۳۔ قلب کی درستی

پس مطلب یہ ہوا کہ ہر قسم کی درستی کرو اور چونکہ وہ امور جن کی درستی ہونا چاہئے اتنے ہیں کہ ہر وقت ان کی تفصیل یاد رکھنا مشکل تھا اور بدوں استحصار درستی کا اہتمام مشکل۔ اسی لئے اس کی سہولت کے لئے بجائے اس ساری فہرست کے ذکر اسم ربہ فصلی فرمادیا۔

راز اس کا یہ ہے کہ اس میں ایک ضابطہ بتلاتے ہیں کہ اگر اس کو اختیار کر لو گے تو بآسانی تمام امور کی درستی پر قادر ہو جاؤ گے۔ ان سب کی فہرست یاد رکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

برائیوں سے بچنے کا طریق

اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر اپنا اصل کام ذکر کو سمجھو گے تو خود بخود سب چیزوں سے رک جاؤ گے۔ غلطی ہماری یہ ہے کہ ہم اصل کام ذکر کو نہیں سمجھتے۔ اسی واسطے برائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ برائیوں میں کبھی

بتلانا ہوں۔ مشائخ برائیوں کے چھوڑنے کی تعلیم تفصیلاً بھی کرتے ہیں مگر سب سے اہل یہ طریقہ ہے کہ اپنے لئے ایک اصل کام تجویز کر لے پھر اس میں مشغول ہونے سے خود ہی سب برائیاں چھوٹ جائیں گی۔ وہ اصل کام ذکر ہے۔ تو جو چیزیں اس میں نخل ہوں گی خود بخود ان سے انقباض ہوگا تو بقدر ضرورت ہوگا اور ضرورت اسے کہتے ہیں کہ بدوں اس کے ضرر ہونے لگے۔

مثلاً نوکر کو کوئی ایسا کام بتلانا ہے کہ اگر نہ بتلائے تو گا ضرر ہوگا۔ یہ ضرورت ہے پس اس کو تو وہ اختیار کرے گا اور ایک ہے مشغلہ کے طور پر باتیں ہانکنا۔ لغویہ غیر ضروری ہیں جو شخص ذکر کو اصلی کام سمجھے گا وہ کبھی اس میں مشغول نہ ہوگا۔

اہل علم کی نازک حالت

یہاں ظاہر ایہ مناسب معلوم ہوتا تھا کہ یوں فرماتے ذکر ربہ فصلی لفظ اسم کیوں بڑھایا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ذکر ربہ فرماتے تو اس میں بعض سالکین کو یہ شبہ ہوتا کہ خدا کو کیسے یاد کریں۔ کیونکہ یاد کرنا موقوف ہے تصور پر اور تصور بڑا مشکل ہے کیونکہ ان تک ہمارے ذہن کی رسائی کہاں ہو سکتی ہے۔ ان کی تو یہ شان ہے۔

اے بر تراذ خیال و قیاس و گمان و وہم وز ہرچہ گفتہ ایم و شنیدہ ایم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر ماہمچناں در اول و صف تو ماندہ ایم
اور یہ شان ہے

در تصور ذات و رائج کو مادر آید در تصور مثل او

غرض کہ ذکر اللہ کو بعض لوگ اس لئے بیکار سمجھتے ہیں کہ خدا تک ہماری رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر یاد کہاں۔ اہل سلوک تک اس میں بتلا ہیں۔ اس واسطے حق تعالیٰ نے اس جگہ اسم کا لفظ آیت میں بڑھا دیا کہ اگر مسمیٰ کا ذکر نہیں ہے تو اسم کا تو ممکن ہے اور بعض جگہ قرآن شریف میں ذات کے ذکر کرنے کو بھی فرمایا ہے جیسے فاذا کرونی اور کہیں صفت کے ذکر کو لائے ہیں جیسے واذا کر ربک فی نفسک مطلب یہ ہے کہ ذات کا تصور نہ ہو سکے تو صفات کا سہی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو اسم اور لفظ ہی کا سہی۔ لفظی ذکر سے پھر حقیقی ذکر بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس لفظی ذکر سے حقیقی ذکر کا قصد ہو۔ یہ قصد ہی ایسی چیز ہے کہ اس سے باطن میں ضرور اثر ہوتا ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۱۵

ترجمہ: بلکہ تم ترجیح دیتے ہو دنیاوی زندگی کو

تفسیری نکات

فلاح کا طریقہ

بل تو ثرون الحیوة الدنیا بل اس میں اضراب کے واسطے ہے جس کے معنی ہیں اعراض کرنا ایک بات سے دوسری بات کی طرف۔ جیسے یوں کہیں جاؤ زید بل عمرو۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زید کی طرف جو نسبت آنے کی تھی اس سے رجوع کر کے یہ نسبت عمرو کی طرف کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح کا طریقہ تو وہ ہے جو بتلایا گیا۔ تمہیں اسی طریقے کو اختیار کرنا چاہیے تھا۔ اس کے اختیار کرنے سے فلاح حاصل ہوتی مگر اس کو اختیار نہیں کرتے۔ بل تو ثرون الحیوة الدنیا بلکہ تم اس سے اعراض کر کے اور اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہو۔ جس سے فلاح حاصل ہو سکتی ہے۔

اس میں مدعیان عقل کی غلطی بیان کر رہے ہیں کہ فلاح کا طریقہ وہ ہے جو ہم نے بیان کیا نہ کہ وہ جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ یوں فلاح تو سب کو مطلوب ہے اس میں کسی کو کلام نہیں۔ مقصود اصلی سب کا یہی ہے باقی اس کے طریقے میں اختلاف ہے۔ مدعیان عقل تو فلاح کا طریقہ اور بتاتے ہیں اور حق تعالیٰ دوسرا طریقہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور بتلا رہے ہیں کہ اس طریقہ کو اختیار کرو گے تو فلاح ہوگی نہ اس طریقہ سے جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فلاح تو مطلوب عام ہے یعنی سب اسی کو چاہتے ہیں۔ کسی کو بھی اس میں تردد نہیں مگر اس کے طریقہ میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا (الاحزاب آیت ۵۳) جب تم کو بلایا جائے تب جایا کرو پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو۔

مقلب به اجمع الکلام فی انفع النظام

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل تو اکثر اہل علم سے بھی امید بہت کم ہو گئی کہ آئندہ ایسے امور کی اصلاح کریں جن میں عام ابتلا ہے کیونکہ یہ لوگ خود ہی قابل تربیت ہیں ایک طالب علم آئے تھے مراد آباد سے انہوں نے یہاں سے جا کر اعتراض کے طور پر لکھا کہ تم نے جو اوقات کا انضباط کیا ہے خیر القرون میں یہ

انضباط نہ تھا اس لئے بس سب بدعت ہے مگر جواب کے لئے نہ ٹکٹ تھا نہ کارڈ اگر ہوتا تو میں جواب لکھتا کہ تم نے جو مراد آباد کے مدرسہ میں پڑھا ہے وہاں پر بھی اسباق کے لئے اوقات کا انضباط تھا کہ ۸ بجے تک فلاں سبق اور ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک فلاں سبق اور ۲ بجے سے ۳ بجے تک فلاں سبق یہ بھی خیر القرون میں نہ تھا لہذا یہ بھی بدعت ہو اس بنا پر آپ کا سارا علم جو بدعتی طریق پر حاصل کیا گیا ہے نامبارک اور ظلماتی ہوا بلکہ اگر بدعت کے یہ معنی ہیں جو ان حضرت نے سمجھے ہیں کہ جو چیز خیر القرون میں نہ ہو تو خیر القرون میں تو ان کا بھی وجود نہ تھا پس یہ بھی مجسم بدعت ہوئے کیا خرافات ہے۔ تحصیل علم کرنے والوں کے فہم کی حالت ہے عوام بے چاروں کی تو کیا شکایت کی جائے جب کہ لکھے پڑھے علم کے مدعی اس زمانہ میں بکثرت اس قدر بد فہم اور کم عقل پیدا ہو رہے ہیں ان بزرگ کو بدعت کی تعریف بھی معلوم نہیں یہ انضباط کسی کے اعتقاد میں عبادت تو نہیں اس لئے ان کا خیر القرون میں نہ ہونا اور اب ہونا بدعت کو مستلزم نہیں میں نے حیاۃ المسلمین روح ہشتم (نمبر ۳) میں ایسے انتظامات کے متعلق لکھ دیا ہے چنانچہ ایک آیت میں ہے کہ اس بات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوتی ہے سو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں (اور زبان سے نہیں فرماتے کہ اٹھ کر چلے جاؤ) اور اللہ تعالیٰ صاف صاف بات کہنے سے (کسی کا لحاظ نہیں کرتے) (سورۃ احزاب) اسی واسطے خود فرما دیا۔

اِذَا دَعَيْتُمْ فَاذْخُلُوا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا الْاٰیۃ

اور اس مقام میں جس طرح شان انتظامی کی تعلیم کی ہے اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر دلالت سے جیسا کہ سستی سے معلوم ہوتا ہے اللہ اکبر کیا انتہا ہے آپ کی مروت کی کہ اپنے غلاموں کو بھی یہ فرماتے ہوئے شرماتے تھے کہ اب اپنے کاموں میں لگو مگر یہ لحاظ اپنے ذاتی معاملات میں تھا احکام کی تبلیغ میں نہ تھا اور اس باب میں بہت نصوص ہیں اب یہاں کے قواعد اور ان ضوابط کے متعلق ایک غیبی لطیفہ سنئے ایک صاحب مخلص اور دوست یہاں پر مہمان ہوئے ان کے ساتھ ان کا ملازم ایک بے ریش لڑکا تھا قانون یہاں پر یہ ہے کہ شب کو بے ریش لڑکا خانقاہ میں نہیں رہ سکتا مگر چونکہ ان سے بہت خصوصیت کا تعلق تھا اور ان کی نگرانی پر اعتماد بھی تھا اس لئے ان سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ کہتے ہوئے شرمایا غرضیکہ وہ شب کو مع اپنے اس ملازم کے خانقاہ میں مقیم رہے صبح کو بعد نماز فجر کہنے لگے کہ رات بڑی ہی طبیعت کو انتشار رہا وہ یہ کہ میں نے رات کو خواب میں حضرت حافظ ضامن صاحب کو دیکھا کہ بہت خفا ہوئے ہیں کہ بے ریش لڑکے کو لے کر خانقاہ میں کیوں قیام کیا میں نے کہا کہ قانون تو یہاں کا یہی ہے مگر محض آپ کے لحاظ سے اس کا اظہار نہیں کیا گیا مگر آج معلوم ہوا کہ یہاں زندہ ہی منتظم نہیں مردے بھی منتظم ہیں۔ (یہ مزاحاً کہا گیا) پھر میں نے کہا کہ اب سے امرد کو ساتھ مت لانا اور مجھ کو بھی اس خواب پر بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ ان کو خبر بھی نہ تھی کہ یہ معمول ہے اس لئے قوت متحیلہ کا بھی احتمال نہ تھا۔ (الاقاضات الیومیہ ج ۲ ص ۱۲۱۲)

ذکر اللہ اور دنیا

اس آیت میں دو دعوے ہوئے ایک تو یہ کہ تم لوگ ترجیح دے رہے ہو دنیوی زندگی کو آخرت پر دوسرے یہ کہ اس سے فلاح حاصل نہ ہوگی۔ پہلا دعویٰ تو بدیہی بلکہ حسی ہے چنانچہ لوگوں کے معاملات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شب و روز دنیا ہی میں منہمک اور اس کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں تک دین سے بے تعلقی ہے کہ اگر دین کو بھی اختیار کرتے ہیں تو اس میں بھی دنیا کی آمیزش ہوتی ہے حالانکہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ دنیا میں بھی دین ہی کی شان ہوتی چونکہ اہل ایمان کی شان کو ایک موقع پر حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ لا تلهیہم تجارة ولا بیع عن ذکر اللہ و اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ یعنی ان کی یہ شان ہے کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔

تجارت تو اس کو کہتے ہیں جو بڑا معاملہ ہو اور بیع چھوٹے اور بڑے معاملہ دونوں کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ بڑا معاملہ ان کو ذکر اللہ سے غافل کرتا ہے اور نہ چھوٹا معاملہ غافل کرتا ہے۔ سو یہ شان ہوا کرتی ہے اہل ایمان کی اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے کہ ذکر اللہ اور دنیا میں اجتماع کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے نظائر موجود ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت بل توثرون الخ میں ترجیح کی مذمت ہے اور جہاں دنیا کے ارادہ پر مذمت آئی ہے تو اس سے مراد خاص ارادہ ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیہا ما نشاء لمن یرید ثم جعلنا لہ جہنم یعنی جو دنیا کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اس کو جس قدر چاہیں دے دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کا ٹھکانا جہنم کو بناتے ہیں۔

اس آیت میں مطلق ارادہ مراد نہیں بلکہ ارادہ خاص مراد ہے کیونکہ آگے فرماتے ہیں۔ ومن اراد الاخرۃ۔ الا یہ پس معلوم ہوا کہ وہ ارادہ دنیا ہے جو مقابل ہے من اراد الاخرۃ کے یعنی جس میں ارادہ آخرت نہ ہو پس ارادہ دنیا کی دو صورتیں ہوں گی۔ ایک وہ ارادہ دنیا جس کے ساتھ لم یرد الاخرۃ ہو پس اس آیت میں پہلا ارادہ مراد ہے۔ ایک اور موقع پر ہے من کان یرید حرث الاخرۃ نزدلہ فی حرثہ و من کان یرید حرث الدنیا نزلہ فیہا و مالہ فی الاخرۃ من نصیب۔ یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ من کان یرید حرث الدنیا ولم یرد حرث الاخرۃ تقابل قرینہ ہے۔ اس کا۔ اگر کسی مقام پر قرینہ مذکور نہ ہو تو اس کو بھی اس آیت سے مقید کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے۔ من کان یرید الحیوۃ الدنیا وزینتہا نوف الیہم اعمالہم فیہا وہم فیہا لا یبخسون اولئک الدین لیس لہم فی الاخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیہا و باطل ما كانوا یعلمون۔

گو کہ یہاں لفظوں میں تقابل نہیں مگر اس کو بھی دوسری آیت کی وجہ سے مقید کریں گے کہ مراد یہ ہے من كان يريد الحياة الدنيا وزينتها ولم يرد الاخرة پس یہ معلوم ہو گیا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دینا مذموم ہے اور کسب دنیا مذموم نہیں۔ سو جن صاحبوں کا یہ گمان ہے کہ مولوی دنیا ہی کو چھوڑنا چاہتے ہیں میرے بیان سے ان کے خیال کا غلط ہونا ثابت ہو گیا۔

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا کے ہم اتنے معتقد ہیں کہ معترضین بھی اتنے معتقد نہیں۔ آپ تو دنیا کو جائز ہی کہہ رہے ہیں اور ہم اس کو ضروری کہتے ہیں۔ لہذا ہم آپ سے دنیا کے زیادہ معتقد ہوئے۔ مگر ضروری ہونے کے ساتھ دوسرا مسئلہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ الضروری يتقدر بقدر الضرورة کہ ضروری چیز بقدر ضرورت اختیار کی جاتی ہے۔ سو دنیا ہے ضرورت کی چیز مگر بقدر ضرورت ہی اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ بس قدر ضرورت اس کو حاصل کر لو۔ اس کو کون منع کرتا ہے اور زینت میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے وہ قابل ترک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ طالب ہیں زینت کے تو وہ دنیا کو ضرورت سے زیادہ چاہ رہے ہیں جو قاعدہ مذکورہ کی بناء پر قابل ترک ہے۔ آیت میں بھی وزينتها كلفظ جو بڑھایا ہے اس سے بھی اس کا مذموم ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس پر وعید فرمائی ہے۔

بس طلب کے دو درجے ہوئے۔ ایک طلب بقدر ضرورت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جس سے ضرورت رفع ہو جاوے اور ایک طلب زینت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جو ضرورت سے زائد ہو۔ سواول کی مذمت نہیں پانی کی مذمت ہے کیونکہ اصلی مقصود رفع ضرورت ہے اب جو دنیا اس کے لئے حاصل کی جائے گی وہ مقصود بالغیر ہوگی اور جو اس سے آگے بڑھے گا تو وہ مطلوب بالذات ہوگی اور دنیا کو مطلوب بالذات بنانا یہی قابل مذمت ہے۔

ایک شبہ کا جواب

منکم من يريد الدنيا و منکم من يريد الاخرة۔ یہ قرآن کا جملہ ہے اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بعض صحابہ دنیا کے بھی طالب تھے۔ اس کے علماء نے بہت سے جواب دیئے ہیں۔ مگر سب سے اچھا جواب ابن عطاء اسکندری کا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ بعض صحابہ دنیا کے طالب تھے تو جواب یہ ہے کہ ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں۔ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا لدنیا اور ایک ارادہ دنیا لآخرت۔ پہلا ارادہ مذموم ہے دوسرا مذموم نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا جامی کا قصہ ہے کہ وہ خواجہ عبداللہ احرار کی خدمت میں بیعت کے ارادہ سے گئے خواجہ صاحب کے پاس بڑی ثروت تھی۔

مولانا جامی چونکہ طالب تھے اور طالب بے باک ہوا ہی کرتا ہے اس وجہ سے ان کی یہ حالت دیکھ کر مولانا جامی نے یہ مصرع پڑھا۔ نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد

اور واپس چلے آئے اور مسجد میں آ کر سو رہے تھے خواب میں دیکھا کہ میدان حشر برپا ہے۔ اسی حالت میں کسی صاحب معاملہ نے آ کر ان کو پکڑ لیا اور کہا دو پیسے لاؤ۔ فلاں معاملہ میں دنیا میں تمہارے ذمہ رہ گئے تھے۔ اب یہ ہر چند پیچھا چھڑاتے ہیں وہ چھوڑتا نہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ خواجہ صاحب کی سواری آئی آپ نے فرمایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کر رکھا ہے۔ ہم نے جو یہاں خزانہ جمع کیا ہوا ہے وہ کس واسطے ہے ان کے ذمہ جتنا مطالبہ ہے اس میں سے ادا کر دو ان کے کہنے سے انہیں رہائی ملی۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا خواجہ صاحب کی سواری آ رہی ہے۔ اب یہ بہت ہی محبوب ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ مصرعہ تو پڑھو جو تم نے پڑھا تھا۔ اب یہ شرم کے مارے پڑھتے نہیں اصرار کرنے پر پڑھا۔ نہ مردست آنکھ دنیا دوست دارد

آپ نے فرمایا کہ ابھی یہ نا تمام ہے۔ اس کے ساتھ یہ اور ہونا چاہیے۔ اگر دارد برائے دوست دارد

طلب دنیا مذموم نہیں

تو اس مقام پر تو ثرون ارشاد فرمایا تطلبون یا تکسبون ارشاد نہیں فرمایا یعنی یہ نہیں فرمایا بل تطلبون الحیوة الدنیا کہ تم حیات دنیا کو طلب کرتے ہو یا تکسبون الدنیا کہ تم دنیا کماتے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ تم ترجیح دیتے ہو حیات دنیا کو۔ سوا اور الفاظ کو چھوڑ کر جو تو ثرون فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا چھوڑانی نہیں جاتی۔ دنیا کمانے کو منع نہیں کیا جاتا۔ قرآن شریف میں تو خود ہی ایسا لفظ موجود ہے جس سے اشارہ ہو گیا اس طرف کہ دنیا کا طلب کرنا مذموم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو مذمت کر رہے ہیں تو دنیا کی ترجیح دینے پر کر رہے ہیں۔ نہ دنیا کی طلب اور اس کی تحصیل پر۔

حیات آخرت

اب ایک چھوٹی سی بات اس آیت کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ قرآن شریف میں دنیا کے ساتھ تو لفظ حیات لائے۔ مثلاً فرمایا الحیوة الدنیا اور آخرت کے ساتھ لفظ حیات نہ لائے۔ یوں نہیں فرمایا و حیوة الاخرة خیر و ابقی پر کیا بات ہے؟

سو اس میں یہ بتلایا ہے کہ آخرت حیات ہی حیات ہے وہاں ممات کا کچھ کام نہیں۔ پس اس میں حیات کا لفظ لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ حیات آخرت تو جب کہا جاوے گا جب کہ اس میں غیر حیات کوئی اور شے بھی ہو۔ پس جب کہ حیات آخرت ایسی چیز ہے اور لوگ پھر بھی اس کی طلب نہیں کرتے۔ تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ لوگوں نے آخرت کو پہچانا ہی نہیں ورنہ اس کی طرف توجہ تام کرتے بلکہ دنیا کو بھی نہیں پہچانا ورنہ اس کی طرف رخ بھی نہ کرتے۔ دنیا ہی کو پہچان لو۔ اسی کو سوچو۔ اگر اس کی پوری حقیقت سمجھو تو اس مردار کا نام بھی نہ لو۔ تم جو دنیا

کے عاشق ہوئے ہو۔ ذرا اس کو دیکھو تو سہی۔

اسی کی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی بدبخت عورت نے پوڈر مل رکھا ہو اور دو چار چندھے اس پر عاشق ہو جاویں۔ حضرت دنیا کی بالکل ایسی حالت ہے۔

حالت دنیا را بہ پرسیدم من از فرزانه گفت یا خوابے ست یا بادے ست یا افسانہ باز گفتم حال آنکس گو کہ دلروئے بہ بست گفت یا غولے ست یا دیوے ست یا دیوانہ حقیقت میں دنیا کی ایسی مثال ہے۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے شکایت فرمائی ہے۔ بل تو ثرون الحیوة الدنیا والآخرۃ خیر و ابقی کہ دنیا ایسی رذیل چیز کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت خیر اور ابقی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو ترجیح دینا یہ شکایت کی بات ہے نہ دنیا کو طلب کرنا۔ اسی لئے یوں ارشاد فرمایا بل تو ثرون الحیوة الدنیا اور یہ نہیں فرمایا۔ بل تطلبون الدنیا آگے فرماتے ہیں والآخرۃ خیر و ابقی (یعنی تم دنیا کو ترجیح دیتے ہو) حالانکہ آخرت خیر بھی ہے اور ابقی بھی اس کو ترجیح دینا چاہئے نہ دنیا کو کیونکہ آخرت دو وجہ سے دنیا پر فضیلت رکھتی ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ خیر یعنی بہتر ہے دنیا سے کہ محل اعلیٰ درجہ کے باغ نہریں بہتی ہوئی جن کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا نہایت شیریں غرض ہر نعمت اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ دوسرے اس وجہ سے کہ ابقی ہوگی کہ یہ تمام نعمتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوں گی کبھی زائل نہ ہوں گی۔ تندرستی ایسی کہ کبھی سر میں درد تک نہ ہوگا۔

دنیوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہماری ایک حالت کا بیان فرمایا ہے پھر اس پر شکایت فرمائی ہے اور جس طرح اس حالت کے درجات مختلف ہیں کہ اس کا ایک درجہ کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور ایک درجہ اہل ایمان و اہل کفر دونوں میں مشترک ہے اسی طرح شکایت کے بھی درجات مختلف ہیں بڑے درجہ میں زیادہ شکایت ہے اور چھوٹے درجہ میں کم لیکن چھوٹا درجہ اہل ایمان اور کفر میں مشترک ہے۔ اس لئے اس درجہ میں شکایت بھی مشترک ہے۔ اب سنئے وہ حالت کیا ہے اور اس پر شکایت کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں بل تو ثرون الحیوة الدنیا (بلکہ تم نے دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے) اس میں لفظ بل اعراض کے لئے ہے یعنی پہلی بات سے اعراض کر کے اس کے مقابل دوسری بات کا ذکر ہے اس سے پہلے ارشاد ہے قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربہ فصلی۔ اس میں فلاح کا طریقہ بتلایا ہے کہ با مراد ہو اوہ شخص جو (قرآن سن کر خبیث عقائد و اخلاق اور ناشائستہ اعمال سے) پاک ہو گیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔ اس کے بعد لفظ بل اعراض کے لئے لایا گیا یعنی مگر اے منکر و تم قرآن سن کر اسے نہیں مانتے اور آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ تم دنیوی

زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حاصل یہ ہوا کہ فلاح کے مقابل ہماری یہ حالت ہے گو اس میں مقابلہ کی تصریح نہیں مگر لفظ بل مقابلہ کو بتلاتا ہے کیونکہ وہ موضوع ہے اعراض کے لئے جس کی حقیقت ہے پہلے کی نفی اور دوسرے کا اثبات اور اثبات و نفی میں تقابل ظاہر ہے پس اس سے صاف معلوم ہوا کہ دنیوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا فلاح کے خلاف ہے اور اسے فلاح مبدل بہ خسران ہو جاتا ہے۔ حق تعالیٰ اسی کی شکایت فرماتے ہیں کہ تم ترجیح دنیا علی الاخرة کے مرض میں مبتلا ہو فرماتے ہیں۔ بل تؤثرون الحیوة الدنیا (ای علی الاخرة) والاخرة خیر و ابقى۔ بلکہ تم دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت دنیا سے بہتر ہے اور زیادہ پائیدار ہے۔ یعنی تم اس کی کوشش کرتے ہو کہ دنیا میں عیش و عشرت اچھی طرح ہو آخرت چاہے کیسی ہے برباد ہو جائے۔ اس جگہ آخرت کے متعلق ایک لفظ خیر کا فرمایا ہے جو کہ اسم تفصیل کا صیغہ ہے مطلب یہ ہوا کہ آخرت دنیا سے بدرجہا بہتر ہے اور بہت بہتر ہے دوسرا لفظ اقی فرمایا کہ وہ بھی اسم تفصیل ہے کہ آخرت بہ نسبت دنیا کے پائیدار بھی زیادہ ہے مگر پھر بھی تم دنیا کو اس پر ترجیح دیتے ہو اور آخرت سے بے فکری حالانکہ ایک امر یہ بھی مشاہد ہے کہ آخرت سے بے فکری کے ساتھ دنیا اور گندی ہو جاتی ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے لفظ دنیا میں ہمارا عذر بیان فرمایا ہے کہ لو ہم تمہارے عذر کو بیان کئے دیتے ہیں۔ کہ تم دنیا کو اس وجہ سے آخرت پر مقدم کرتے ہو کہ اس سے منافع قریب اور عاجل ہیں لیکن اس کا جواب بھی سن لو۔ والاخرة خیر و ابقى (آخرت بہتر اور بہت پائیدار ہے) اس میں جواب ہے اس عذر کا جس سے اس کا غلط ہونا معلوم ہو گیا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ کسی منفعت کا محض عاجل ہونا اس کی ترجیح کے لئے کافی نہیں بلکہ ترجیح کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں سو دنیا میں ہر چند یہ صفت ہے کہ وہ عاجل ہے مگر آخرت میں اس کے مقابل دو صفتیں ہیں ایک خیریت دوسرے بقاء یعنی دنیا سے آخرت عمدہ اور کثیر بھی ہے اور پائیدار رہنے والی بھی ہے دنیا میں نہ وہ عمدگی اور زیادت ہے نہ پائیداری ہے اور ان دونوں میں سے ہر صفت ایسی ہے کہ اس کے مقابل وصف عاجل کو ہرگز کوئی ترجیح نہیں دیتا کیونکہ اگر عاجل ہونا ہمیشہ موجب ترجیح ہو تو پھر تجارت کبھی نہ ہو سکے کیونکہ اس میں سرمایہ عاجلہ کو اس وقت لگانا پڑتا ہے اور نفع زائد آجمل ہے لیکن تمام عقلاء اس وجہ سے تجارت کو موقوف نہیں کرتے کہ اس کا نفع بعد میں حاصل ہوتا ہے اور سرمایہ اس وقت موجود ہے بلکہ سب لوگ خوشی کے ساتھ موجود سرمایہ کو تجارت میں لگا دیتے ہیں محض اس امید پر کہ آئندہ نفع زائد ملے گا معلوم ہوا کہ زیادت و کثرت کے مقابلہ میں وصف عاجل نظر انداز کر دیا جاتا ہے پھر تم آخرت پر دنیا کو اس وجہ سے کیوں مقدم کرتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور آخرت آجمل ہے تم نے یہ بھی سوچا کہ آخرت دنیا سے کتنی زیادہ اور کتنی عمدہ ہے اسی طرح زراعت بھی دنیا میں نہ ہو سکتی کیونکہ اس میں بھی موجودہ غلہ کو آئندہ کی امید پر مٹی میں ملا دیا جاتا ہے اگر تم منفعت عاجلہ کے ایسے ہی عاشق ہو بس زراعت کو بھی جواب دے دو مگر تم ایسا نہیں کرتے بلکہ ہر سال زراعت

کرتے ہو کیونکہ اس میں زیادہ ملنے کی امید ہے پھر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے اس وصف کو کیوں دیکھتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور یہ آجل ہے ارے وہ آجل ایسی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کسی قابل بھی نہیں اور دوسری صفت آخرت میں یہ ہے کہ وہ اقی ہے بہت پائیدار ہے اور پائیداری بھی خود ایسا وصف ہے کہ اس کے مقابلہ میں وصف عجلت کوئی چیز نہیں چنانچہ دنیا میں اس کی صد ہا نظیریں ہیں ایک شخص آپ کو مکان دینا چاہتا ہے مگر اس کے پاس دو مکان ہیں ایک تو کچا بنا ہوا ہے اور چھوٹا بھی ہے اور دوسرا پختہ اور عالی شان ہے اور وسیع بھی ہے وہ آپ سے کہتا ہے کہ اگر تم پختہ مکان لینا چاہو تو میں یہ بھی دے سکتا ہوں مگر چار سال کے بعد یہ واپس لے لیا جائے گا اور اگر کچا مکان لینا چاہو تو وہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ملک کر دوں گا اب بتلائیے آپ کیا کریں گے۔ یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ بھائی عالی شان محل سے جو عاریہ ملتا ہو وہ کچا مکان اچھا جو دو اماں ملک ہو مگر افسوس تم دنیا و آخرت کے معاملہ میں اس فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہو کہ آخرت کو جو دو امی ہے دنیا کے لئے چھوڑتے ہو جو چند روزہ ہے انسان کی حیات ہی کیا ہے۔ بعض لوگ رات کو اچھے خاصے سوئے اور صبح کو مرے ہوئے پائے گئے اس ناپائیدار مردار کے لئے تم اپنا اصلی وطن برباد کرتے ہو جو ہمیشہ کیلئے حق تعالیٰ تمہارے نام کرنا چاہتے ہیں۔ (ترجیح الاخرہ) اس میں فلاح کے حصول ترقی پر موقوف فرمایا ہے بتلا دیا کہ گو مامور بہ ترقیہ ہے ترقی مامور بہ نہیں مگر ترقیہ وہی مامور بہا ہے جس پر ترقی مرتب ہو جائے اور وہ ایسا ترقیہ ہے جس میں تکمیل اعمال کا اہتمام ہو اختیار اسباب تکمیل سے غفلت اور نکاسل نہ ہو۔ حاصل یہ ہوا کہ ناقص عمل کو کافی مت سمجھو۔ بلکہ تکمیل اعمال میں کوشش کرتے رہو اور ان کو اس حد تک پہنچاؤ جس پر ترقی مرتب ہو جائے گی۔ اگرچہ ترقیہ کے وقت ثمرہ ترقی پر نظر نہ کرو بلکہ نظر عمل ہی پر رکھو لیکن عمل وہی اختیار کرو جو موثر ہو حصول ترقی میں۔

طالب جاہل اور قانع جاہل

پس ایک آیت میں طالب جاہل کی اصلاح ہے اور دوسری آیت میں قانع جاہل کی۔ طالب جاہل وہ ہے جو ثمرہ مرتب نہ ہونے سے عمل کو چھوڑ دے اور قانع جاہل وہ ہے جو ناقص عمل پر قناعت کر لے۔ اب یہاں ایک شبہ اور ہے وہ یہ کہ جب ترقی تدریجاً حاصل ہوتی ہے اور وہاں فلاح اس کی ہوگی جو ترقی حاصل کر چکا ہو۔ تو ممکن ہے کوئی شخص ترقیہ میں مشغول ہو اور تدریجاً اسے ترقی حاصل ہو رہی ہو جو درجہ کمال کو ابھی نہیں پہنچی تھی کہ یہ پہلے ہی مر گیا تو کیا اس کو فلاح نہ ہوگی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ قد افلح من ترقی میں جو حصول ترقی پر فلاح کو موقوف کیا گیا ہے یہ اس شخص کے لئے جس کو اتنا وقت ملا تھا کہ اگر وہ برابر ترقیہ میں مشغول رہتا تو ترقی حاصل ہو جاتی۔ یہ شخص اگر اپنی سستی کی وجہ سے قبل حصول ترقی مر گیا تو ناکام مرے گا۔ اور جس کو اتنا وقت ہی نہ ملا جس میں ترقی حاصل کر لیتا وہ اگر قبل حصول مقصود مر جائے تو ناکام نہیں اس لئے قد افلح من زکھا

(جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ پاک ہو گیا) کے موافق یہ تزکیہ ہی تزکی کے حکم میں ہے۔ مگر بشرط عدم انقطاع نامرادی کو مولانا بحکم فرماتے ہیں۔

گر مرادت رائد اذ شکر است بے مرادی نے مراد دلبر است

تخلیہ اور تخلیہ

حق تعالیٰ نے قد افلح من تزکی (جس نے تزکی حاصل کر لی کامیاب ہو گیا) کے بعد فرمایا ہے و ذکر اسم ربہ فصلی (اپنے رب کا نام ذکر کیا پس نماز پڑھی) اس میں تزکی کو ذکر و صلوة پر مقدم کیا گیا ہے اس سے تصوف کا ایک مسئلہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ سلوک میں دو عمل ہوتے ہیں ایک تخلیہ ایک تخلیہ اور تخلیہ کو تخلیہ و تصفیہ بھی کہتے ہیں کیونکہ تخلیہ کے معنی ہیں رذائل کو زائل کرنا اور تخلیہ کے معنی ہیں فضائل کو حاصل کرنا تو لفظ تزکی میں اس طرف اشارہ ہے کہ رذائل کو زائل کرو اور ذکر اسم ربہ فصلی (اس نے اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پس نماز پڑھی) میں اس طرف اشارہ ہے کہ فضائل کو حاصل کرو اور ہر چند کہ تحصیل فضائل بھی تزکی میں داخل ہو سکتا ہے کیونکہ تزکی کے معنی ترک رذائل ہیں اور فضائل کا ترک بھی اس میں آ گیا اور ترک التکر ایجاد ہے اس لئے تحصیل فضائل بھی تزکی میں داخل ہو گیا اور تحقیق اس کی یہ ہے کہ ترک کے دو درجے ہیں ایک ترک وجودی دوسرے ترک عدمی۔ ترک وجودی یہ ہے کہ کسی امر کو خواہ مامور بہ ہو یا منہی عنہ احتمال وجود کے وقت ترک کیا جائے مثلاً ایک عورت سامنے سے گزری اور اس نے نظر کو اس طرف سے ہٹا لیا اور بالکل نظر نہ کی تو یہاں ترک نظر ترک منہی عنہ کی مثال ہے۔ یا نماز کا وقت آیا اور اس نے نماز ترک کر دی یہ ترک صلوة ترک مامور بہ کی مثال ہے اور ترک عدمی یہ ہے کہ اسباب وجود کے نہ ہوں اور کسی کام کو ترک کیا جائے جیسے ایک وقت بہت سے افعال منہی عنہا سے آدمی بچا رہتا ہے اور احتراز کا قصد بھی نہیں ہوتا۔ پس پہلا ترک تو کبھی طاعت ہے اور کبھی معصیت اور دوسرا ترک نہ معصیت ہے نہ طاعت اس لئے تزکی سے ترک عدمی تو مراد ہو سکتا نہیں کیونکہ نخل مدح میں فرمانا دلیل ہے اس کی اطاعت ہونے کی اور ترک عدمی طاعت بھی نہیں۔ پس یقیناً ترک وجودی ہی مراد ہے یعنی احتمال وجود کے وقت رذائل کا ترک کرنا اور معصیت بھی رذائل کا فرد ہے۔ پس تزکی میں تمام معاصی کا ترک داخل ہو گیا اور معاصی میں طاعت کا ترک بھی داخل ہے تو اس طرح سے قد افلح من تزکی (با مراد ہوا وہ شخص جو پاک ہو گیا) ہی میں ترک معاصی و امتثال طاعات سب داخل ہو جاتا ہے۔ مگر چونکہ یہ اشتمال ظاہر نہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ جل شانہ نے تحصیل طاعات کو و ذکر اسم ربہ فصلی (اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا) میں ذکر فرما دیا۔ پس اب تزکی میں ترک منہیات ہی داخل رہا اور ان دونوں کے مجموعہ کو مدار فلاح ٹھہرایا گیا تو ثابت ہوا کہ فلاح کا مدار تخلیہ و تخلیہ دونوں کے مجموعہ پر ہے اور یہی صوفیہ کا قول ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ بدوں ان دونوں کے سلوک کامل نہیں ہو سکتا۔

سورة الغاشية

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاٰیٰتِ كَيْفَ خُلِقَتْ ^{دَقَقَ} ^{۱۷} وَ اِلَى السَّمٰوٰتِ كَيْفَ رُفِعَتْ ^{دَقَقَ} ^{۱۸}

وَ اِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ^{دَقَقَ} ^{۱۹} وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ^{۲۰}

ترجمہ: کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح عجیب طور پر پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کی طرف کہ وہ کیسے بلند کر دیا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ وہ کیسے گاڑھ دیئے گئے اور زمین کی طرف کہ وہ کیسے بچھا دی گئی۔

تفسیری نکات

دلائل قدرت

اس میں سب سے پہلے اونٹ کا ذکر کیا گیا کیونکہ اہل عرب کثرت سے اسی پر سوار ہوتے ہیں اور راکب جمل کو زیادہ تلبس اونٹ ہی سے ہوتا ہے پھر اہل عرب کو اونٹ سے محبت بھی بہت ہے چنانچہ اپنے ایک شاعر اپنے محبوب کے خال رخسار کی تشبیہ میں کہتا ہے کہ رخسارہ پر تل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالو کے میدان میں اونٹ کی میٹگنی پڑی ہو اس سے اونٹ کے ساتھ اس کا تعلق ظاہر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے۔

احبھا و تحبني و يحب ناقتها بعيري

میں محبوب سے محبت رکھتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے اونٹ کو اسی کی اونٹنی سے محبت ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ ہمارے دلائل قدرت کو اونٹ میں نہیں دیکھتے کہ اس کو کیسا عجیب الخلق بنا دیا ہے اور کیسا جفاکش اور صابر و بردبار کر دیا ہے۔ پھر اونٹ پر سوار ہوتے ہی آدمی اونچا ہو جاتا

ہے تو سامنے آسمان نظر آتا ہے اس لئے اس کے بعد فرماتے ہیں والی السماء کیف رفعت اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیونکہ بلند کیا گیا ہے پھر سفر شروع کرنے کے بعد دائیں بائیں پہاڑ نظر آتے ہیں تو آگے فرماتے ہیں والی الجبال کیف نصبت اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کس طرح زمین میں نصب کئے گئے ہیں پھر گا ہے بگا ہے سواری کی حالت میں زمین پر بھی نظر پڑ جاتی ہے سامنے بڑے بڑے میدان آتے ہیں جن کو مسافر طے کرتا جاتا ہے تو فرماتے ہیں والی الارض کیف سطحت اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی جو شخص کبھی اونٹ پر سوار ہوا ہو یا اس نے راکب جمل کی حالت میں تامل کیا ہو وہ اس ترتیب کی خوبی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ پہلے اونٹ کا ذکر کیا پھر آسمان کا پھر پہاڑوں کا پھر زمین کا کیونکہ رکوب کی حالت میں اکثر نظر اسی ترتیب سے واقع ہوتی ہے۔

امارد سے بد نظری کی مذمت

بقراط کی حکایت شیخ سعدی شیرازی نے لکھی ہے کہ چلا جا رہا تھا ایک شخص کو دیکھا کہ پسینہ پسینہ بے خود ہو رہا ہے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے لوگوں نے کہا کہ یہ ایک بزرگ ہے اس نے ایک حسین لڑکے کو دیکھ لیا ہے اس میں حق تعالیٰ کی قدرت کا مظاہرہ کر رہا ہے بقراط نے کہا کیا حق تعالیٰ نے صرف یہی لڑکا ہی اپنی قدرت کے اظہار کے لئے پیدا کیا ہوا ہے اور کوئی نہیں ایک دن کا بچہ بھی تو اس کا پیدا کیا ہوا ہے اس کو دیکھ کر حال متغیر نہ ہوا۔

محقق ہماں بیند اندر ابل کہ درخوب رویان چین و چگل

یعنی جو شخص حقیقت میں ہے وہ اونٹ میں بھی وہ دیکھتا ہے جو چین و چگل میں خوبصورتوں میں دیکھتا ہے بلکہ اونٹ کے دیکھنے میں تو نفع محض ہے اور امرد کو دیکھنے میں فتنہ کا احتمال بھی غالب ہے اس لئے اونٹ کے دیکھنے کا امر ہے۔ جیسا آیت مذکورہ میں گزرایہ نہیں فرمایا افلا ينظرون الى امارد كيف خلقوا (کیا وہ امردوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پیدا کئے گئے ہیں) یہ جہلا صوفیا کفار قریش سے بھی بڑھ گئے۔

سُورَةُ الْفَجْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ

رَبِّيَ أَكْرَمَنِ ۗ وَإِنَّمَا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ

رَبِّيَ أَهَانَنِ ۗ

ترجمہ: سو آدمی کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو ظاہر اکرام و انعام دیتا ہے تو وہ بطور فخر کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھادی اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے یعنی اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ (شکایتاً) کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹادی۔

تفسیری نکات

نیک و بد کی تمیز کا طریقہ

فرمایا کہ جو لوگ بلا اور مصیبت میں مبتلا ہوں ان کی نسبت یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ خدا کے نزدیک مبغوض ہیں اور ہم چونکہ بلا میں مبتلا نہیں اس لئے مرحوم ہیں اس لئے کہ کبھی نیک لوگوں پر بھی بلا نازل ہوتی ہے تاکہ پاک صاف ہو کر خدا تعالیٰ کے پاس جائیں اور بعض کو تمام حجت عذاب کے لئے دنیا میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور فرمایا کہ یہ نعمت و بلا نیک و بد کو پہچاننے کا طریقہ نہیں ہے چنانچہ اس کا علامت نہ ہونا ارشاد ہے فاما الانسان اذا ما ابتلاه ربه فاكرمه ونعمه فيقول ربي اكرم من واما اذا ما ابتلاه فقلدر عليه رزقه فيقول ربي اهانن كلا اس سے معلوم ہوا کہ تمیز کا طریقہ یہ نہیں ہے بلکہ طریقہ اس کا محض فرمانبرداری اور نافرمانی ہے۔ (اشرف القالات)

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمْبًا ۝۱۹ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝۲۰

ترجمہ: اور تم میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے تم لوگ بہت ہی محبت رکھتے ہو۔

تفسیری نکات

دو شکایات کا ذکر

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دو شکایتیں فرمائی ہیں ایک یہ کہ پر ایام حق کھا جاتے ہو دوسرے مال سے محبت رکھتے ہو یہ دونوں جدا جدا مضمون نہیں بلکہ ثانی اول کے لئے علت ہے یعنی حق تعالیٰ کو میراث کھا جانے کی وجہ بیان فرمانا بھی مقصود ہے اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ تم کو مال سے بہت محبت ہے اکل میراث کا مذموم ہونا گویا دو حیثیتوں سے بیان فرمایا کہ یہ فعل خود بھی برا ہے اور اس کا منشاء جس سے یہ پیدا ہوا ہے وہ بھی برا ہے جیسے کسی کی مذمت کرنا ہو تو کہتے ہیں کہ تم بھی نالائق ہو اور تمہارا باپ بھی نالائق تھا اس میں بلاغت زیادہ ہو جاتی ہے۔ پس جب موقع شکایت میں و تاكلون التراث فرمایا تو جس کی طبیعت میں ذرا بھی سلامتی ہو وہ خود سمجھ لے گا کہ یہ فعل برا ہے۔ نفس مذمومیت تو اسی سے سمجھ میں آگئی لیکن حق تعالیٰ نے اس پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ اس کا سبب بھی بتایا کہ و تحبون المال حبا جما۔ اور وہ سبب ایسا ہے کہ وہ خود بھی گناہ ہے تو اس سے اس کا مذموم ہونا اور زیادہ بوجہ ابلغ واضح ہو گیا۔ پس ایک حکمت تو علت بیان کرنے سے یہ تھی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مقام میں نظر صرف پر ایام مال کھا جانے ہی پر متصور نہ رہے بلکہ اصل علت پر بھی نظر ہو جاوے تاکہ اس سے اس کے علاوہ جتنی شاخیں متفرع ہوتی ہیں سب پیش نظر ہو جاویں اور حق تعالیٰ کے نزدیک سب کا مذموم ہونا واضح ہو جاوے تیسرے ایک اور حکمت اسی وقت سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو ظاہر نظر میں بھی گناہ ہیں اور اکثر لوگ ان کو ہی گناہ سمجھتے ہیں جیسے چوری، زنا، قتل، ناحق ظلم، پر ایام مال کھا جانا، شراب پینا وغیرہ۔ دوسرے وہ گناہ کہ لوگ ان کو گناہ نہیں سمجھتے اور نہ اس طرف کبھی ان کا ذہن جاتا ہے کہ یہ گناہ ہیں مثلاً مال کا لالچ ہونا خدا کے سوا کسی سے محبت ہونا اللہ کی یاد سے غافل ہونا یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کا شبہ تک بھی نہیں ہوتا چنانچہ جب کبھی اپنے گناہوں کو یاد کرتے ہیں تو ظلم، چوری، چغلی، غیبت وغیرہ تو یاد آتے ہیں مگر یہ ہرگز یاد نہیں آتا کہ ہمارے دل میں لالچ ہے ہماری تمام عمر غفلت میں گزر گئی اور تمام عمر اس کوشش میں گزر گئی کہ ہم بڑے بن کر رہیں تاکہ اونچی ہو ان کو وہی لوگ گناہ سمجھتے ہیں جو جاننے والے ہیں اور جاننے والوں سے میری مراد وہ ہیں جو علم دین کامل رکھتے ہیں نہ صرف حرف شناس یا مدعی جیسے بعض جاہل یا اکثر عورتیں جو کچھ حرف شناس ہو جاتی ہیں وہ اپنے کو عالم اور محقق سمجھنے لگتی ہیں۔

جواری اور دل کے گناہ

پس تاكلون التراث تو ہاتھ منہ کا گناہ ہے جس کے گناہ ہونے کو سب جانتے ہیں اور تحبون المال دل کا گناہ ہے جس سے یہ ظاہری گناہ متفرع ہوا۔

بلاغت کلام باری تعالیٰ

اور دیکھئے رحمت حق تعالیٰ کی کہ شکایت صرف حب مال کی نہیں فرمائی بلکہ اس کو مقید فرمایا ہے جہاں سے مطلب یہ ہے کہ نفس حب مال کی ہم شکایت نہیں کرتے بلکہ شکایت اس بات کی ہے کہ مال کی بہت زیادہ محبت رکھتے ہو ان ہی رعایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام تو آدمی کا نہیں ہے۔ آدمی اپنے کلام میں خواہ کتنی ہی رعایت کرے مگر ہر پہلو پر اس کی نظر نہیں رہتی جس ایک پہلو کو لیتا ہے اس میں حد سے بڑھ جاتا ہے مثلاً ہم لوگ غصہ میں کسی کی توہین یا کسی کا نقص یا ملامت کریں گے تو حد اعتدال سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اگر اس وقت حد پر رہنے کی کوئی تدبیر بھی کرنا چاہتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا یا ہمت نہیں ہوتی بخلاف کلام باری تعالیٰ کے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم لوگ تو مغلوب ہیں طبیعت کے اور حق تعالیٰ اس سے پاک ہیں دیکھئے ملامت فرما رہے ہیں لیکن اس میں بھی کیا رحمت ہے کہ نفس حب پر ملامت نہیں اگر نفس حب مال پر شکایت ہوتی تو مخا طبین سخت سوچ اور فکر میں پڑ جاتے اس لئے کہ ایسا کون ہے جس کو مال سے تعلق نہیں اس لئے یہ فکر ہو جاتی کہ بس جی ہم تو بالکل ہی مردود ہیں چنانچہ بعضے سالک جہل یا غلبہ حال سے یا ناواقف مشائخ کے ہاتھ میں پھنس جانے سے بھی سمجھ بیٹھے کہ غیر اللہ سے کسی درجہ کا بھی تعلق رکھنا مذموم ہے۔ بس ان کی یہ حالت ہوئی کہ بیوی کو چھوڑ دیا مال کو لٹا دیا اور تماشا ہے کہ ان کے ناواقف مشائخ اپنے مریدوں کی اس حالت پر ناز کرتے ہیں سو یہ لوگ خود ہی اس قابل ہیں کہ ان کی اصلاح کی جاوے خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اچھی کس کی تربیت ہوگی سون لیجئے ایک صحابی دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے اور شب کو قیام بہت کرتے۔ حضور ﷺ نے ان کو نصیحت فرمائی کہ تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے کمزور ہو جاؤ گے۔ آنکھ کا بھی حق ہے مہمان کا بھی حق ہے خدا تعالیٰ کا بھی حق ادا کرو اور دوسرے حقوق بھی ادا کرو۔ حضور ﷺ کی تربیت تو یہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی تربیت دیکھئے کہ دشمنوں کو خطاب ہو رہا ہے کہ مال کی محبت تم کو زیادہ کیوں ہے اور یہی مذموم ہے باقی حب مال مطلقاً مذموم نہیں۔

گناہوں کی قسمیں

آیت مبارکہ وَتَأْكُلُونَ التَّرَاثَ أَكْلًا لَمَنًّا وَتُحِبُّونَ لِلْمَالِ حُبًّا جَمًّا کی ایک حکمت اسی وقت سمجھ میں آئی وہ یہ کہ گناہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ظاہر میں بھی گناہ ہیں اور اکثر لوگ ان ہی کو گناہ سمجھتے ہیں جیسے چوری

زنا، قتل، ناحق ظلم پر ایامال کھانا جانا، شراب پینا وغیرہ۔ دوسرے وہ گناہ کہ لوگ ان کو گناہ نہیں سمجھتے اور نہ کبھی اس طرف ان کا ذہن جاتا ہے وہ یہ گناہ ہیں مثلاً مال کا لالچ ہونا خدا کے سوا کسی سے محبت ہونا اللہ کی یاد سے غافل ہونا یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کا شبہ تک بھی نہیں ہوتا۔ (آیت مبارکہ میں اسی پر تشبیہ ہے)

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۗ ارجعي إلى ربك راضيةً

مَرْضِيَّةً ۗ فَأَدْخِلِي فِي عِبَادِي ۗ وَأَدْخِلِي جَنَّتِي ۗ

ترجمہ: اے نفس مطمئنہ تو اپنے پروردگار کی طرف واپس چل اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہیں پس تو میرے خاص بندوں (کی جماعت) میں داخل ہو جا اور میری جنت میں پہنچ جاؤ۔

تفسیری نکات

دوستوں کی ملاقات میں عجیب لذت

اب ایک نکتہ بھی بیان کر دوں وہ یہ کہ آیت میں ادخلی فی عبادی کو ادخلی جنتی پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ سو اس کی توجیہ حضرت امام شافعی کے قول سے سمجھ میں آتی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ جنت میں دوستوں کی زیارت اور ملاقات ہوگی اس وقت سے مجھے جنت کا اشتیاق ہو گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دوستوں ملاقات میں جنت سے بھی زیادہ لذت ہے مگر شطرنج باز گنجدہ باز دوست نہیں بلکہ امام شافعی جیسے دوست جو شافعی ہوں یا شافع ہوں۔ اور یاء وعین دونوں جمع ہو جائیں تو نور علی نور ہے اور اگر ایسے دوست نہ ہوں بلکہ محض دنیوی دوستی ہو تو وہ آخرت میں مبدل بعداوت ہو جائے گی۔ الاخلاء یومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقین تمام دنیاوی دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے خدا سے ڈرنے والوں کے۔ وہاں وہی دوستی باقی رہے گی جس کا منشاء دین اور تقویٰ ہو۔ بہر حال دوستوں کی ملاقات میں ایسی لذت ہے کہ اس کے بغیر جنت بھی خار ہے۔ یا ایہا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرصیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی اے ان اطمینان والی جس کو ذکر اللہ میں چین تھا آ جا اپنے رب کی طرف اور لفظ ارجعی میں ایک لطیفہ ہے یعنی اس میں اشارہ ہے کہ تم تو خدا ہی کے پاس تھے یہاں تو تم آ کر اجنبیوں میں مبتلا ہو گئے تو تمہارا امرنا اصل کی طرف واپس جانا ہے اسی کو فرماتے ہیں۔

ہر کے کو در و مانداز وصل خویش باز جوید روزگار وصل خویش

ہر شخص کا قاعدہ ہے کہ جب اپنی اصل سے جدا ہوتا ہے تو اس زمانہ وصال کا جو یاں ہوتا ہے۔ حضرت عارف جامی کہتے ہیں۔

دلالتا کے دریں کاخ مجازی کنی مانند طفلان خاک بازی چر ازاں آشیان بیگانہ گشتی چود و ناں چغداں ویراں
(اے دل تو کب تک اس مجازی یعنی عارضی محل میں لڑکوں کی طرح مٹی سے کھیلتا رہے گا اور اس آشیان میں آخرت سے تو کیوں اجنبی بن گیا اور نا اہل کی طرح سے اس دنیا کے ویرانہ کو الو بن کر رہ گیا)

دنیا سے حصہ آخرت لے آنے کی عجیب مثال

اب اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ پھر تم کو کیا دنیا و آخرت کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے اور اس کو اس مثال سے سمجھو کہ تم کبھی جلال آباد سے مظفر نگر جاتے ہو تو جو چیز وہاں اچھی ہوتی ہے اس کو یہاں لانا کر برتتے ہو پھر یہاں دنیا میں آ کر آخرت سے کیوں اجنبی ہو گئے۔ چاہئے یہ کہ دنیا بھی ملے تو آخرت ہی کے واسطے لے جاؤ۔ قارون کو خطاب ہے وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الاخرة ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض الایة ترجمہ: دنیا میں سے کچھ حصہ آخرت کے لئے لے لے اور بھول مت اپنے اس حصہ کو۔ باہر جلال آباد کے تلاش معاش میں آتے ہو وہاں سے کما کر لاتے ہو اور یہاں کھاتے ہو اس طرح آخرت کے لئے یہاں سے کمائی کر کے اور بٹور بٹار کرو وہاں لے جاؤ۔ یہاں سے ذخیرہ آخرت جمع کر کے اپنے رب کے پاس لوٹ جاؤ۔ دنیا میں آخرت کی فکر سے غافل مت رہو کیونکہ جہاں سے آئے تھے وہاں لوٹ کر جانا ہے اور یہاں سے لوٹ کر وہاں جاؤ تو کس طرح جاؤ۔ جس طرح آگئے اس نفس کے خطاب میں فرماتے ہیں۔

اہل اللہ سے تعلق کی ضرورت

تم اللہ سے راضی ہو اللہ تم سے راضی دیکھئے بہت لوگ لاکھوں روپیہ حکام کی خوشنودی طلب کرنے کو خرچ کرتے ہیں۔ کیا ہر حکام کی خوشنودی تو مطلوب ہو اور حاکم حقیقی ہی کی خوشنودی مطلوب نہ ہو۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی میرے خاص بندوں میں داخل ہو جاؤ اسے نفس مطمئنہ اور داخل ہو جا میری جنت میں حق تعالیٰ نے یہاں دو ثمرے ذکر فرمائے ہیں خاص بندوں میں شامل ہونا اور جنت میں داخل ہونا۔ ذرا غور کیجئے خاص بندوں میں داخل ہونے کو پہلے فرمایا ہے پھر جنت میں داخل ہونا مذکور ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز خاص بندوں میں شامل ہونا ہے جس کی بدولت جنت ملے گی۔ اس جگہ اشارہ یہ بات بھی ظاہر فرمادی کہ اگر ہمارے خاص بندوں کے ساتھ لگے لپٹے رہو گے تو جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

سُورَةُ الْبَلَدِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۚ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ۚ وَوَالِدِ

وَمَا وُلَدٍ ۚ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۚ أَيَحْسَبُ أَنْ

لَنْ يُقَدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۚ يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُبَدًا ۚ

أَيَحْسَبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ أَحَدٌ ۚ أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۚ وَلِسَانًا

وَوَشْفَتَيْنِ ۚ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۚ

ترجمہ: میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی اور (بطور جملہ معترضہ کے تسلی کے لئے پیشین گوئی فرماتے ہیں کہ) آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے۔ اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے کیا وہ یہ خیال کرتا ہے اس پر کسی کا بس نہ چلے گا اور کہتا ہے کہ میں نے اتنا مال خرچ کر ڈالا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور ہم نے اس کو دونوں راستے (خیر و شر کے) بتلا دیئے۔

تفسیری نکات

اہل ذوق کے لئے ایک علمی نکتہ

لا اقسام میں لازاوند ہے اور لا بڑھانے میں یہ نکتہ ہو سکتا ہے کہ یہ بات قسم کھانے کی تو ہے نہیں مگر تمہارے فہم

کی رعایت سے کھائی جاتی ہے اور یہ علمی نکتہ ہے مگر اہل ذوق اس سے متاثر ہوتے ہیں ہمارا ذوق صحیح نہیں ہے ورنہ ہمارے بھی ہوش اڑ جاتے اور اہل ذوق نے ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسہم و اموالہم بان لہم الجنة کون کر بھی گردنیں جھکا دیں۔

علمی اور تاریخی توجیہ

میں اس میں گفتگو کر رہا تھا کہ نزول کی حدیث میں ظاہر بین تو لفظ کی تحقیق میں پڑ گئے اور اہل بصیرت نے اس کے مقتضاء پر عمل کیا کہ اس وقت کی قدر کی۔ اسی طرح ہم لاقسم میں لاکوزائد کہہ کر نازاں ہوں گے اور اپنے آپ کو محقق سمجھنے لگے اول تو محقق ہی کیا ہوئے اور ہوئے بھی تو الفاظ کے مگر یہاں تو دوسری چیز کی ضرورت ہے یعنی عمل کی کسی نے خوب کہا ہے۔

مغرور رخن مشوکہ توحید خدا واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(دھوکہ مت کھاؤ تو حید خدا کو ایک ماننے کا نام ہے نہ ایک کہنے کا)

واقعیت حاصل ہونی چاہیے یہ نرے الفاظ سے کام نہیں چلتا بہر حال ترکیب میں جب لازائد ہو تو لاقسم بھذا البلد کے معنی ہوئے میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی یعنی مکہ کی میں ہر لفظ کے ساتھ مختصر علوم بیان کرنا چاہتا ہوں اس میں یہ بات بیان کرنا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں رکھا گیا مگر حق تعالیٰ نے بہت جگہ غیر اللہ کی قسم کھائی ہے سوال اول تو وہ حاکم ہے اس کے افعال میں چوں و چرا کی مجال نہیں اس لئے یہ سوال ہی بیکار ہے دوسری بات یہ ہے کہ حکمت اور غرض اصلی قسم کی تاکید کلام ہے اور تاکید کے دو طریق ہیں ایک تو معظم کی قسم کھانا اور دوسرا طریق ایسی چیز کا ذکر کرنا جس میں غور کرنے سے جواب قسم کی تائید جس سے یہ کلام بمنزلہ قضا یا قیاسا تہا معہا کے ہو جاتا ہے یعنی ایک ایسی چیز کا پتہ دے دینا کہ اس میں غور کرنے سے صدق کلام معلوم ہو جائے جب یہ سمجھ لیا تو سنو کہ پہلی قسم میں لازم ہے کہ مقسم بہ غیر اللہ نہ ہو کیونکہ ایسی تعظیم بالغ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور دوسری قسم میں غیر اللہ کی قسم بھی فی نفسہ جائز ہے اور اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ مخلوق کیلئے بھی یہ قسم جائز ہوتی مگر چونکہ یہ غرض مشہور و متعارف نہیں ہے اس لئے ذہن سبقت کرے گا پہلی قسم کی طرف اس واسطے سدا للباب و صونا عن الایہام مطلقاً غیر اللہ کی قسم کو ممنوع کر دیا گیا کیونکہ اعتبار غالب احوال کا ہوتا ہے اور غالب یہی ہے کہ معظم کی قسم کھا کر کلام کی تاکید کرتے ہیں اور حق تعالیٰ نے جو بعض مخلوق کی قسم کھائی ہے اس میں قسم اول کا تو شبہ بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس سے بڑا کون ہے اس لئے لامحالہ دوسری غرض کی طرف ذہن جاوے گا اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے اللہ کا شکر ہے کہ نئی بات سمجھادی۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو یہ شبہ

جاتا رہا کہ غیر اللہ کی قسم کیوں کھائی گئی بس اب غور کرنا چاہیے کہ مقسم بہ کو مقسم علیہ سے تائید کا کس طرح علاقہ ہے سو اس جگہ مقسم علیہ لقد خلقنا الانسان فی کبد ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے یعنی ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا ہے اب مقسم بہ میں غور کیا جاوے کہ اس سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے یا نہیں سو مقسم بہ مکہ معظمہ ہے اور اس کی شان فی نفسہ و نیز باعتبار اضافت کے سخت ہے کیونکہ وہ واد غیر ذی زرع (جنگل بلا کھیتی والا) اور وہاں گرمی بھی بڑی سخت ہے بس اس سے خود مشقت کا پتہ لگتا ہے بس صاف معلوم ہو گیا کہ اس مقسم بہ کو دخل ہے مقسم علیہ کے اثبات میں بطور اثبات النظر بالنظر کے یہ تو اس کی شدت تھی فی نفسہ اور اضافی شدت یہ ہے کہ مکہ میں حضور ﷺ کا زمانہ بہت مشقت کا تھا تو اس کا ذکر مذکور ہو گیا مشقتوں کا خاص کر جبکہ حل بمعنی نازل کے ہو یعنی آپ کی اقامت مکہ کے زمانہ میں مکہ کی قسم کھائی یہ تو علمی اور تاریخی توجیہ ہے۔ اور عشاق نے اس انت حل سے کچھ اور سمجھا ہے اور قرآن مجید کی یہ حالت ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ دارد برنگ اصحاب صورت راہوار باب معنی
عشاق نے یہ سمجھا کہ اس میں حضور اکرم ﷺ کی جلالت شان کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مطلقاً مکہ کی قسم نہیں کھائی بلکہ جب آپ اس میں رونق افروز ہوں۔ عشاق کے محاورہ میں گویا آپ ﷺ کے خاک پا کی قسم کھائی اور اس میں عربیت متروک نہیں ہوئی بلکہ لغت سے متاید ہے اس لئے یہ محض نکتہ نہیں بس عشاق کا ذہن اس طرف گیا کہ آپ ﷺ کی ذات تو بہت بڑی ہے جبکہ آپ ﷺ کی ذات سے مکہ قابل قسم ہو گیا۔

شرکاء بتلانا بھی نعمت ہے

ایحسب ان لم یرہ احد تک کا حاصل یہ ہوا کہ انسان کو نعم اور تکالیف سے تنبیہ نہیں ہوا۔ آگے نعمتیں یاد دلاتے ہیں الم نجعل له عینین ولساناً وشفقتین وهدینہ النجدین کہ اس کو نعم سے بھی تنبیہ نہیں ہوا۔ اس استفہام میں نکیر شدید ہے ان نعمتوں کے بھلا دینے پر اور یہی آیت اس وقت مقصود بالبیان ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ مقصود مطول ہو۔ اور اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کیا ہم نے اس (انسان) کے واسطے دو آنکھیں نہیں بنائیں اور کیا ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے اور اس کو دو راستے نہیں بتلائے اور دو راستوں سے مراد خیر و شر ہیں سو خیر تو اس لئے بتلائی کہ اس کو اختیار کیا جاوے۔ اور شر اس واسطے بتلایا کہ اس سے پرہیز کیا جاوے۔ پس شرکاء بتلانا بھی نعمت ہے۔ وبضدھا تتبین الاشیاء (اپنی ضد سے چیزیں ظاہر ہوتی ہیں اور یہ تو بعد میں بتلاؤں گا کہ آیت میں کن کن نعمتوں کا بیان ہے پہلے یہ سمجھو کہ حق تعالیٰ نے سمع و بصر کو کہیں تو مفرد کے صیغوں سے بیان فرمایا ہے یعنی سمع و بصر اور کہیں جمع کے صیغوں سے یعنی البصار و آذان بہر حال تشبیہ کہیں

نہیں فرمایا گیا۔ جز اس جگہ کے سوا اس میں کیا نکتہ ہے واللہ اعلم بحقیقۃ الحال مگر میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ مخاطب غمی کو خاص تشبیہ کر دی کہ آنکھ دی اور ایک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دو عنایت کیں ہیں اور دوسرا نکتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اشارہ ہو ایک مسئلہ طبیعہ کی طرف۔ قرآن شریف کی یہ شان ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را بہو ارباب معنی را
(اس عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جاں کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جاں کو بوسے تازہ رکھتی ہے وہ مسئلہ دو ہیں مگر بمنزلہ ایک کے کیونکہ دونوں آنکھیں ایک وقت میں ایک ہی چیز کو دیکھ سکتی ہیں ایسے ہی شفتین کہ دونوں سے ایک ہی کلام ہو سکتا ہے یہ نہیں کہ ایک آنکھ سے ایک چیز کو دیکھ لیں اور دوسری سے دوسری کو ایک ہونٹ سے ایک بات کرتے رہیں اور دوسرے سے دوسری بات کرنے لگیں اور کوئی یہ نہ کہے کہ تم تو قرآن شریف میں حکمتہ طبیعہ کے مسائل نکالنے سے منع کیا کرتے ہو بات یہ ہے کہ قرآن شریف میں حکمت کے مسائل مقصود نہیں باقی کہیں نکل آویں تو اس سے مجھ کو انکار نہیں البتہ الضروری بتقدر الضرورة (ضروری بقدر ضرورت ہی ضروری ہوتی ہے) کالحاظ ضروری امر ہے یہ تو نکتہ تشبیہ کا ہوا۔

سُورَةُ الشَّمْسِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝۷

ترجمہ: قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اس کو پیدا کیا۔

تفسیری نکات

تفسیری نکتہ

ما بمعنی من ہے۔ اور یہاں نفس کے ساتھ قسم کو قسم بالرب پر جو مقدم کیا گیا ہے تو اس میں اشارہ ہو سکتا ہے اس امر کی طرف کہ من عرف نفسه فقد عرف ربه کہ نفس بڑی چیز ہے یہ ہماری قسم کا مقسم بہ بننے کے قابل ہے تم اس کو پہچانو اگر اس کو پہچان لو گے تو ہم بھی بھی پہچان لو گے چونکہ معرفت نفس وسیلہ ہے معرفت رب کا اس لئے نفس کی قسم کو مقدم کیا گیا جیسے مقدمہ ذکر میں مقدم ہوتا ہے گو مقصودیت میں موخر ہو اور یہ یہی نکتہ ہے کوئی علم مقصود نہیں۔

اس حدیث میں حضور ﷺ نے مسئلہ تقدیر کو بیان کرنے کے بعد صراحتاً یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس کی تصدیق کتاب اللہ کی اس آیت میں ہے پہلی حدیث میں یہ صراحت نہ تھی صرف اتنی بات تھی کہ آپ نے مسئلہ تقدیر کے بعد ایک آیت کی تلاوت کی تو وہاں اس بات پر کہ مسئلہ تقدیر کو اس آیت کے مضمون سے مناسبت حاصل ہے صرف قرینہ حالیہ تھا اور یہاں قرینہ مقالیہ موجود ہے مگر اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں بھی تقدیر کے مسئلہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ صرف یہ مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کی اور خالق نفس کی قسم کھائی ہے اور اس کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا کہ فالہمها فجورها و تقوہا۔

کہ خدا نے نفس کو پیدا کر کے اس کو خیر و شر کا الہام کیا یعنی انسان کے نفس میں نیکی اور بدی کی دو طاقتیں فطرتاً رکھ دی ہیں اس سے مسئلہ تقدیر کی تائید تصدیق کیونکر ہوئی۔

شاہ صاحب نے یہاں بھی وہی جواب دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں بھی علم اعتبار کے طور پر تشبیہ دی ہے کہ جس طرح فجور و تقویٰ القا ہوا ہے اسی طرح اعمال کو مقدر بھی کر دیا ہے۔ پس بقول شاہ صاحب کے ان دو حدیثوں میں رسول ﷺ نے علم اعتبار کا استعمال فرمایا ہے بڑے شخص کے سر رکھ کر میں یہ کہہ رہا ہوں خود اتنی بڑی بات نہیں کہتا کیونکہ یہ بڑا دعویٰ ہے اور اگر کوئی شخص شاہ صاحب کے قول کو نہ مانے تو میں اس سے کہوں گا کہ پھر وہ ان حدیثوں کی شرح کر دے۔ یقیناً ان حدیثوں اور آیتوں میں اور کوئی وجہ ربط بجز اس کے جو شاہ صاحب نے فرمایا بیان نہیں کر سکے گا۔ یہ شاہ صاحب کا علم وہی ہے میں نے ان حدیثوں کا ایسا حل کسی کے کلام میں نہیں دیکھا۔ (غایت النکاح فی آیت النکاح ملحقہ حقوق الزوجین)

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۝

ترجمہ: جس نے اپنے نفس کو زائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا

تزکیہ کی فضیلت

بہر حال آیت کا مدلول عام لیا جاوے یا خاص مگر میرا مقصود یہاں پر وہ اعمال ہیں جن سے تزکیہ بلا واسطہ ہوتا ہے بیچ میں ایک شبہ کو دفع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ شبہ عامیانا ہے لیکن آج کل مصیبت یہ ہے کہ ہر شخص مجتہد ہے اگر ترجمہ اردو قرآن و حدیث کے دیکھنے کا شوق ہے یہ شوق تو برا نہیں لیکن ہر کام کی تدبیر اور قاعدہ دنیا میں ہے کہ ہر کام کا ایک استاد ہوتا ہے بہتر یہ ہے کہ کسی استاد سے یہ ترجمہ پڑھیں اپنی رائے کو دخل نہ دیں شبہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہاں تو تزکیہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور ایک مقام پر ارشاد ہے فلا تزكوا انفسكم تو بظاہر یہاں تزکیہ سے نہیں ہے تو اس سے اردو ترجمہ دیکھنے والے کو جبکہ اس کو علم نہ ہو سخت حیرانی ہوتی ہے کہ یہ کیا بات ہے بات یہ ہے کہ تزکیہ کے دو معنی آتے ہیں۔ پاک کردن و پاک گفتن جہاں فضیلت بیان فرمائی ہے وہاں تو معنی اول مراد ہیں اور جہاں نہیں ہے وہاں معنی ثانی اس لئے کہ یہ ایک حالت ہے کوئی مضمون علمی نہیں ہے جس پر وہ حالت گزرتی ہے وہ اس کا مشاہدہ کرتا ہے پس غرض فلا تزكوا انفسكم میں دعویٰ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے چنانچہ قرینہ اس کا یہ ہے کہ اس کے بعد فرماتے ہیں هو اعلم بمن اتقى اگر پاک کردن کے معنی ہوتے تو اعلم نہ فرماتے پس دعویٰ کی ممانعت ہے واقعی اگر آدمی غور کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کی بھی پاکی حاصل کرے حق تعالیٰ کی درگاہ کے لائق کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ (الجدیب)

فلاح کا مدار تزیکیہ ہے

یہ ایک مختصری آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تزیکیہ کو مدار فلاح ٹھہرایا ہے جس سے تزیکیہ کی ضرورت ظاہر ہے۔ کیونکہ فلاح کی ضرورت سب کو ہے اور اس کا مدار تزیکیہ کو ٹھہرایا گیا ہے یہاں ایک خفیف سا شبہ ہے ممکن ہے کہ جن لوگوں نے درسیات باقاعدہ نہ پڑھی ہوں ان کو یہ شبہ ہو جائے اور ممکن ہے کہ وہ اس تقریر کے بعد بھی اپنے شبہ کو حل نہ کر سکیں کیونکہ قرآن سمجھنے کے لئے علوم عربیہ کی ضرورت ہے اور جو شخص عربیہ سے ناواقف ہے وہ قرآن کو نہیں سمجھ سکتا لیکن مجملًا اس تقریر سے ان کے شبہ کا غلط ہونا تو معلوم ہو جائے گا اور اتنا بھی کافی ہے وہ شبہ یہ ہے کہ یہاں پر تو اللہ تعالیٰ نے قد افلح من زکھا (جس نے اپنے نفس کو زائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا) فرمایا ہے جس سے تزیکیہ کا مدار فلاح اور مامور بہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے لا تنزکوا انفسکم ہوا اعلم بمن اتقى (تم اپنے نفسوں پر تزیکیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے) جس کا ترجمہ ناواقف یوں کرے گا کہ اپنے نفسوں کا تزیکیہ نہ کرو کیونکہ لا تنزکوا نہی کا صیغہ ہے مشتق تزیکیہ سے تو اب اس کو اشکال واقع ہوگا کہ ایک جگہ تو تزیکیہ کا امر ہے اور ایک جگہ اس سے نہی ہے اس کے کیا معنی جو اب اس کا یہ ہے کہ اگر اسی آیت میں لا تنزکوا انفسکم (تم اپنے نفسوں کا تزیکیہ نہ بیان کرو) کو اس کے مابعد سے ملا کر غور کیا جائے تو شبہ حل ہو جائے گا۔ قرآن میں اکثر شبہات ماسبق اور مابعد کو نہ ملانے سے پیدا ہوتے ہیں اگر شبہ وارد ہونے کے وقت آیت کے ماسبق اور مابعد میں غور کر لیا کریں تو خود قرآن ہی سے شبہ رفع ہو جایا کرے اور اسی جگہ شبہ کا جواب موجود ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہر شبہ کا جواب بھی ساتھ ذکر فرما دیا ہے جیسا کہ تلوینیات میں بھی حق تعالیٰ کی یہی عادت ہے چنانچہ جن لوگوں نے خواص ادویہ کی تحقیق کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جن نباتات میں کسی قسم کا ضرر ہے جس مقام پر وہ پیدا ہوتی ہیں اسی مقام پر ایک دوسری نباتات بھی حق تعالیٰ پیدا کر دیتے ہیں جس میں اس ضرر کی اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک گھاس زہریلی ہوتی ہے جس کو کہتے ہیں اس میں بچھو کی سی خاصیت ہے اس کے چھونے سے بچھو کا سا اثر ہوتا ہے تو جس مقام پر وہ پیدا ہوتی ہے اسی مقام پر اس کے پاس ہی اللہ تعالیٰ نے دوسری گھاس اس کی اصلاح کرنے والی پیدا کر دی ہے کہ اس کے ملنے سے وہ اثر زائل ہو جاتا ہے خیر تلوینیات میں تو ہم کو زیادہ تحقیق نہیں اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں کہ سب چیزوں کی خاصیات دریافت کی جائیں اور ہر قسم کی دوائیں جمع کی جائیں کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ عدم تحقیق کی وجہ سے کسی مضر کو استعمال کر لے گا اور اس کی مضرت کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ ہلاک ہو جائے گا تو ہلاک ہونا تو ایک دن ضروری ہے بدوں کسی مضر چیز کے استعمالات کئے بھی موت ایک دن آتی ہے۔

دینی ضرر ایک خسارہ عظیم ہے

مگر شریعت میں یہ ضروری ہے کہ جو امور مضر ہیں ان کو جانے کیونکہ ان کے نہ جاننے سے دینی ضرر ہوتا ہے جو کہ خسارہ عظیم ہے اس کا ضرر موت سے بھی ختم نہ ہوگا بلکہ مرنے کے بعد بھی باقی رہے گا اور یہ سخت ضرر ہے جس کا تحمل نہیں ہو سکتا اسی لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کانو یسنلونہ عن الخیر و کنت اسئلہ عن الشر مخافة ان یدرکنی یعنی اور صحابہؓ تو جناب رسول ﷺ سے خیر کی تحقیق کیا کرتے تھے اور میں شر کی تحقیق زیادہ کیا کرتا تھا اس خوف سے کہ کہیں شر میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اس لئے جو چیز دین کو مضر ہو اس کی تحقیق کر لینا لازم ہے۔ من جملہ اس کے وہ شبہات بھی ہیں جو قرآن و حدیث میں لوگوں کو پیش آیا کرتے ہیں ان کا رفع کرنا ضروری ہے اور اس میں حق تعالیٰ نے یہ اعانت فرمائی ہے کہ جس جگہ قرآن میں شبہ ہوتا ہے وہیں جواب بھی مذکور ہوتا ہے لہذا شبہ کے وقت سیاق و سباق میں ضرور غور کر لینا چاہئے چنانچہ لا تزکوا انفسکم (تم اپنے نفسوں کا تزکیہ بیان نہ کرو) پر جو قد افلح من زکھا سے تعارض کا شبہ ہوا تھا اس کا جواب اسی جملہ کے ساتھ ساتھ دوسرے جملہ میں مذکور ہے یعنی هو اعلم بمن اتقى (وہ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے) میں کیونکہ اس میں نہیں مذکور کی علت کا ذکر ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک اپنا زیادہ عظیم ہونا دوسرے من اتقى کے ساتھ علم کا متعلق ہونا۔

تقویٰ باطنی عمل ہے

نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ تقویٰ باطنی عمل ہے چنانچہ حدیث میں صراحتاً مذکور ہے الا ان التقویٰ ہہنا و اشار الی صدرہ یعنی حضور ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سنو تقویٰ یہاں ہے۔

تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے

نیز تقویٰ کے معنی لغت میں ڈرنے اور پرہیز کرنے کے ہیں یعنی معاصی سے بچنا اور ڈرنا تو ظاہر ہے کہ باطن کے متعلق ہے اور معاصی سے بچنے کی ڈر خود اصلاح باطنی ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اس کی پوری تصریح ہے ان فی جسد ابن ادم مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کله الا وہی القلب کہ انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے۔ سن لو وہ دل ہے

اس سب سے تقویٰ کی حقیقت واضح ہو گئی کہ تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے پس اب تقویٰ اور تزکی اور تزکی دونوں مرادف ہوئے تو آیت کا حاصل یہ ہوا ہوا علم بمن تزکی (وہ خود جانتے ہیں کہ کس نے تزکیہ نفس کیا ہے) ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

تقویٰ فعل اختیاری ہے

اب یہ سمجھو کہ اس میں تزکی کو عبد کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس سے اس کا داخل اختیار ہونا مفہوم ہوتا ہے۔ تو وہ مقدور ہوا پھر یہ کہ اعلم فرمایا۔ اقدر نہیں فرمایا (اس سے بھی) اشارہ معلوم ہوا کہ بندہ کی قدرت کی نفی مقصود نہیں ہے پس اس سے بھی تقویٰ و تزکی کا مقدور عبد ہونا مفہوم ہوا اور نہ اعلم نہ فرماتے بلکہ اقدر علی جعلکم متقین یا اس کے مناسب اور کچھ فرماتے۔ جب تقویٰ اور تزکی ایک ٹھہرے اور مقدور عبد ٹھہرے اب غور کرنا چاہیے کہ ہو اعلم بمن اتقی لا تزکوا انفسکم کی علت بن سکتی ہے یا نہیں لا تزکوا کے معنی یہ لئے جائیں کہ نفس کا تزکیہ نہ کیا کرو یعنی نفس کو رذائل سے پاک کرنے کی کوشش نہ کرو تو ہو اعلم بمن اتقی (وہ خوب جانتے ہیں کہ متقی کون ہے) اس کی علت نہیں ہو سکتی کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے نفسوں کو رذائل سے پاک نہ کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے تزکی اور تقویٰ کیا ہے اور ایک بے جوڑی بات ہے یہ تو ایسے ہوا جیسے یوں کہا جائے کہ نماز پڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے نماز پڑھی ہے۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا بندہ کے کسی فعل کو جاننا اس کے ترک کی علت نہیں ہو سکتی ورنہ پھر سب افعال کو ترک کر دینا چاہیے کیونکہ حق تعالیٰ تو بندہ کے بھی افعال کو جانتے ہیں بلکہ اس کے مناسب یہ علت ہو سکتی تھی کہ ہو اقدر علی جعلکم متقین او نحوہ (وہ اللہ زیادہ قادر ہیں تمہارے متقی بنانے پر) یعنی یوں فرماتے ہیں کہ تم نفس کو رذائل سے پاک نہ کرو کیونکہ تم کو متقی بنانے پر حق تعالیٰ زیادہ قادر ہیں تم پورے قادر نہیں ہو پھر کیوں کوشش کرتے ہو۔

اپنے نفس کو پاک کہنے کی ممانعت

جب یوں نہیں فرمایا بلکہ اعلم بمن اتقی (وہ زیادہ واقف ہیں کہ کون متقی ہے) فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں تزکیہ کے وہ معنی نہیں بلکہ کچھ اور معنی ہیں جس کے ترک کی علت ہو اعلم بمن اتقی یہ معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو یعنی پاکی کا دعویٰ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ ہی کو خوب معلوم ہے کہ کون متقی ہے (اور کون پاک ہوا ہے) یہ بات تم کو معلوم نہیں اس لئے دعوے بلا تحقیق مت کرو۔ اب کلام میں پورا جوڑ ہے اور علت و معلول میں کامل ارتباط ہے۔ اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تزکیہ باب تفعیل کا مصدر ہے اور تفعیل کی

خاصیتیں مختلف ہیں جس طرح اس کی ایک خاصیت تعدیہ ہے اسی طرح ایک خاصیت نسبت بھی ہے۔ پس قد افلح من زکھا میں تزکیہ کا استعمال خاصیت تعدیہ کے ساتھ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا اس میں نفس کو رذائل سے پاک کرنے کا امر ہے۔ لاتزکوا انفسکم میں تزکیہ کا استعمال خاصیت نسبت کے ساتھ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو اس میں نفس کو پاک کہنے کی ممانعت ہے۔ اب ان دونوں میں کچھ بھی تعارض نہیں کیونکہ جس چیز کا ایک جگہ امر ہے دوسری جگہ اسکی ممانعت نہیں بلکہ ایک نئی چیز کی ممانعت ہے۔ حکم تو نفس کے پاک کرنے کا ہے اور ممانعت پاک کہنے سے ہے کہئے اب کیا اشکال رہا۔

فہم قرآن کے لئے عربیت سے واقفیت ضروری ہے

مگر اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو عربیت سے واقف ہے اس لئے فہم قرآن کے لئے عربی جاننے کی سخت ضرورت ہے۔ بدوں زبان عربی کا کافی علم حاصل کئے قرآن کا صحیح ترجمہ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اردو میں جب عربی زبان کا ترجمہ کی آجاتا ہے تو چونکہ اردو اور عربی زبانیں مختلف ہیں دونوں کے محاورات الگ ہیں اس لئے اگر کسی کو عربی علم کافی نہیں اس کے ترجمہ میں بعض جگہ ایہام رہ جائے گا جس سے شبہات پیدا ہوں گے اور بعض جگہ ترجمہ غلط ہو جائے گا۔

لفظ ضال کے دو معنی ہیں جیسے سورۃ النجمی میں ضالا کا ترجمہ بعض نے گمراہ کر دیا جو باوجود فی نفسہ صحیح ہونے کے ایک عارض یہ ہے کہ ضال لفظ عربی ہے جس کا عربی میں مختلف استعمال ہوتا ہے یعنی اس میں بھی جس کو وضوح دلیل نہ ہوا ہو اور اس میں بھی جو بعد وضوح دلیل کے مخالفت کرے اور گمراہ ہمارے محاورہ میں صرف اس کو کہتے ہیں جو وضوح دلائل کے بعد حق کا اتباع نہ کرے اور لغت عربیہ کے اعتبار سے لفظ ضال دو معنی کو جیسا کہ مذکور ہوا عام ہے ایک معانی ضال کے وہ ہیں جو ہمارے محاورہ میں گمراہ کے ہیں اور دوسرے معنی بے خبر کے ہیں اور بے خبر اس کو کہتے ہیں جس پر دلائل ظاہر ہی نہیں ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ رسول ﷺ سے وضوح حق کے بعد اس کا اتباع نہ کرنا محال ہے لہذا اس جگہ گمراہ سے ترجمہ کرنا غلط ہے بلکہ بے خبری سے ترجمہ کرنا مناسب ہے اور گو بے علمی بھی بے خبری کا مترادف ہے مگر اس سے بھی ترجمہ کرنا مناسب نہیں کیونکہ ہمارے محاورہ میں بے علم جاہل کو کہتے ہیں جو علوم صحیحہ سے بالکل عاری ہو اور رسول اللہ ﷺ نبوت سے پہلے گو علوم نبوت سے بے خبر ہوں مگر علوم عقلیہ میں کامل تھے (چنانچہ آپ نبوت سے پہلے بھی تمام عقلاء میں ممتاز صائب الرائے صحیح العقل کامل الفہم مشہور تھے۔ اور یہ محض دعوے ہی نہیں بلکہ واقعات تاریخیہ اس پر شاہد ہیں کہ نبوت سے پہلے اہم واقعات اور امور متنازعہ میں

لوگ حضور ﷺ کی طرف بکثرت رجوع کرتے تھے) پس بے علمی سے بھی ترجمہ مناسب نہیں بلکہ بے خبری ہی سے ترجمہ کرنا مناسب ہے۔ اور کسی بات سے بے خبری کچھ عیب نہیں کیونکہ علم ذاتی علم محیط سوا خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہر شخص علم میں تعلیم الہی کا محتاج ہے (بالخصوص علوم سمعیہ نقلیہ میں جن کے ادراک کے لئے عقل محض نا کافی ہے) اور ہر شخص کو جو علم حاصل ہوتا ہے معلوم کرنے سے پہلے وہ غیر معمول ہی ہوتا ہے پس علم بعد عدم علم کوئی عیب نہیں۔

بے خبری کوئی عیب نہیں

چنانچہ حق تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں بھی فرماتے ہیں و کذالک نری ابراہیم ملکوت السموات والارض ولیکون من الموقنین (ہم نے ایسے ہی طور پر ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھلائیں تاکہ وہ عارف ہو جائیں اور تاکہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں) اس آیت سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت سموات والارض کا پہلے علم نہ تھا اللہ تعالیٰ کی تعلیم واردات سے ان کو یہ علم حاصل ہوا پس بے خبری کچھ عیب نہیں تو مناسب ترجمہ ضالاً کا اس جگہ ناواقف ہے پس اس لفظ کا صحیح ترجمہ موجود تھا۔ مگر مترجمین کی نظر اس پر نہیں پڑی اور وہ ضالاً کا ترجمہ گمراہ کر گئے حاصل یہ کہ الفاظ عربیہ کا ترجمہ ہر جگہ کافی نہیں ہوتا اور مقصود کے سمجھنے میں غلطی واقع ہو جاتی ہے اس لئے ترجمہ کے لئے خود عربی کا بھی پوری طرح جاننا اور اس زبان کے محاورات سے بھی جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے پورا واقف ہونا ضروری ہے۔

انا مومن ان شاء اللہ کہنے میں اختلاف

یہ ایسا ہے جیسا کہ امام اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ انا مومن حقا (میں یقیناً مومن ہوں) نہ کہنا چاہیے بلکہ انا مومن ان شاء اللہ (میں ان شاء اللہ مومن ہوں) کہنا چاہیے اور انہوں نے بھی حقیقت میں دعوے ہی سے منع کیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ انا مومن ان شاء اللہ کہنا چاہئے یا انا مومن حقا تو اشعری کے نزدیک انا مومن ان شاء اللہ (میں ان شاء اللہ مومن ہوں) کہنا چاہیے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انا مومن حقا (میں واقعی مومن ہوں) کہنا چاہیے مشہور قول میں تو اس اختلاف کا منشاء یہ ہے کہ جن لوگوں نے انا مومن حقا سے منع فرمایا ہے اور انا مومن ان شاء اللہ کہنے کی تعلیم دی ہے۔ انہوں نے مآل پر نظر کی ہے اور چونکہ مآل معلوم نہیں کہ ہم مآل میں مومن ہیں یا نہیں اس لئے ان شاء اللہ بڑھانے کی تاکید کی ہے اور جن لوگوں نے کہا کہ انا مومن حقا کہنا چاہیے ان کی نظر حال پر ہے اور فی الحال اپنے ایمان میں تردد و شک کرنا کفر ہے اس لئے وہ ان شاء اللہ بڑھانے سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انا مومن حقا کہنا چاہیے اے فی الحال اور یہ نزاع محض لفظی ہوگا کیونکہ مآل کے اعتبار سے ان شاء اللہ بڑھانے کو کوئی منع

نہیں کر سکتا اور حال کے اعتبار سے انا مومن حقاً سے کوئی روک نہیں سکتا۔ مگر میرے ذوق میں یہ ہے کہ جیسے انا مومن حقاً حال کے اعتبار سے ہے اسی طرح انا مومن ان شاء اللہ بھی حال ہی کے اعتبار سے ہے مآل کے اعتبار سے نہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ حال کے اعتبار سے بھی انا مومن ان شاء اللہ ہی کہنا چاہیے اور مطلب اشعری کا یہ ہے کہ انا مومن حقاً دعویٰ کے طور سے نہ کہنا چاہیے بلکہ دعویٰ سے بچنے کے لئے ان شاء اللہ کہنا چاہیے۔ اور یہ ان شاء اللہ محض برکت کے لئے ہوگا۔ تعلق و تردد کے لئے نہیں ہوگا جس سے مقصود تفویض و توکل ہے۔ کیونکہ ان شاء اللہ جیسے تعلق فی المستقبل کے لئے آتا ہے کبھی حال کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے جس سے تعلق مقصود نہیں ہوتی چنانچہ اس آیت ولا تقولن لشيء اني فاعل ذلك غدا الا ان يشاء الله (آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کروں گا مگر خدا کے چاہنے کو ملا دیا کیجئے) میں بھی حضور ﷺ کو برکت ہی کے لئے ان شاء اللہ کہنے کی تعلیم کی گئی ہے۔ یہ ان شاء اللہ تعلق کے لئے نہیں ہے کیونکہ آگے ارشاد ہے واذکر ربك اذا نيس (اپنے رب کا ذکر کرو جبکہ بھول جاؤ) کہ اگر کبھی ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو جب یاد آئے اسی وقت ان شاء اللہ کہہ لیا کرو۔ یعنی ایک بات کہہ کر دو گھنٹہ کے بعد ان شاء اللہ کا خیال آئے تو اس وقت بھی امر ہے کہ ان شاء اللہ کہہ لو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ لفظ تعلق کے لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ تعلق کے لئے کلام سابق سے موصول ہونا عقلاً ضروری ہے اور اگر ان شاء اللہ کلام سے موصول ہو تو تعلق کو مفید نہیں ہو سکتا۔ قلت وبقيد العقل خرج جوابا عما قيل ان هذا انما يصلح الزاما على الحنفية القائلين بعدم جواز الفصل بان المعلق والتعليق والقائل ان يقول ان لفظه الا ان يشاء الله فيه التعليق والاستثناء كما هو الاصل فيهما قولہ واذکر ربك اذا نيست يجيز الفصل بين المعلق والتعليق والمستثنى منه والا استثناء كما هو مذهب ابن عباس رضی اللہ عنہ پس یہاں بھی یعنی انا مومن ان شاء اللہ میں لفظ ان شاء اللہ محض تفویض کے لئے ہے نہ کہ تعلق و تردد کے لئے اور مطلب اشعری رحمۃ اللہ کا یہ ہے کہ انا مومن حق میں ایک قسم کا دعویٰ ہے۔

اپنے کو دعویٰ کے طور پر موصوفہ نہ کہو

اس لئے دعویٰ سے بچنا چاہیے اور تفویض کے لئے ان شاء اللہ کہنا چاہیے یہی مطلب صوفیہ کا ہوگا اس قول سے

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(توحید خدا کا دعویٰ مت کرو کہ توحید خدا واحد جانتا ہے نہ واحد کہنا)

یہاں بھی واحد گفتن کے معنی دعویٰ کے کردن ہیں تو صوفیہ کی مراد یہ ہے کہ اپنے کو دعویٰ کے طور پر

موجد نہ کہو اور جنہوں نے حقا کہنے کو فرمایا ہے مراد وہ کہنا ہے جو بطور اقرار بالا ایمان کے ہو اور یہی مطلب لا تزکوا کا ہے کہ دعویٰ کے طور پر اپنے کو پاک نہ کہو جس پر قرینہ ہوا علم ہے یعنی خدا ہی کو خبر ہے کہ کون پاک ہے پس دعویٰ پاکی کا نہ کرو یہ قرینہ اس پر دال ہے کہ یہاں تزکیہ کے معنی پاک کہنے کے ہیں نہ پاک کرنے کے جیسا فصلا او پر مذکور ہو چکا۔

بہر حال تزکیہ میں سالکین کو دو طرح کی غلطی واقع ہوتی ہے ایک یہ کہ تزکی کو مطلوب سمجھتا ہے اور جلدی مرتب عمل کامل نہ ہونے کی وجہ سے مغموم ہو کر عمل ہی سے معطل ہو جاتا ہے اور دوسری یہ کہ تزکی کو مطلب نہیں سمجھتا۔ اس لئے عمل ناقص پر جس پر تزکی مرتب نہیں ہوتی اکتفا کرتا ہے۔ سو یہ دونوں جماعتیں غلطی پر ہیں حق تعالیٰ نے پہلی جماعت کی غلطی کو قد افلح من زکھا (جس نے اپنے نفس کو تزکیہ کر لیا کامیاب ہو گیا) میں رفع فرمایا ہے کہ تم خود تزکیہ کو مقصود سمجھو تزکی کا انتظار نہ کرو ضرور کامیاب ہو جاؤ گے اور دوسری جماعت کی غلطی ایک دوسری آیت میں رفع فرمادی۔ قد افلح من تزکی (جس کا نفس پاک ہو گیا)

سُورَةُ اللَّيْلِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى ۖ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى ۖ

تَرْجِمَةٌ: سو جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات یعنی ملت اسلام کو سچا سمجھا۔

تفسیری نکات

علم اعتبار

فرمایا کہ علم اعتبار کو شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں اس واقعہ سے ثابت فرمایا ہے فاما من اعطى واتقى الآية (والحدیث مذکور فی المشکوٰۃ) لیکن اس سے بھی زیادہ واضح طور سے اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور نے حضرت ابی کو پکارا اور وہ نماز میں تھے اس لئے انہوں نے جواب نہیں دیا بعد نماز کے جب وہ آئے اور انہوں نے نماز میں ہونے کا عذر کیا تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی یا ایہا الذین امنوا استحبوا اللہ و لرسول اذا دعاکم لما یحییکم تو اس آیت کا تلاوت فرمانا اور اس سے استدلال بطور علم اعتبار کے ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس آیت میں دعوت اور استجابة سے خاص دعوت اور خاص استجابة مراد ہے یعنی احکام شرعیہ میں اطاعت تو اس آیت کی تلاوت سے مقصود یہ تھا کہ تم تو عالم فقیہ ہو تم کو تو سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ استجابة بھی مثل استجابة میں بڑی قباحت یہ ہے کہ اگر وہ دینوی مصالِح کسی دوسرے طریقے سے حاصل ہونے لگیں اور اسلام پر ان کے مرتب ہونے کی توقع نہ رہے تو چونکہ اسلام کو مقصود بالعرض رکھا ہے اور مصالِح دینویہ کو مقصود بالذات اس لئے نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرے طریقے کو اختیار کر لیں گے۔ تیسرے یہ مصالِح ہیں تخمینی اور تخمیدیات بہت آسانی سے مخدوش ہو سکتے ہیں تو اگر یہ کبھی مخدوش ہو

جائیں تو چونکہ حکم شرعی اس پر مبنی سمجھا گیا تھا لہذا وہ حکم بھی مخدوش ہو جائے گا پھر فرمایا کہ اگر یہ علوم مقصود ہوتے تو حضرات صحابہ ان کی تحقیق کے زیادہ مستحق تھے لیکن صحابہ نے کبھی ایسے سوال نہیں کئے۔

وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءً

وَجْهٍ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ۚ

ترجمہ: اگر بجز اپنے عالی شان پروردگار کی رضا جوئی کے (کہ اس کا مقصود یہی ہے) اس کے ذمہ کسی کا احسان نہ تھا کہ اسے دینے سے اس کا بدلہ اتارنا مقصود ہو۔ اور یہ شخص عنقریب خوش ہو جاوے گا۔

تفسیری نکات

شان صدیق اکبر

فرمایا کہ جو لوگ مصالِحِ مختَرَعہ کو بناء احکامِ شرعیہ تعبدیہ کی قرار دیتے ہیں ان کا رد اس آیت سے ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف میں فرماتے ہیں جبکہ انہوں نے حضرت بلال کو خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ وما لاحد عنده من نعمة تجزى الا ابتغاء وجه ربه الاعلى تو اس میں ان کے فعل کا سبب نفی اور استثناء کر کے منحصر فرما دیا ہے۔ ابتغاء وجه ربہ حالانکہ اس میں یہ بھی ایک مصلحت تھی کہ قومی ہمدردی ہے اور ایک کافر کے ظلم سے ان کو چھڑایا دوسرے اس مدلولہ آیت کے ہے۔ (اشرف المقالات)

سُورَةُ الضُّحَىٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالضُّحَىٰ ۝۱ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۝۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝۳

لَلْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝۴ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝۵

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝۷

وَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝۸

ترجمہ: قسم ہے دن کی روشنی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑے (آگے جواب قسم ہے) کہ آپ ﷺ کے پروردگار نے آپ کو چھوڑا نہ آپ سے دشمنی کی اور آخرت آپ کیلئے دنیا سے بدرجہا بہتر ہے (پس وہاں آپ کو اس سے زیادہ دو تیس ملیں گی) اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو آخرت میں بکثرت نعمتیں دے گا سو آپ کو خوش ہونا چاہیے کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر آپ کو ٹھکانا دیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو شریعت سے بے خبر پایا پھر آپ کو شریعت کا پتہ بتلا دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نادار پایا سو مالدار بنا دیا۔

تفسیری نکات

چنانچہ اس قسم کی بے چینی پر یہ سورۃ نازل ہوئی تھی جس کی آیتوں کی تلاوت کی گئی ہے جس کے نزول کا قصہ احادیث میں اس طرح آتا ہے کہ ایک مرتبہ چند روز تک وحی منقطع ہو گئی جس پر کفار طرح طرح کے طعن کرتے تھے بڑا طعن ان الفاظ میں تھا ترکک شیطانک (تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا) نعوذ باللہ آپ کو

انقطاع وحی سے بھی صدمہ ہوا جیسے محبوب کے خط میں دیر ہونے سے عاشق کو صدمہ ہوتا ہے اور محبوب دیر کیوں کرتا ہے اس لئے تاکہ عشق کی آگ اور بھڑکے اس کے علاوہ اور بھی حکمتیں تھیں تو ایک صدمہ تو آپ کو انقطاع وحی سے تھا ہی مزید برآں یہ کہ کفار نے طعن دینا شروع کیا کہ بس خدا نے آپ کو چھوڑ دیا بعض نالائقوں نے خدا کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے اس کا بھی آپ کو صدمہ ہوا نہ اس واسطے کہ معتقد کم ہو جاویں گے یہ فکر تو ہم جیسوں کو ہوا کرتی ہے۔ حضور ﷺ کی شان اس سے ارفع ہے دوسرے کفار معتقد ہی کہاں تھے بلکہ آپ کو کفار کی ان حرکات سے اس لئے صدمہ ہوا کہ آپ کو امت سے تعلق شفقت بہت ہی زیادہ ہے آپ کی خواہش و تمنا یہ تھی کہ میرا کوئی مخاطب جہنم میں نہ جائے سب کے سب جنتی بن جاویں پھر اس شفقت کے ساتھ کفار کی بد حالی پر جتنا رنج بھی آپ کو ہو تھوڑا ہے حق تعالیٰ نے بار بار اس رنج کو قرآن میں دور فرمایا ہے کہیں فرماتے ہیں لا تسئل عن اصحاب الجحیم (دوزخیوں کے بارہ میں آپ سے سوال نہ کیا جائے گا) کہ آپ کفار کی حرکات پر اتنا رنج کیوں کرتے ہیں آپ سے یہ سوال نہ ہوگا کہ اتنے آدمی جہنم میں کیوں گئے کہیں ارشاد ہوتا ہے لعلک باخع نفسک الا یكونوا موہبین شاید آپ اس رنج میں اپنی جان کو ہلاک ہی کر دیں گے کہ یہ کافر ایمان نہیں لاتے۔ اس آیت سے اندازہ دے دیا ہے فرماتے ہیں ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم یعنی حق تعالیٰ کسی قوم سے اپنا برتاؤ نہیں بدلتے جب تک کہ وہ لوگ خود ہی اپنا برتاؤ خدا تعالیٰ سے نہ بدل دیں پس جو لوگ مرتد ہو رہے ہیں یا نیکی و تقویٰ کے بعد معاصی میں مبتلا ہو رہے ہیں اول خود ان لوگوں نے اپنا تعلق منقطع کر لیا تب حق تعالیٰ نے بھی اپنی نعمت کو منقطع کر دیا اب یہاں ایک مقدمہ اور ماننا پڑے گا وہ یہ کہ آپ نے اپنا تعلق حق تعالیٰ سے کم نہیں کیا اور مقدمہ بالا کی بناء پر کریم کی عادت ہے کہ وہ از خود اپنے برتاؤ کو نہیں بدلا کرتا۔ اس مجموعہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ انقطاع وحی سے قطع تعلق کا دوسرا ہرگز نہ لائیں رہا یہ سوال کہ پھر وحی منقطع کیوں ہوئی تھی اس میں کیا حکمت تھی جو اس کو حق تعالیٰ نے اس سورت کے شروع ہی میں اشارۃً بیان فرما دیا ہے والضحیٰ واللیل اذا سجی۔ قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑے) میں جس میں دن اور رات کی قسم ہے اس میں انقطاع وحی کی حکمت ہی کی طرف اشارہ ہے قرآن کی اقسام میں علوم ہوتے ہیں قسم سے محض تاکید کلام ہی مقصود نہیں ہوتی بلکہ ان میں جواب قسم پر استدلال ہوا کرتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

حضور ﷺ کے یتیم و فقیر ہونے کو بیان کرنے سے اظہار نقص کا شبہ ہوتا ہے اس کا جواب اول تو یہ ہے

کہ دیکھنا چاہیے کہ وہ ظاہر کرنے والا کون ہے حق تعالیٰ ہی تو ظاہر کر رہے ہیں سو محبوب اگر محبت کے متعلق کوئی نقص کی بات بھی کہہ دے اس سے جو خوشی ہوتی ہے اس کو عاشق ہی کا دل جانتا ہے بس جس کو آپ اظہار نقص سمجھتے ہیں اس کو حضور ﷺ کے دل سے پوچھنا چاہیے کہ آپ کو اس میں کیا لطف آیا ہوگا۔ سورہ عبس میں بظاہر حضور ﷺ کو کچھ عتاب فرمایا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ ایک بار آپ کی مجلس میں رؤسائے قریش جو سرداران کفار تھے بیٹھے ہوئے تھے اور حضور ﷺ ان کے سمجھانے میں مشغول تھے کہ شاید ان کو ہدایت ہو جاوے۔ اتنے میں عبداللہ بن ام مکتوم صحابی نابینا حاضر ہوئے اور پکار کر عرض کیا یا نبی اللہ علمنی مما علمک اللہ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو سکھلائیے اس سے جس کا علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے) حضور ﷺ کو اس وقت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو کفار کی بد حالی سے کس قدر صدمہ ہوتا تھا جس کے متعلق حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ شاید آپ اپنے آپ کو ہلاک ہی کر دیں گے جب کسی طرح آپ کا صدمہ کم نہ ہوا تو پھر صاف صاف فرمادیا کہ ہم کو ہی سب کا مسلمان ہونا منظور نہیں۔ ولو شاء ربک لامن من فی الارض کلہم جمیعاً افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے سو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان ہی لے آویں) وما اکثر الناس ولو حرصت بمومنین (اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں اگرچہ آپ ان کے ایمان لانے کی حرص بھی کریں)

رسول اکرم ﷺ پر تین خصوصی احسانات کا ذکر

اور جب حضور ﷺ کے غلام نہیں چاہتے کہ ان کی وجہ سے کوئی دوزخ میں جاوے تو حضور ﷺ کب چاہ سکتے تھے اس لئے واقعہ انقطاع وحی میں ایک صدمہ تو ہو محبت حق کی وجہ سے اور دوسرا مقدمہ ہو اشفت علی الخلق کی وجہ سے سبب ثانی کا علاج بہت جگہ کر دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے لست علیہم بمصیطر (آپ ان پر مسلط نہیں ہیں) اور ولاتک فی ضیق مما یمکرون (اور جو کچھ شرارتیں کر رہے ہیں اس سے تنگ نہ ہوں جیسے یہاں اس مقام پر پہلے سبب کا ازالہ فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے آپ سے تعلق قطع نہیں کیا آپ دل کا وسوسہ نہ لائے پھر اس کی تائید کے لئے اپنے احسانات یاد دلاتے ہیں کہ ہم کو آج ہی نہیں بلکہ آپ کے ساتھ ہمیشہ سے تعلق ہے ہم ہمیشہ آپ کے اوپر عنایت و کرم کرتے رہے ہیں پھر آج آپ کو قطع تعلق کا وسوسہ کیوں پیدا ہوا اس جگہ جو احسانات حق تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں ان میں سب سے پہلے ایک جسمانی احسان کو بیان فرمایا ہے۔ السم یجدک یتیمًا فاوی کیا خدا نے آپ کو یتیم نہیں پایا تھا کہ پھر ٹھکانا دیا کہ آپ کے دادا عبدالمطلب اور چچا ابوطالب کو تربیت کے لئے مقرر فرمایا کہ انہوں نے آپ کو

تیسوں کی طرح نہیں پالا بلکہ اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز رکھ کر پالا۔ دوسرا احسان باطنی ہے ووجدک ضالا فہدی یعنی خدا تعالیٰ نے آپ کو (امور عقلیہ سمعیہ سے) ناواقف پایا پھر خبردار کر دیا یہ قیود میں نے اس لئے بڑھائیں کہ امور عقلیہ کے علم میں انبیاء علیہم السلام بدو فطرت ہی سے کامل ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام عقل میں سب لوگوں سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ محض دعویٰ ہی نہیں بلکہ ہر زمانہ کہ عقلاء کو یہ بات تسلیم کرنا پڑی ہے کہ واقعی انبیاء علیہم السلام کامل العقل ہوتے ہیں پس آپ امور عقلیہ سے کسی وقت ناواقف نہ تھے۔ البتہ وہ علوم جو عقل کے ادراک سے باہر ہیں جیسے بعض صفات واجب و احوال جنت و نار و مقادیر عبادات وغیرہ ان سے قبل از وحی آپ بے خبر تھے وحی کے بعد خبردار ہوئے اور بعض امور عقلیہ ظنیہ میں گو قبل از وحی بھی آپ کو علم حاصل تھا مگر ظنی تھا پھر وحی سے ان کی تاکید کر دی گئی تاکہ وحی سے وہ علم قطعی ہو جائے کیونکہ عقل سے بلا واسطہ جو علوم حاصل ہوتے ہیں ان میں خلط و ہم کا اندیشہ رہتا ہے اور وحی میں کسی قسم کا احتمال نہیں اس لئے امور عقلیہ وحی کے بعد زیادہ قطعی ہو جاتے ہیں۔

انقطاع وحی میں حکمت

غرض اس جگہ حق تعالیٰ نے تین احسان بیان فرمائے ہیں ایک جسمانی بیچ میں روحانی اخیر میں پھر جسمانی یعنی ووجدک عائلاً فاغنیٰ کہ آپ کو حاجت مند پایا تو تو نگر کر دیا اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر امور جسمانیہ کو امور روحانیہ سے تلبس ہو جاوے تو وہ جسمانیات بھی روحانیات ہی میں داخل ہو جاتے ہیں چنانچہ دنیا کو اگر دین کے کاموں میں صرف کیا جائے اور اس کو آخرت کے لئے معین بنایا جاوے تو اس وقت دنیا بھی دین میں داخل ہو جاتی ہے ان احسانات کی یاد دہانی سے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے آپ پر یہ احسانات کئے ہیں اور ایک مقدمہ یہاں محذوف ہے اس کو ملایا جائے وہ یہ کہ کریم اپنی عادت کو نہیں بدلا کرتا ہے اس لئے آپ بے فکر رہے کہ جو برتاؤ ہمارا آپ کے ساتھ اب تک رہا ہے ہمیشہ وہی برتاؤ رہے گا۔ اور اسی طرح آپ پر انعامات و احسانات ہوتے رہیں گے قطع تعلق کا کبھی وسوسہ نہ لائے۔ شاید تم اس مقدمہ پر یہ کہو کہ ہم تو بعض دفعہ انقطاع نعمت دیکھتے ہیں سب سے بڑھ کر نعمت ایمان ہے ہم تو اس کا انقطاع بھی دیکھ رہے ہیں چنانچہ بعض لوگ دین سے مرتد ہو جاتے ہیں جن کی نظیریں آج کل بہت نظر آ رہی ہیں اس شبہ کا جواب ایک آیت میں خود حق تعالیٰ ہی نے کا آنا کسی قدر گراں ہوا کیونکہ غرباء کے ساتھ مل کر بیٹھنے کو رؤساء قریش گوارا نہ کرتے تھے تو آپ کو خیال ہوا کہ اب ان غریبوں کے آنے سے یہ کم بخت چلے جائیں گے اور ہدایت سے محروم رہیں گے۔ آپ کی نیت بالکل بجا تھی مگر غریب مسلمانوں کے مقابلہ میں حق تعالیٰ کو رؤساء کفار کی ہدایت کا اتنا اہتمام بھی گوارا نہیں جس سے غربا کا آنا کسی وقت بار خاطر ہو اس لئے سورہ عبس میں حضور ﷺ کو نہایت لطیف عنوان سے اس بات پر

متنبہ کیا گیا ہے کہ نائینا کا حاضر مجلس ہونا حضور ﷺ پر گراں کیوں ہوا پھر اس خطاب میں آپ کو کیسا لطف آیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد جب کبھی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ حاضر مجلس ہوتے تو حضور ﷺ فرمایا کرتے مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی مرحبا اس شخص کو جس کے متعلق میرے پروردگار نے مجھ پر عتاب فرمایا۔ محبوب کے عتاب آمیز خطاب میں جو لذت ہوتی ہے اس کو عشاق ہی جانتے ہیں ایک بزرگ کے مرید حج کو جا رہے تھے چلتے ہوئے شیخ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کے حضور میں ہمارا سلام عرض کر دینا چنانچہ جب وہ حاضر روضہ اطہر ہوئے شیخ کا سلام عرض کیا وہاں سے جواب عطا ہوا کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہہ دینا جب یہ شخص واپس آیا اور شیخ کی زیارت کو گیا انہوں نے پوچھا کہو بھائی ہمارا سلام عرض کیا تھا اس نے کہا جی ہاں عرض کیا تھا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے پیر کو ہمارا بھی سلام کہہ دینا مرید نے بدعتی کا لفظ نہ کہا۔ شیخ نے فرمایا کہ ایک لفظ کیوں چرایا جو جان تھی خطاب کی کہا حضرت میں ادب کی وجہ سے وہ لفظ نہیں کہہ سکتا اور آپ کو تو معلوم ہی ہے پھر میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے فرمایا کہ سننے میں جو لطف ہے وہ جاننے میں تھوڑا ہی ہے۔ اور تم کو ادب یا بے ادبی سے کیا تعلق تم تو پیام رساں ہو تم کو وہی کہنا چاہیے جو حضور ﷺ نے فرمایا وہ تمہارا کہا ہوا نہ ہوگا بلکہ حضور ﷺ کا فرمودہ ہوگا چنانچہ مرید نے مجبور ہو کر کہا حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہہ دینا بس یہ سنتے ہی شیخ کو وجد آ گیا رقص کرتے تھے اور یوں کہتے تھے۔

بدم گفتی وخرسندم عفاک اللہ لکو گفتی
جواب تلخ می زبید لب لعل شکر خارا

غنائے قلب کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے

اسی طرح جب آپ کو مفلس پایا تو حق تعالیٰ نے غنی کر دیا تو یہ غنا بھی کامل ہی ہوگا کیونکہ حق تعالیٰ خود اس کا اہتمام فرمایا اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ حضور ﷺ کے پاس مال اتنا زیادہ کہاں تھا جس سے آپ کے غنا کو کامل کہا جاوے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اول تو حضور ﷺ کو غنائے ظاہری کی ضرورت نہ تھی اور جو اصل غنا ہے یعنی غنائے قلب وہ تو آپ کے پاس بدو فطرت سے موجود تھی اور نبوت کے بعد اس میں اس قدر ترقی ہوئی کہ کسی کو بھی آپ کے برابر غنائے قلب حاصل نہ ہوگا۔ (کیونکہ اس کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے اور ان صفات میں حضور ﷺ سے زیادہ کوئی کامل نہیں اس لئے آپ کے غناء قلب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا بلکہ ظاہری غنا سے تو اہل قلب کو اور پریشانی ہوتی ہے اور اس کے حقوق کا خیال کر کے یہ پریشانی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اسی کے ازالہ کے لئے حق تعالیٰ نے حضرت سلیمان سے فرمایا ہذا عطاءنا فامنن او امسک بغیر حساب (یہ بے شمار ہماری عطا ہے دو یا نہ دو) اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں ایک یہ کہ ہذا عطاءنا بغیر حساب یہ ہماری عطا

ہے اور بے حساب یعنی بے شمار بغیر حساب سے کثرت کا بتلانا مقصود ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ بغیر حساب معمول ہے فامنین او امسک کا یعنی یہ ہماری عطا ہے خواہ دو یا نہ دو آپ سے اس کے حقوق کے متعلق کوئی سوال اور باز پرس نہ ہوگی دو یا نہ دو جس طرح چاہو تصرف کرو کلی اختیار ہے۔ دوسری تفسیر مجھے زیادہ پسند ہے اور واقعی حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اتنی بڑی سلطنت اور اس کا ساز و سامان خارجان ہو جاتا اگر ان کی تسلی اس طرح نہ کی جاتی جب بغیر حساب فرما کر بارغم ہلکا کر دیا گیا اس کے بعد انہوں نے بے فکری سے سلطنت کی اس سے ظاہری سامان کی کثرت کا موجب پریشان ہونا ثابت ہو گیا تب ہی تو اس کا ازالہ کیا گیا اسی واسطے جب حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ چاہے نبی ملک ہونا اختیار کر لیں یا نبی عبد ہونا حضور ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کے مشورہ سے نبی عبد ہونا اختیار کیا اگر آپ بھی نبی ملک ہونا چاہتے تو آپ سے بھی یہی ارشاد ہوتا ہذا عطاؤنا فامنین او امسک بغیر حساب (یہ بے شمار ہماری عطا ہے دو یا نہ دو) اور اس سے آپ کی بھی تسلی کر دی جاتی مگر آپ نے سلطنت پر عبدیت کو ترجیح دی اور غنائے ظاہری کو اختیار نہیں فرمایا دوسرے اگر غنائے ظاہری ہی مراد لی جائے جیسا مشہور مفسرین میں یہی ہے تو گو آپ کے پاس مال جمع نہ رہتا تھا اور اسی سے شبہ عدم غناء ظاہری کا ہو سکتا ہے مگر جو مقصود ہے غنائے ظاہری سے کہ کوئی مصلحت ان کی نہ رہے وہ مقصود اس طرح حاصل تھا کہ وقتاً فوقتاً اس طرح مال آتا تھا کہ سلاطین و امراء کی طرح آپ خرچ فرماتے تھے جس میں یہ بھی حکمت تھی کہ آپ مقتداء تھے اور مقتداء کے لئے وقعت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ عرفاً تمول سے ہوتی ہے بشرطیکہ تمول پر تمول بھی مسلط ہو (یعنی سخاوت بھی ہو کہ لوگوں کو دیتا دلاتا رہے جس سے مال چلتا پھرتا رہے) چنانچہ حضور ﷺ کے ظاہری غنا کی بھی یہ حالت تھی کہ آپ نے حج و داع میں سواونٹ قربانی کئے جن میں تریسٹھ اپنے دست مبارک سے نحر کئے جس کی کیفیت حدیث میں آتی ہے کلھن یزدلفن الیک کہ ہراونٹ حضور ﷺ کی طرف اپنی گردن بڑھاتا تھا گویا ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ پہلے مجھے ذبح کیجئے سبحان اللہ کیا شان محبوبیت تھی۔

ہم آہوان حصر اسر خود نہادہ بر کف بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

(جنگل کے تمام ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ہے اس امید پر کہ کسی دن تو شکار کو آدے گا)

یہ شعر حضور ﷺ ہی کی شان میں زیادہ چسپاں ہے واقعی آپ تو ایسے ہی تھے کہ جانور اپنی گردنیں خود آگے بڑھاتے تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ کاش پہلے میں آپ کے ہاتھ سے ذبح ہو جاؤں تو اتنے اونٹوں کا ذبح ہونا بدوں ظاہری غنا کے کب ممکن ہے اسی طرح آپ کی عطاء اور سخاوت کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ نے سو سو دو سو اونٹ ایک ایک شخص کو عطا فرمائے ایک اعرابی کو بکریوں کا بھرا جنگل عنایت فرما دیا۔ بحرین سے جب مال آیا تو وہ اتنا تھا کہ مسجد میں سونے چاندی کا ڈھیر لگ گیا اور حضور ﷺ نے سب کا سب ایک دم

سے بانٹ دیا اور بعض صحابہ کو اتنا دیا جتنا وہ اٹھا سکتے تھے ایسی نظریں تو سلاطین کے یہاں بھی نہیں سنی جاتیں اس سے آپ کا غنائے ظاہری بھی ظاہر ہے کیونکہ غنائے ظاہری کی حقیقت مال کو رکھنا نہیں بلکہ مال کا خرچ کرنا ہے وہ بوجہ اکل ثابت ہو گیا اس کے بعد ووجدک ضالاً فہدیٰ اور آپ کو بے خبر پایا تو راستہ بتلا دیا) میں آپ کی کمال ہدایت کا بیان ہے۔ کہ حق تعالیٰ نے خود آپ کی تعلیم و تربیت کا اہتمام فرمایا تو ضرور ہے کہ اس کا درجہ بھی کامل ہو چنانچہ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کا علم کتنا کچھ کامل تھا۔ بھلا جس نے بچپن میں کسی استاد سے ایک حرف بھی نہ پڑھا ہو نہ ایک حرف لکھا ہو اس کے علم کی یہ حالت کہ تمام دنیا کو علم سکھلا دیا عرب کے جاہلوں کو ارسطو افلاطون سے زیادہ حکیم بنا دیا یہ کمال ہدایت نہیں تو کیا ہے۔ حضور ﷺ کے علوم کا اندازہ احادیث کے پڑھنے اور قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے چنانچہ قرآن کے مطالب کو ایسا کوئی شخص حل نہیں کر سکا جیسا کہ حضور ﷺ اس کو جانتے تھے ادھر احادیث میں حضور ﷺ نے اصلاح اخلاق و تہذیب نفس و حسن معاشرت و تمدن و قضاء و امارت و سلطنت سے جو اصول قواعد بیان فرمائے ہیں ان کو دیکھ کر آپ کے علوم کا اندازہ ہو سکتا ہے بھلا کوئی شخص بھی ایسا جامع ہو سکتا ہے جو عبادات کی بھی کامل تعلیم دے اخلاق کی بھی معاملات کی بھی معاشرت کی بھی اور تمدن و سیاست کی بھی پھر تعلیم بھی کیسی پاکیزہ جس کی نظیر ملنا محال ہے پس حق تعالیٰ نے اس مقام پر حضور ﷺ کے نقائص کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ آپ کے احوال کی تکمیل و کمال کو بیان فرمایا ہے خوب سمجھ لو اشکال کا جواب تو ہو گیا۔ (ابوالیتامی)

انقطاع وحی میں حکمت

والضحیٰ واللیل اذا سجی میں جس میں دن اور رات کی قسم ہے اس میں انقطاع وحی کی حکمت ہی کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن کی اقسام میں علوم ہوتے ہیں قسم سے محض تاکید کلام ہی مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ ان میں جواب قسم پر استدلال ہوا کرتا ہے چنانچہ اس سورۃ میں بھی جو وحی و لیل کی قسم ہے تو اس میں بھی اشارہ ہے۔ انقطاع وحی کی حکمت پر جس سے شبہ ہو گیا تھا۔ قطع تعلق اور ناراضی حق کا۔ فرماتے ہیں اے محمد ﷺ وحی مثل چاشت کے ہے اور انقطاع وحی مثل رات کے ہے اور جس طرح عالم جسمانی کے لئے لیل و نہار کا تعاقب ناگزیر ہے۔ اور بہت سی حکمتوں پر مشتمل ہے اسی طرح عالم روحانی میں بھی قبض و بسط کا تعاقب ضروری ہے کیا آپ یوں چاہتے ہیں کہ تمام عمر دن ہی رہا کرے۔ تو اس صورت میں بھلا رات کی حکمتیں کیونکر حاصل ہوں گی۔ اگر ساری عمر دن رہا کرتا تو انسان ایسا اپنے کام کا حریص ہے کہ تمام دن کام کرنا چاہتا۔ تا جرتجارت میں لگا رہتا کاشتکار زراعت میں لگا رہتا۔ ہر پیشے والا اپنے پیشے میں مشغول رہتا چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جاڑوں میں چھوٹا دن ہوتا ہے اس میں تو تمام کام کرتے ہی ہیں۔ گرمیوں میں بزا دن ہوتا ہے وہ بھی سارا کام ہی میں

صرف ہو جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جتنا بھی بڑا دن ہوتا۔ انسان اس کو اپنے کام ہی میں صرف کرتا۔ جان کو آرام نہ دیتا حق تعالیٰ نے اس کی راحت کے لئے دن کے ساتھ رات بھی لگا دی جس میں چاہے کتنا ہی روشنی کا انتظام کیا جائے مگر دن کی طرح کام نہیں ہو سکتا۔ پھر دن میں تو اگر نیند کو ٹالنا چاہو ٹال سکتے ہو مگر رات کو یہ ایسا چوکیدار ہے کہ خود بخود دفعہ آنکھوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔ کتنا ہی ٹالو نہیں ٹال سکتا۔ اسی طرح بسط میں عبادت کا شوق بہت ہوتا ہے طاعات میں خوب دل لگتا ہے۔ کام اچھی طرح ہوتا ہے۔ اگر سالک پر ہمیشہ بسط ہی رہا کرے تو یہ ہر وقت عبادت ہی میں مشغول رہنا چاہے اور اپنی جان کو آرام نہ دے۔ اور ایسا کرنے سے شوق ختم ہو جاتا۔ پھر عبادت سے معطل ہو جاتا۔ کیونکہ طبعی امر ہے۔ اگر سارا شوق ایک دم سے پورا کر لیا جاوے۔ تو پھر وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ غرض چونکہ طاعات و عبادت کا کام ساری عمر کا ہے ایک دو دن کا نہیں اور بسط میں شوق زیادہ ہوتا ہے جس سے سالک ہر وقت کام لینا چاہتا اور اس کا انجام تعطل ہوتا اس لئے حق تعالیٰ کبھی کبھی قبض طاری کر دیتے ہیں جس میں چند روز کے لئے سالک کام کی زیادتی سے رک جاتا ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ کیفیات و واردات میں کمی آ جاتی ہے کام کرنا بھی چاہتا ہے تو نہیں ہو سکتا۔ جس میں سالک یہ سمجھتا ہے کہ طاعات میں کمی آگئی مگر حقیقت میں وہ طاعات کی ترقی ہے۔ کیونکہ قبض کے بعد جو بسط آئے گا تو پھر خوب ہی کام ہوگا۔ اور اگر قبض بھی نہ ہوا کرے تو چند روز کے بعد شوق جب پورا ہو جائے گا پھر ساری عمر کام نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ انسان کی حالت یہ ہے کہ جب اس کا جوش اور شوق پورا ہو جاتا ہے پھر اس سے کام نہیں ہوتا۔ اس لئے قبض بھی ضروری ہے تاکہ سارا شوق ایک ہی دفعہ ختم ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قبض کا ورود دراصل بسط کے لئے ہے۔ اس لئے قبض سے پریشان نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کے بعد جو بسط آئے گا اس کا خیال کر کے دل کو تسلی دینا چاہیے۔ اس کو مولانا فرماتے ہیں۔

چوں قبض آمد تو دروے بسط میں تازہ باش و چیں میفکن بر جبین
چونکہ قبضے آیت اے راہ رو آں صلاح تست آپس دل مشو
یہ حکمت تھی انقطاع وحی میں جس کی طرف والضحی والیل اذا سجی میں قسم کے ضمن میں اشارہ
ووجدک ضالا فہدی

لفظ ضلالت کا مفہوم

اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت حیران ہوا پایا۔ سو اس نے آپ کو راہ سلوک دکھلانی۔ مفسرین ضلالت کی تفسیر میں بہت حیران ہوئے ہیں کسی نے کچھ کہا ہے کسی نے کچھ لیکن جو بات میرے دل کو لگتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ضلالت بھی حیرانی اور بھٹک ہے جو سالک کو شوق کار سے پہلے پیش آتی ہے اور فہدی میں سلوک کا بتا مراد ہے اور الم

نشرح لك صدرک کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا۔ میں وصول مقصود ہے یہی ہے وہ بھٹک کہ جس کی وجہ سے حضور نے کئی مرتبہ خود کشی کا ارادہ فرمایا۔ اسی قسم کی بھٹک سالک کو پیش آتی ہے۔ تو اگر کوئی مرشد کامل موجود ہو تو وہ تسلی کرتا ہے اور کہتا ہے۔

کوئے تو میدی مرو کامید ہاست سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست
 نا امیدی کی راہ مت چلو کیونکہ خدا کے فضل سے بہت سی امیدیں ہیں ظلمت یعنی مدعیان مزدور کی طرف
 مت جاؤ خورشید یعنی منور باطن لوگ موجود ہیں۔ اور یہ بھٹک ابتدا میں ہوتی ہے۔

لفظ ضلالت کا استعمال

چنانچہ وطن میں ایک شخص نے میرے سامنے ایک اشکال پیش کیا۔ اس طرح سے کہ پہلے مجھ سے پوچھا
 ووجدک ضالا فہدی کا ترجمہ کر دو۔ پھر اشکال کروں گا۔ میں سمجھ گیا کہ کیا اشکال ان کو پیش آیا ہے۔ منشاء
 اشکال کا یہ تھا کہ قرآن مجید کے بعض تراجم میں ضال کے معنی گمراہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ پس شبہ یہ تھا کہ اس
 میں حضور کو گمراہ کہا گیا ہے میں نے کہا کہ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ پایا آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا۔ اب وہ
 میرا منہ تکتے لگا میں نے کہا میاں بتلاؤ کیا اشکال تھا؟ کہنے لگا اب تو کچھ بھی نہیں۔

اس جگہ راز یہ ہے کہ ضلالت کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے ایک مذوم میں چنانچہ ولا الضالین میں جو ضال
 کہا گیا ہے وہاں تو مذوم میں مستعمل ہے۔ یعنی جو بعد وضوح حق بھی اتباع حق نہ کرے اور ایک غیر مذوم
 ہے۔ یہ کہ اب تک وضوح حق نہیں ہوا۔ اس کے معنی ناواقفی کے ہیں جو نقص نہیں۔ کیوں کہ حضور پر ایک زمانہ
 ایسا بھی گزرا ہے جس میں آپ پر حقائق واضح نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ما کنت تدری
 ما الكتاب ولا الایمان یعنی نزول وحی سے پہلے آپ ان علوم کو کچھ بھی نہیں جانتے تھے ووجدک
 ضالا فہدی میں یہی درجہ مراد ہے کہ پہلے آپ پر وضوح حقائق نہیں ہوا تھا۔ اب ہم نے وحی نازل کر کے
 حقائق کو واضح کر دیا اور ولا الضالین میں وہ درجہ مراد ہے کہ وضوح حق ہو چکا تھا مگر بعد وضوح حق بھی کجی
 اختیار کی تو جس طرح ضلالت کے دو معنی ہیں اسی طرح لفظ گمراہ بھی فارسی میں دونوں معنوں کو شامل ہے۔ اسی
 لحاظ سے بعض مترجموں نے ضال کا ترجمہ گمراہ کیا ہے مگر اب ہمارے محاورہ میں گمراہ کا لفظ زیادہ تر معنی ثانی میں
 مستعمل ہوتا ہے اس لئے اب ضرورت ہے ترجمہ بدلنے کی۔ کہ ایسے الفاظ سے ترجمہ نہ کیا جاوے۔ جس سے
 عوام دھوکہ میں پڑیں۔ اسی طرح لا تکونن من الجاهلین کے معنی یہ ہیں۔ کہ آپ نادانوں کی سی باتیں نہ
 کیجئے اس سے کچھ بھی ابہام نہیں ہوتا بلکہ پیار کا لفظ ہے۔ دیکھو اگر تم کسی کو کہو کہ او مرغ کہ بچے تو وہ بھڑک اٹھتا

ہے، غضب ناک ہوتا ہے گویا آگ لگا دی اور اگر کہو اوچوزے تو نہس دیتا ہے اور یہ لفظ کس قدر پیارا معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کو گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ مجھ پر عاشق نہ ہو گیا ہو تو دیکھئے لغت کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ ترجمہ ایسا کیا جائے جس سے سامعین کو وحشت نہ ہو۔ (آداب تبلیغ)

سورة الضحیٰ کا لفظی ترجمہ

ارشاد فرمایا کہ ایک صاحب نے مجھ سے درخواست کی کہ وہ ووجدک ضالا فہدی کا لفظی ترجمہ کر دو۔ پھر کچھ سوال کروں گا۔ وہ سمجھے تھے کہ ضال کا ترجمہ گمراہ کریں گے اور میں اعتراض کروں گا۔ میں نے ترجمہ یہ کیا۔ پایا آپ کو آپ کے رب نے ناواقف پس واقف بنا دیا۔ اس ترجمے سے ان کے سب اعتراض پادر ہوا ہو گئے اور حقیقت میں لفظ ضال محاورہ عرب میں عام ہے جو بعد الہدایت اور بے خبری قبل الہدایت کو اور اسی طرح لفظ گمراہ فارسی محاورہ میں عام ہے۔ مگر اردو میں اکثر استعمال اس کا معنی اول میں ہے اس لئے ہماری زبان کے اعتبار سے ترجمہ گمراہ منشاء اشکال ہوتا ہے۔ (الضحیٰ آیت نمبر ۷)

سُورَةُ الْاِنْشِرَاحِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۱

ترجمہ: سو بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہونے والی ہے

تفسیری نکات

مع العسر يسرا کی تفسیر

مکہ میں آپ ﷺ کو سخت ایذا میں پہنچتی تھیں جنکے متعلق اس آیت میں حق تعالیٰ نے آپ کو تسلی فرمائی ہے فرماتے ہیں ان مع العسر يسرا اس میں الف لام عہد کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ایذا میں اس وقت آپ کو دی جا رہی ہیں اور جو دشواری اس وقت موجود ہے اس کے بعد آسانی ہونے والی ہے۔

یہ تفسیر حق تعالیٰ نے میرے قلب پر القاء فرمائی ہے۔ اس سے بہت سے اشکالات رفع ہو گئے اگر لام عہد کے لئے نہ مانا جائے تو ایک اشکال تو یہ ہوتا ہے کہ ہم بہت سی مشکلات کو آسان ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے خیر مسلمانوں کے مصائب کے متعلق تو یہ جواب بھی دے سکتے ہیں کہ آخرت میں يسر ہو جائے گا۔ لیکن اگر العسر کو عام رکھا جائے تو اس میں کفار کے مصائب بھی داخل ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ان کے مصائب قیامت میں بھی حل نہ ہوں گے۔ اب لام کو عہد کے لئے ماننے سے کوئی اشکال نہ رہا۔

لیکن اس پر یہ سوال باقی رہے گا کہ پھر بزرگوں نے اس کو عام طور پر ہر جگہ کیوں پیش کیا ہے۔

جیسا کہ حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی پریشانی عرض کی تو آپ نے فرمایا لسن يغلب عسر يسرين اور ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اسی آیت کی طرف ہے کہ ایک عسر دو يسر پر غالب نہیں آسکتا بوستان کے ان اشعار میں۔

کے مشکلے برد پیش علیؑ..... الخ

یہی حکایت مراد ہے بعض نے اس حکایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے جواب میں فرمایا تھا۔

اذا ضاقت بک البوی ففکر فی الم نشرح فعسر بین یسرین اذا فکرتہ فافرح

اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یوں نہیں بلکہ اس طرح ہونا چاہیے۔ فبعد العسر یسر ان اذا فکرتہ فافرح آپ نے قبول فرمایا یہ دونوں شعر اس میں تو مشترک ہیں کہ عسر ایک ہے اور یسر دو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اصولی قاعدہ ہے کہ معرفہ کا اعادہ اگر تعریف کے ساتھ ہو وہ عین اول ہوتا ہے اور نکرہ کا اعادہ اگر تکمیل کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ غیر اول ہوتا ہے تو آیت میں عسر تو ایک ہو اور یسر دو ہوئے اس میں تو دونوں شعر مشترک ہیں اور اس میں مختلف ہیں کہ یہ یسر عسر واحد کے بعد ہیں یا اس کے طرفین میں ہیں۔ مگر اشکال مذکور دونوں صورتوں میں ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ قول اول تو بطریق اسناد حضرت علیؑ سے ثابت نہیں اور ثابت بھی ہو تو یہ علم اعتبار کے طور پر ارشاد فرمایا ہوگا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے معاملات کبھی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ایک عسر کے ساتھ یا بعد دو یسر عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کے ساتھ یہ معاملہ نص سے ثابت ہے اور دوسروں سے نفی نہیں تو امید رکھو کہ حق تعالیٰ تم سے بھی یہی معاملہ فرمائیں گے۔ وانا عند ظن عبدی بی کو ملا کر یہ مضمون زیادہ قوی ہو گیا کہ اس امید سے ان شاء اللہ تمہارے ساتھ ضرور ایسا ہی معاملہ ہوگا۔ تو اس سے تسلی حاصل کرو یہ حاصل ہوگا حضرت علیؑ کے قول کا۔ تو وہ میری تفسیر کے منافی نہیں۔

بہر حال اس آیت میں حضور کو تسلی ہے نیز میرے ذوق میں ظاہر یہ ہے کہ اس میں ان مع العسر یسرا کا تکرار محض تاکید کیلئے ہے اور تاکید میں نکتہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں مختلف قسم کی تکلیفیں تھیں تو ایک مرتبہ ان مع العسر یسرا فرمانے سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید کسی خاص نوع عسر کے زوال کی خبر دی گئی ہے اس کے بعد یہ فکر ہوتا کہ نامعلوم کونسی عسر کے زوال کی خبر دی گئی ہے تکرار جملہ سے یہ شبہ رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ ہر قسم کے عسر کے لئے آسانی کا وعدہ ہے اور یہ استغراق عہد کے منافی نہیں مراد افراد معبودہ کا استغراق و عموم ہے اور لفظ مع میں نکتہ یہ ہے کہ گو مراد معنی بعد ہے مگر لفظ بعد سے یہ وہم ہوتا ہے کہ نہ معلوم کتنی مدت کے بعد یسر ہوگا اس لئے لفظ مع اختیار فرمایا کہ کچھ زیادہ دیر نہیں۔ ایسی بعدیت ہے کہ گویا معیت ہی ہے یونس علیہ السلام کی وہ پستی اور نزول عین ترقی تھی تو ضد کے جالب ضد ہونے پر کیا شبہ کیا جائے بلکہ معاملات باطن میں تو ضد عین ضد بھی ہو جاتی ہے مگر باعتبارات مختلفہ اعتبارات کاملانا ضروری ہے۔ ولولا الاعتبار لبطلت الحکمة یہی وہ مضمون ہے جس کی طرف آیت ان مع العسر یسرا میں میرا ذہن منتقل ہوا کہ کبھی ضد بھی جالب ضد ہو جاتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سختی و دشواری کے ساتھ آسانی ہے تو اس میں لفظ مع کو سمیت پر دلالت نہیں کرتا محض اقتران پر دلالت ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقتران محض اتفاقی نہیں بلکہ عسر کو یسر

میں دخل ہے کیونکہ عسر سے نفس پامال ہوتا ہے اور عارف کو اس وقت اپنا عجز و فنا مشاہد ہوتا ہے نیز صبر جمیل و رضا بالقضا حاصل ہوتا ہے یہ سب یسر و فرح کا سبب بن جاتے ہیں اس کے ساتھ جب وہ حدیث ملالی جائے کہ انبیاء پر تکالیف و شدائد اس لئے زیادہ آتے ہیں تاکہ ان کے درجات بلند ہوں پھر تو عسر کے سبب یسر ہونے میں کوئی بھی اشکال نہ رہے گا اس کے ساتھ اتنا اور سمجھ لیجئے کہ عسر یسر باطنی کا سبب تو ہوتا ہی ہے کیونکہ درجات بڑھتے ہیں مگر اکثر یسر ظاہری کا بھی سبب ہو جاتا ہے۔ آخرت متقین کے واسطے ہے اور ہم اپنے رسولوں کی اور مومنین کی مدد ضرور کریں گے اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے ایمان والوں سے اور جنہوں نے اچھے عمل کئے کہ ان کو ضرور زمین میں خلیفہ بناؤں گا اور بے شک زمین کے میرے بندے جانشین ہوں گے۔

عموماً انبیاء علیہم السلام اور ان کے تبعین کے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے کہ اول ان پر عسر ہوا پھر انجام کار ہر طرح یسر حاصل ہوا کہ ظاہر میں بھی وہ اپنے اعداء پر غالب ہوئے پس یسر باطنی کے اعتبار سے تو مع العسر یسر میں مع اپنے حقیقی معنوں میں ہے کہ عسر کے ساتھ ساتھ یسر ہے کیونکہ انبیاء کی ترقی درجات عین عسر کی حالت میں ہوتی رہتی ہے۔

یسر ظاہری کے اعتبار سے بمعنی بعد سے تعبیر فرمایا جو تفسیر لیجئے گا ویسے ہی مع کے معنی لے لیجئے بہر حال اولاً یہ مسئلہ خود بخود میرے دل میں آیا تھا کہ ضد سبب ضد بھی ہو جاتی ہے پھر اس آیت میں بھی اس کی طرف ذہن چلا گیا جس کی تقریر ابھی کر چکا ہوں۔ الحمد للہ مضمون کلی بھی بیان ہو گیا اور آیت سے اس کا تعلق بھی بیان ہو گیا۔

سُورَةُ الْعَلَقِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۱

ترجمہ: جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔

کسی نے منی میں کیڑوں کا ثبوت قرآن سے دیا

ایک صاحب نے منی میں کیڑے ہونے کا ثبوت قرآن کریم سے دیا۔ سورۃ اقرآن میں لفظ من علق جو تک کو کہتے ہیں اور کیڑا ایک ہی چیز ہے ہمارے قرآن میں وہ چیزیں موجود ہیں جو اب تیرہ سو برس کے بعد لوگوں کو معلوم ہوئیں۔ دین میں ایسی جرات ہوئی ہے لوگوں کو کہ ہر شخص دخل دینے کو تیار ہے لغت تک کے علم کی ضرورت نہیں رہی۔ ہر کیڑا تو جو تک نہیں اور منی میں جو تک نہیں اور مجاز کی کوئی دلیل نہیں پھر القرآن یفسر بعضہ بعضا اور دوسری آیات میں فرمایا ہے من نطفة ثم من علقہ ثم من مضغۃ جس سے صاف واضح ہوا کہ علق ایسی کوئی چیز ہے جو نطفہ و مضغہ کے درمیان میں ہے تو وہ خون بستہ ہے اور وہ کیڑا تو نطفہ کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ نطفہ کے بعد اور مضغہ کے قبل پس علق کے معنی لغت عرب میں خون بستہ کے ہیں۔ کیا قرآن سے عقیدت اور محبت ہے کہ اس میں وہ چیزیں داخل کی جاتی ہیں جن کو اس کی زبان بھی شامل نہیں اور اس خرافات کو حمایت دین کہا جاتا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۲۰ ص ۱۸۵، ۱۸۶)

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۱۹ السجدة

تَسْبِيحًا: اور (بدستور) نماز پڑھتے رہیے اور (خدا کا) قرب حاصل کرتے رہیے۔

تفسیری نکات

نماز کا اصلی مقصود

واسجدواقترب اور نماز پڑھتے رہئے اور خدا کا قرب حاصل کرتے رہئے۔ سو نماز کا فائدہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں واسجدواقترب یعنی سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ۔ پس نماز کا اصلی مقصود قرب ہے مولانا فرماتے ہیں۔

قرب تر پستی بہ بالا رفتن است بلکہ قرب از قید ہستی رستن است یعنی قرب اس کا نام نہیں ہے کہ نیچے سے اوپر کو چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ قید ہستی سے چھوٹ جاؤ اس لئے کہ اوپر جانا قرب جب ہوتا کہ خدا تعالیٰ کا مکان اوپر ہوتا۔ خدا تعالیٰ مکان سے پاک ہے۔ پس اس کا قرب یہی ہے کہ اپنی ہستی کو خاک میں ملا دو اسی کو وصل کہتے ہیں۔ بعض لوگ وصل کے خدا جانے کیا کیا معنی سمجھتے ہیں وصل کے معنی اہل فن سے پوچھئے شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

تعلق حجاب ست و بے حاصلی چو پیوند ہا بکسلی واصلی

یعنی غیر کے ساتھ علاقے جب قطع کر دو گے واصل ہو جاؤ گے۔ یہی تعلق حجاب ہے پس سجدہ کی غرض اپنی اس ہستی و تعلق کو مٹانا اور ہستی کا مٹانا یہ نہیں ہے کہ سکھیا کھا کر مر رہو۔ مطلب یہ ہے کہ دعویٰ اور انسانیت دماغ میں سے نکالو یہ سجدہ اسی کا سامان ہے اس لئے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور پھر تمام اعضاء انسان کے اندر اشرف چہرہ ہے اسی واسطے چہرہ پر مارنا حرام ہے۔

حکم ہے کہ مجرم کے بھی چہرہ پر مت ماور قتل کرنا جائز اور چہرہ پر مارنا جائز۔ اس لئے کہ چہرہ معظم ہے تو ایسے شریف عضو کو حکم ہے کہ ارذل الاشیاء کے سات مصلق کر دو یعنی زمین کے ساتھ جو بہت سے وجوہ سے اور نیز باعتبار چیز کے پس ترین مخلوق ہے تو یہ کا ہے کی تعلیم ہے اسی کی تعلیم ہے کہ اپنے کو مٹا دو اور ہستی کو کھو دو کہ تمہاری ہستی تمہارا حجاب بن رہی ہے حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

میاں عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میاں بر نیز
پس نماز کی یہ حکمت ہے۔ مگر جرمنی صاحب نے چونکہ ورزش اس کی حکمت بیان کی ہے تو ہمارے بھائی
اس تحقیق پر غش ہیں۔

یاد رکھو! شارع علیہ السلام نے یہ حکمت نماز کی کہیں بیان نہیں کی اور جو چیز شریعت میں نہیں ہے وہ سب
ہیچ ہے گو اس جرمنی کی زبان سے اتنا نکلنا بھی غنیمت ہے لیکن اے بھائیو! تم کو کیا ہو گیا ہے واسجد
واقتراب کے ہوتے ہوئے ایک جرمنی کافر کی تحقیقات کو پسند ہی نہیں بلکہ اس پر ناز کرتے ہو کیونکہ خواہ مخواہ
گداگری کرتے ہو؟ تمہارے یہاں سب کچھ ہے آپ لوگوں کی وہ مثال ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

یک سد پر نان ترا فرق سر
تو ہی جوئی لب ناں در بدر
تا بز انوائے میاں قعر آب
وز عطش و ز جوع کشتستی خراب

اے صاحبو! آپ کے یہاں ساری دولتیں موجود ہیں کیوں فقیروں سے مانگتے ہو کیوں جرمنیوں کا کاسہ لیس
کرتے ہو۔

سُورَةُ الْقَدْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ﴿۱﴾

ترجمہ: شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے

تفسیری نکات

شب قدر کا ثواب

اور یہی خیال میرا لیلۃ القدر کے متعلق ہے کہ وہاں جو الف شہر فرمایا وہ الف تحدید کے لئے نہیں بلکہ تکثیر کثیر کے لئے ہے گو وہ فی الواقع خدا کے نزدیک ضرور محدود ہوگا کیونکہ کل شیء عندہ بمقدار منصوص ہے اور جب خدا کے نزدیک محدود ہے تو واقع میں بھی محدود ہی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہے (بلکہ یوں کہئے کہ واقع خدا تعالیٰ کے علم کے مطابق ہے) پس واقع میں تو ثواب لیلۃ القدر محدود ہے مگر یہاں تحدید مذکور نہیں اور اگر غیر محدود و غیر متناہی بمعنی لا سقف عند حد کہو تو یہ فی نفسہ ممکن ہے مگر لیلۃ القدر کے ثواب کا بایں معنی غیر متناہی ہونا محتاج دلیل ہے اور اس پر دلیل قائم ہونے کی ضرورت ہے جب دلیل نہیں تو اس کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا پس ظاہر بھی ہے کہ وہ واقع میں محدود بمعنی موقوف عند حد ہے مگر وہ حد الف نہیں اب یہ سوال رہا کہ جب الف کی تحدید نہیں تو الف شہر کیوں فرمایا اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ لغت عرب میں عدد کے لئے الف سے زیادہ کوئی لغت موضوع نہیں جیسے ہمارے یہاں مہاسنکہ سے آگے کوئی لفظ نہیں اس سے آگے کوئی شمار کرے تو ایک مہاسنکہ دو مہاسنکہ سو مہاسنکہ کہے گا کوئی اور لغت نہیں بیان کر سکتا اسی طرح اہل عرب الف کے آگے جس عدد کو بیان کریں گے لفظ الف ہی کے ذریعہ سے بیان کریں گے جیسے الف الف ماتہ الف وغیرہ جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ الفاظ عدد کا منتہی عرب میں الف ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جو عدد

تمہارے نزدیک اعداد کی غایت اور منتہی ہے لیلۃ القدر اس سے بھی بڑھ کر ہے پھر لفظ خیر اسم تفضیل ہے معنی یہ ہوئے کہ بہت بڑھ کر سواب تو اگر الف تحدید کے لئے بھی تب بھی خیر عدم تحدید پر دال ہے خیر یہ تضاعف الی غیر المعدود تو قانونی طور پر نہیں بلکہ بطریق فضل ہے مگر دس گونہ ملنا تو قانون ہے جو کہ واقعہ صلوٰۃ میں شروع ہوا۔

عبادات شب قدر کا ثواب لامحدود ہے

ارشاد فرمایا کہ لیلۃ القدر خیر من الف شہر میں مراد الف کا عدد معین نہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ لیلۃ القدر افضل اور بہتر ہے جمیع ازمہ سے گوان ازمہ کی مقدار کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو یہ معنی اس لئے مراد لیا گیا ہے کہ عرب کے لوگوں میں حساب کی کمی کی وجہ سے الف سے زائد مقدار کے لئے کوئی لغت مفرد موضوع نہیں پس حاصل یہ ہے کہ زائد سے زائد مدت جو تم تصور کر سکتے ہو لیلۃ القدر اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ اب یہ شبہ کہ بجائے شہر سال کیوں نہیں فرمایا۔ اس کا یہ جواب ہے کہ کفار عرب کے ہاں چونکہ سال نسبی کی وجہ سے کم و بیش ہوتا رہتا تھا۔ منضبط نہ تھا۔ اور شہر کا اہتمام و انضباط وہ کرتے تھے اس لئے شہر کو اختیار فرمایا۔ باقی سال ان کے ہاں ٹھیک نہ تھا۔ کبھی تیرہ مہینے کا بنا دیا۔ کبھی گیارہ کا کبھی پورا کبھی کسی مہینہ کو سال میں آگے کر دیا کبھی پیچھے۔ آنحضرت ﷺ کی ۹ ہجری میں حج نہ کرنے کی ایک وجہ علاوہ شغل ہدایت و فود کے یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اس سال گواصلی حساب سے وہ مہینہ ذی الحج کا تھا مگر ان کفار کے حساب سے کچھ آگے پیچھے تھا۔ لہذا حضور نے بوجہ رفع تہمت اس سال حج نہیں کیا۔ شاید کفار یہ سمجھیں کہ یہ لوگ ملت ابراہیمی کے خلاف غیر موسم حج میں حج کرتے ہیں اس کی ویسی ہی مثال سمجھنی چاہیے جیسا کہ آنحضرت نے بناء قریش کو باس وجہ رہنے دیا کہ یہ لوگ یہ نہ سمجھ جائیں کہ کعبہ کو گرا دیا۔

ارشاد فرمایا کہ لیلۃ القدر خیر من الف شہر میں مراد الف کا عدد معین نہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ لیلۃ القدر افضل اور بہتر ہے جمیع ازمہ سے گوان ازمہ کی مقدار کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو یہ معنی اس لئے مراد لیا گیا ہے کہ عرب کے لوگوں میں حساب کی کمی کی وجہ سے الف سے زائد مقدار کے لئے کوئی لغت مفرد موضوع نہیں پس حاصل یہ ہے کہ زائد سے زائد مدت جو تم تصور کر سکتے ہو لیلۃ القدر اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے اب یہ شبہ کہ بجائے شہر کے سال کیوں نہیں فرمایا۔ اس کا یہ جواب ہے کہ کفار عرب کے ہاں چونکہ سال نسبی کی وجہ سے کم و بیش ہوتا رہتا تھا۔ منضبط نہ تھا اور شہر کا اہتمام اور انضباط وہ کرتے تھے اس لئے شہر کو اختیار فرمایا باقی سال کا اہتمام ان کے ہاں کچھ ٹھیک نہ تھا کبھی تیرہ مہینے کا بنا دیا کبھی گیارہ مہینے کا کبھی کسی مہینہ کو سال میں آگے کر دیا کبھی پیچھے۔ (مکالات حکمت ص ۱۰۹)

سُورَةُ الْبَيِّنَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ

جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۖ

ترجمہ: بے شک جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر ہوئے وہ آتش دوزخ میں جائیں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے یہ لوگ بدترین خلأق ہیں۔

تفسیری نکات

کفار اور مشرکین کو خلود فی النار کا ثبوت

ان الله لا يغفر ان يشرك به (سورة نساء ۴۸)

مگر شاید کوئی اس پر یہ شبہ کرے کہ یہاں تو صرف شرک کا ذکر ہے کفر کا ذکر نہیں اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو مشرک نہیں بلکہ موحد ہیں۔ مگر اسلام سے ابا کرتے ہیں ان کی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکور ہے؟ تو سنے دوسری جگہ مذکور ہے ان الذین کفرو امن اهل الکتاب والمشرکین فی نار جہنم خلدین فیہا اولئک ہم شر البریہ (البینہ ۶) اس میں کافر کو اہل کتاب و مشرکین کا مقسم قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے لئے خلود فی جہنم مذکور ہے جس سے کافر کی مغفرت نہ ہونا بھی معلوم ہوگئی اور یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہاں تو صرف خلود کا ذکر ہے۔ جس کے معنی مکث طویل کے ہیں اور اس کے لئے دوام لازم نہیں۔ جواب یہ ہے کہ دوام خلود کے منافی بھی نہیں پس اگر کوئی قرینہ قائم ہو تو خلود سے دوام کا قصد ہو سکتا ہے اور یہاں خلود بمعنی دوام ہونے پر قرینہ قائم ہے۔ وہ یہ کہ مشرکین کے لئے خلود بمعنی دوام ہی ہوگا اور یہاں

کافر و مشرک دونوں کا حکم مذکور ہے جب مشرک کے لئے خلود بمعنی دوام ہے تو کافر کے لئے بھی دوام ہی ہوگا۔ ورنہ کلام واحد میں ایک لفظ سے جدا جدا معنی کا قصد لازم آئے گا۔ اور یہ ممتنع ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ بعض آیات میں کافر کے لئے خلود کو دوام سے موصوف بھی کیا گیا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے فالذین کفروا قطعت لهم ثياب من نار الی قوله تعالیٰ کلما ارادوا ان یخرجوا منها من غم اعدوا فہیا اور ارشاد ہے ان الذین کفروا او صدوا عن سبیل اللہ ثم ماتوا وهم کفار فلن یغفر اللہ لهم پس اب کافر کا بھی ہمیشہ کیلئے معذب ہونا صاف طور پر معلوم ہو گیا جس سے اس کی عدم مغفرت بھی سمجھ میں آگئی ہوگی۔

اور یہاں سے ایک اشکال کے لئے مندرج ہونے پر تنبیہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ خلود کے معنی مکث طویل ہونے سے اس آیت کی تفسیر واضح ہوگئی جو قاتل عمد کے بارہ میں وارد ہے ومن یقتل مؤمناً متعمداً فجزاء جہنم خالداً فیہا کہ اس سے قتل عمد کی توبہ کا مقبول نہ ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اس میں خلود بدوں قید دوام مذکور ہے اور خلود دوام کو مستلزم نہیں۔ نہ یہاں کوئی قرینہ ارادۂ دوام کے لئے مرنج ہے۔ اس لئے مدلول آیت صرف اس قدر ہے کہ قاتل عمد کو زمانہ دراز تک عذاب جہنم ہوگا (مگر کسی وقت نجات ہو جائے گی، گو مدت دراز کے بعد ہو اور جب وہ مستحق نجات ہے تو اس کی توبہ بھی قبول ہونی چاہیے اس میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک قاتل عمد کے لئے توبہ نہیں۔ مگر جمہور صحابہؓ کے نزدیک قبول ہے پھر صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین و آئمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہو گیا کہ اس کی توبہ مقبول ہو سکتی ہے جب کہ قاعدہ شرعیہ سے ہو اور قاعدہ ہے کہ اجماع متاخر اختلاف متقدم کا رافع ہوتا ہے لہذا اب یہ مسئلہ اجماعی ہے مگر کفار و مشرکین کے لئے دوسری بعض آیات میں خلود کے ساتھ دوام بھی مذکور ہے اس لئے وہاں مغفرت کا کوئی احتمال نہیں کیونکہ خلود کے معنی بہت دن رہنا ہے اور ابد وہ ہے جس کا کبھی انقطاع نہ ہو حاصل یہ ہوا کہ کفار و مشرکین جہنم میں ایسی دراز مدت کے لئے داخل ہوں گے جس کا انقطاع ہی نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ کفر کہتے ہیں خلاف اسلام کو خواہ اس کے ساتھ مشرک بھی ہو یا نہ ہو۔ دونوں کیلئے سزا ابدالاً بابد جہنم ہے۔

کفر سے بڑا جرم

جب ترک اسلام کی سزا یہ ہے کہ تو اس سے اسلام کی عظمت و فضیلت اور اس کی ضرورت کا درجہ معلوم ہو گیا اور ترک اسلام کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اول ہی سے اسلام قبول نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ بعد قبول کر کے ترک کر دے۔ دونوں صورتوں میں یہی سزا ہے بلکہ دوسری صورت پہلی سے اشد ہے چنانچہ تو انہیں

سلطنت میں بھی باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جاوے تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں مگر باغی کے لئے بجز قتل یا عبور دریاے شور کے کچھ سزا ہی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا بن کر باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے اسی طرح اسلام لا کر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اس کی تعلیم کو دوسروں کی نظروں میں حقیر کرنا ہے۔ دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ سے مخالفت ہے اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور کبھی وہ آپ کی مذمت و ہجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی سب کہہ دیتے ہیں کہ میاں اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت ہے۔ دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال آپ کا دوست رہا۔ پھر کسی وقت مخالف بن گیا اس کی مخالفت سے بہت ضرر پہنچتا ہے اور وہ جو کچھ برائیاں آپ کی کرتا ہے۔ لوگ ان پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے اس کا منشاء محض عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا تو سالہا سال تک دوست کیوں بنتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہو گئے ہیں اس لئے مخالف ہو گیا (حالانکہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو وہ اترے پترے معلوم کرنے کے بعد ہی دشمن بنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس شخص نے دوستی ہی اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانہ میں مجھے اس کا راز دار سمجھ لیں گے تو پھر مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اس کو یہ سمجھ کر قبول کر لیں گے کہ یہ شخص راز دار رہ چکا ہے اس کو ضرور کچھ ناگوار باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اس لئے مخالف ہو گیا چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَيْنَا وَآخَرُوهَا كُفْرًا وَآخَرُوهَا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ پس ہر چند کہ دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر) عَادَةُ لُؤْلُؤًا وَشَرَعًا وَقَانُونَ وَهُوَ شَرٌّ مِّنْ جَرْمِ شَارٍ ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے اسی لئے شریعت میں مرتد کے لئے دنیوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔

اس تقریر سے آیت کے ترجمہ و تفسیر کا بیان تو ہو گیا کیونکہ اس آیت میں اصل مقصود اسلام کی فضیلت ہی کا بیان ہے مگر مجھے اس وقت صرف بیان فضیلت پر اکتفا مقصود نہیں بلکہ اس پر ایک دوسرے مضمون کو مرتب کرنا ہے جس کو آئندہ بتلاؤں گا۔

محدود کفر پر غیر محدود عذاب شبہ کا جواب

اس سے پہلے ایک شبہ عقلی کا جواب دیدینا چاہتا ہوں۔ شبہ یہ ہے کہ شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب جہنم کیوں ہے؟ حالانکہ سزا مناسب جنایت ہونی چاہیے۔ اور یہاں جنایت متناہی ہے کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے تو سزا بھی متناہی ہونی چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ مقدمہ تو مسلم ہے کہ سزا جنایت کے مناسب ہونی چاہیے مگر کیا تناسب کے یہ معنی ہیں کہ جنایت اور سزا دونوں کا زمانہ بھی مناسب ہو اگر یہی بات ہے تو چاہیے کہ جس جگہ دو گھنٹہ تک ڈکیتی پڑی ہو اور ڈاکو گرفتار ہو کر آئیں تو حاکم ڈاکوؤں کو صرف دو گھنٹہ کی سزا دے دے اگر حاکم ایسا کرے تو کیا آپ اس کو انصاف مانیں گے؟ اور سزا کو جنایت کے مناسب مانیں گے؟ ہرگز نہیں اس سے معلوم ہوا کہ سزا و جنایت میں مناسبت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ مناسب ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزا میں شدت بقدر شدت جرم ہو اب تم خود فیصلہ کر لو کہ شریعت نے کفر کی سزا میں جو شدت بیان کی ہے وہ شدت جرم کے مناسب ہے یا نہیں اور یہ جرم شدید ہے یا نہیں؟

جواب جزا و سزا میں نیت کا دخل

شاید آپ کہیں کہ جرم شدید تو ہے مگر نہ ایسا شدید کہ اس کی سزا ابدالاً بادل جہنم ہو میں کہوں گا کہ یہ خیال آپ کو اس لئے پیدا ہوا کہ تم نے صرف فعل کی سزا ظاہری صورت پر نظر کی ہے حالانکہ سزا و جزا کا مدار محض اس کی ظاہری صورت پر نہیں ہے بلکہ نیت کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اصل مدار نیت ہی پر ہے چنانچہ اگر ایک شخص دھوکہ سے شراب پی لے تو اس کو گناہ نہیں ہوا گو صورت گناہ موجود ہے کیونکہ نیت نہ تھی اور اگر ایک شخص شراب پینے کے لئے دوکان پر جائے اور دوکاندار بجائے شراب کے کوئی شربت اس کو دیدے جسے یہ شراب سمجھ کر پی لے تو اس کو گناہ ہوگا کیونکہ اس کی نیت تو شراب پینے ہی کی تھی۔ اسی لئے فقہاء نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرے مگر وہ اندھیرے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری بیوی نہیں بلکہ کوئی اجنبی عورت ہے تو اس کو گناہ ہوگا اسی طرح اگر مجامعت میں تصور کسی اجنبیہ کا کرے یعنی بیوی سے مجامعت کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ میں گویا فلاں اجنبیہ سے مجامعت کر رہا ہوں اور اس کی صورت ذہن میں حاضر کر کے اس سے لذت لے تب بھی گناہ ہوگا اور اگر شب زفاف میں عورتوں نے اس کے پاس غلطی سے بجائے اس کی بیوی کے کسی دوسری عورت کو بھیج دیا جس کے ساتھ یہ شخص یہ سمجھ کر ہمبستر ہوا کہ یہی میری بیوی ہے تو اس کو گناہ نہ ہوگا اور یہ وہی زنا شمار نہ ہوگی بلکہ وہی بالشہ ہوگی جس سے ثبوت نسب بھی ہو جاتا ہے اور

عدت بھی لازم ہوتی ہے جب یہ بات معلوم ہوگئی تو سمجھو کہ ظاہر میں کفر کا فرمتنا ہی ہے مگر اس کی نیت یہ تھی کہ اگر زندہ رہا تو میں ابد الآباد اسی حالت پر رہوں گا اس لئے اپنی نیت کے موافق اس کو ابد الآباد جہنم کا عذاب ہوگا اور اسی طرح مسلمان کا اسلام کو بظاہر متنا ہی ہے مگر اس کی نیت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام پر مستقیم رہوں گا اس لئے اس کے لئے ابد الآباد ثواب جنت ہے۔

اتلاف حقوق الہی کی سزا جواب

اور ایک دقیق جواب یہ ہے کہ کفر سے حقوق الہی کی تقویت ہے اور حقوق الہی غیر متنا ہی ہیں تو ان کی تقویت کی سزا بھی غیر متنا ہی ہونی چاہیے اور اسلام میں حقوق الہی کی رعایت ہے وہ غیر متنا ہی ہیں تو ان کی رعایت کا بدلہ بھی غیر متنا ہی ہونا چاہیے۔ الحمد للہ اب یہ اشکال بالکل مرتفع ہو گیا

اب میں اس مقصود کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو فضیلت اسلام پر مجھے متفرع کرنا ہے اور وہ دو مقصود ہیں ایک راجع ہے اپنی طرف دوسرا راجع ہے دوسروں کی طرف یعنی ایک مقصود لازم ہے ایک متعدی۔

(محاسن الاسلام بلحاظ موعظ محاسن اسلام ص ۲۵۲، ۲۵۳)

سُورَةُ الزَّلْزَالِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۗ وَمَنْ يَعْمَلْ

مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۚ

ترجمہ: پس جو شخص ذرا برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرا برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

تفسیری نکات

اہل غفلت کی غلطیاں

اس آیت کا مضمون سمجھنے میں جو غلطیاں ہوئی ہیں وہ دو قسم کی ہیں ایک وہ جو اہل غفلت کو ہوتی ہیں دوسری وہ جو اہل ذکر کو پیش آتی ہیں۔ پھر اہل ذکر میں دو طبقہ ہیں ایک اہل ظاہر اور دوسرے اہل باطن۔ ان میں سے ہر ایک کو اس مضمون کے متعلق غلطی ہوئی ہے جو غلطیاں اہل غفلت کو ہوئی ہیں مجملہ ان کے ایک یہ غلطی ہے کہ اس آیت کے جو دو جزو ہیں اول فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ اور دوسرے وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ان لوگوں کی دونوں پر نظر نہیں یہ بات تو نہیں کہ اس مضمون کا ان کو اعتقاد نہیں ہے اعتقاد اور علم تو ہے لیکن عمل سے ان کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس طرف التفات نہیں ہے۔ اس سے غفلت ہے میں اس کا نام غفلت رکھتا ہوں حضرات صوفیہ اسی کا نام جہل رکھتے ہیں لیکن چونکہ جہل لفظ سے بگڑتے ہیں کیونکہ اپنے کو عالم اور معنی شناس جانتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تو ذی علم ہیں ہم جاہل کدھر سے ہیں۔ اس لئے میں نے اس لفظ کو چھوڑ کر اس کو غفلت سے تعبیر کیا ہے۔

اہل غفلت کا حال

ان لوگوں نے اپنے لئے تو فمّن يعمل مثقال ذرۃ خیرا یبرہہ پر نظر رکھی یعنی خود اگر تھوڑا سا عمل نیک کیا تو اس پر نظر ہے اور دوسروں کے لئے ومن يعمل مثقال ذرۃ شریرا بہ پیش نظر ہے یعنی ان کے اعمال نیک پر نظر نہ کر کے ان کے برے ہی اعمال پر نظر ہے اور سب کو حقیر جانتے ہیں ایک نماز انہوں نے کیا شروع کی کہ سارے جہان کو حقیر جاننے لگے اور خود ان حضرات کی حالت خواہ کچھ ہی ہو۔ چنانچہ بہت لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ نماز پڑھتے ہیں اور وظیفے گھونٹتے ہیں اور اپنے کو مقدس جانتے ہیں اور حقوق العباد ضائع کر رہے ہیں۔ دھوکے دیکر لوگوں کے مال چھین رہے ہیں اور اس پر بھی دوسروں کو حقیر جانتے ہیں حالانکہ جیسے ترک صلوٰۃ حرام ہے حقوق العباد ادا نہ کرنا اور دوسروں کو حقیر جاننا اور ریابھی حرام ہے۔ (عمل الذرہ)

عذاب تطہیر

خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن نہ کسی کی خیر اگرچہ وہ ذرا ہی سی ہو ضائع ہو جائے گی اور نہ کسی کی شر اگرچہ بہت کم ہو غائب ہوگی۔ میں نے خیر کے ساتھ ضائع کا لفظ اور شر کے لئے لفظ غائب اس لئے استعمال کیا ہے کہ خیر پر تو اللہ تعالیٰ جزا دیں گے اس لئے وہ ضائع نہ ہوگی۔ بخلاف شر کے کہ گونا گونا ضرور ہوگی اللہ تعالیٰ سے کہیں چھپے گی نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس پر ضرور ہی عتاب ہو۔ بلکہ اکثروں کے لئے امید یہ ہے کہ فضل و کرم سے معاف فرما دیں گے اور بعض کو سنا بھی دیں گے لیکن وہ بھی رحمت اور فضل و کرم ہی ہوگا مقبولین پر دنیا کے مصائب تو فضل و رحمت ہیں ہی کہ ان پر اجر و ثواب ہے چنانچہ اس کو سب جانتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ مقبولین پر آخرت میں بھی اگر کوئی کلفت ہوگی تو وہ بھی رحمت ہی ہے اس کو سن کر شاید تعجب ہوا ہوگا۔ لیکن قرآن سے خود اس کا اثبات ہوتا ہے چنانچہ کفار کے بارہ میں ارشاد ہے لَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَکِّیہُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کفار سے قیامت کے روز نہ کلام فرماویں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے۔ مفہوم مخالف تمام علماء کے نزدیک موقع و عید میں معتبر ہے پس معلوم ہوا کہ یہ آیت کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور مسلمانوں سے کلام بھی فرماویں گے اور ان کو پاک بھی کریں گے پس عذاب جو ہوگا وہ محض عذاب کی صورت میں ہے حقیقت میں پاک کرنا مقصود ہے گناہوں سے۔

آخرت کی تکالیف بھی مسلمانوں کے لئے رحمت ہیں

پس آخرت کی تکالیف بھی مسلمانوں کے لئے رحمت ہیں ان کے حق میں وہ جہنم نہیں ہے جہنم کفار کے لئے ہے چنانچہ اسی واسطے ارشاد ہے اعدت للکفرین یعنی تیار کی گئی ہے کفار کے لئے پس جہنم من حیث ہی جہنم اور

عقوبت من حیث ہی عقوبت صرف کافرین ہی کے لئے ہے اور ہمارے لئے وہ ترکیہ اور تطہیر ہے باقی تکلیف اس لئے ہوں گی کہ میل ہمارا بے حد ہے جب تک خوب تیز پانی سے غسل نہ دیا جاوے گا میل علیحدہ نہ ہوگا۔ اور میل کے رہتے ہوئے جنت میں جانا ممکن نہیں اس لئے کہ جنت کا خاصہ ہے کہ نجاست لے کر کوئی وہاں نہیں جاسکتا۔

خروج آدم کی حکمت

بعض حضرات محققین نے فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کا باعث حقیقت عتاب نہیں تھا بلکہ جس درخت سے کھانے کی ممانعت فرمائی گئی تھی اس کی خاصیت یہ تھی کہ اس کے کھانے سے فضلہ پیدا ہوتا تھا جب آدم علیہ السلام نے اس کو کھایا تو استنجے کی ضرورت ہوئی اور وہ محل اس کا تھا نہیں اس لئے نکلنے کا حکم ہوا اس لئے کہ جنت میں پولیس تو تھی نہیں یہاں دنیا میں پانچخانہ پھرنے آئے تھے۔ واقع میں حقیقی عتاب اس کا سبب نہ ہوا تھا۔ مثلاً یہاں جامع مسجد میں کسی کو پانچخانہ کی ضرورت ہو تو اس کو یہاں سے نکالیں گے۔ اس لئے کہ مسجد پانچخانہ کی جگہ نہیں ایسی ہی جنت گندگی کی جگہ نہیں۔

اور اس پر ایک مقولہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا یاد آ گیا فرماتے تھے کہ آدم علیہ السلام کا نکلنا واقع میں رحمت ہے کیونکہ اگر آدم علیہ السلام نہ نکلتے اور ان کی اولاد ہوتی تو اولاد میں سے ضرور ایسے ہوتے کہ وہ نکلتے اس لئے کہ جب آدم علیہ السلام ہی سے اس کے کھانے سے صبر نہ ہوا تو اولاد سے تو بطریق اولیٰ نہ ہوتا۔ پھر اگر اولاد میں سے نکلتے تو ایسی حالت میں نکلتے کہ جنت بھری ہوئی ہوتی۔ وہ نکلنے والا کسی کا بیٹا ہوتا کسی کا باپ ہوتا کسی کی ماں ہوتی تو اس کے نکلنے سے ایک کہرام مچ جاتا اور جنت جنت نہ رہتی بلکہ زحمت ہو جاتی۔ حق تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے کہ آدم علیہ السلام کو یہاں بھیج دیا اور اولاد کو حکم ہوا کہ پاک ہو کر ہمارے پاس آویں۔

چنانچہ ارشاد ہے و من تزکی فانما یتزکی لنفسہ پس جس نے ان ادا امر کو سمجھ لیا اور گناہوں اور شوائب نفس سے غسل کر کے پاک ہو گیا اور تقویٰ کا لباس پہنا وہ پھر جنت میں جو ہمارا اصلی ٹھکانہ ہے چلا جائے گا اور جس نے غسل نہ کیا اور نہ کپڑے بدلے تو اس کو حمام ضرور کرایا جاوے گا تا کہ جنت میں جانے کی اہلیت اس میں ہو جاوے پس مسلمانوں کے لئے دوزخ میں جانا بھی فضل ہوا۔

دلیل اس کی یہ آیت ہے فمن يعمل مثقال ذرة خیرا یرہ و من يعمل مثقال ذرة شرا یرہ (جو شخص ایک ذرے کے برابر بھی کوئی بھلائی کرے گا اس کے (فائدے) کو دیکھے گا اور جو شخص ایک ذرا بھی برائی کرے گا وہ اس کو بھی نظر آئے گی۔

مفہوم آیت

لفظ من عام ہے مطیعین کو بھی اور عاصین کو بھی تو جب یہ فرمایا کہ جو شخص کرے گا تو اس کے عموم میں گنہگار اور فرمانبردار دونوں داخل ہو گئے۔ اس سے صاف طور پر سے معلوم ہوا کہ نیک کام کرنے پر ہر حالت میں ثواب ملے گا کسی وقت میں اس کا ثواب ضائع نہ ہوگا اسی طرح دوسرے جملے میں بھی من عام ہے اور اس سے ناز کا علاج بھی ہو گیا جیسے پہلے من سے مایوسی کا علاج ہو گیا تھا دوسرے من میں فرمانبردار بھی داخل ہوں گے یعنی اگر کوئی بڑا ولی کامل بھی گناہ کرے تو اس کو بھی گناہ ہوگا۔ (الزلزال)

شاید کوئی یہ کہے کہ قرآن شریف میں ہے وانه لحب الخیر لشدید (بیشک وہ مال کی محبت میں بہت سخت ہے) کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیة (تم پر ضروری کی گئی ہے وصیت جب کسی کو موت آنے لگے اگر وہ مال چھوڑے) یہاں مال کو خیر فرمایا ہے۔ لہذا مال کی ترقی بھی خیر اور بھلائی میں ترقی ہوئی اور فاستبقوا الخیرات (بھلائیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو) میں یہ بھی آگئی۔

جواب یہ ہے کہ الخیرات میں مطلق خیر مراد ہے یعنی جو ہر طرح بھلائی ہی بھلائی ہو۔ اور مال ہر طرح بھلائی نہیں اس کی بھلائی ہونے کی بہت سی شرطیں ہیں جن کی رعایت نہیں کی جاتی۔ اس لئے مالی ترقی کو بھلائی میں ترقی نہیں کہہ سکتے اور جس درجہ میں مال بھلائی ہے اس درجہ ترقی کو ہم بھی نہیں روکتے جائز بلکہ فرض کہتے ہیں۔

حضور کا ارشاد ہے کسب الحلال فریضة بعد الفریضة (حلال مال کمانا اور فرضوں کے بعد فرض ہے) (علاج الحرص)

نور قلب اور معاصی یکجا جمع نہیں ہوتے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ معصیت کیساتھ اعمال صالحہ تو جمع ہو سکتے ہیں فمن يعمل مثقال ذرة خیرا یرہ ومن يعمل مثقال ذرة شریرہ لیکن نور قلب اور معاصی ایک جگہ جمع نہیں ہوتے معاصی اس میں نخل ہیں۔ (الافاضات الیومیہ ج ۶ ص ۷۵)

سُورَةُ الْعَصْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْعَصْرِ ۝١ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝٢ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا بِالْحَقِّ ۝٣ وَتَوَّصُوا بِالصَّبْرِ ۝٤

ترجمہ: قسم ہے زمانہ کی (جس میں نفع و نقصان واقع ہوتا ہے) کہ انسان (بوجہ تہیج عمر کے) بڑے خسارے میں ہے مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے کہ (یہ مال ہے) اور ایک دوسرے کے (اعتقاد) حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو (اعمال) کی پابندی کی فہمائش کرتے ہیں۔

تفسیری نکات توضیح قسم

قسم کے ساتھ تاکید کلام کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے اس کے نام کی عظمت کی وجہ سے قسم کھانے والا جھوٹ سے رکتا اور ڈرتا ہے کہ اگر اس کا نام لے کر جھوٹ بولوں گا تو وبال میں گرفتار ہو جاؤں گا یہ صورت تو قرآن میں اللہ تعالیٰ کی کھائی ہوئی قسموں میں نہیں ہو سکتی کیونکہ مخلوق میں کوئی ایسا معظم نہیں جس کا نام لینا خدا کو کسی امر سے مانع ہو۔ دوسری صورت تاکید قسم کی یہ ہے کہ مقسم بہ سے جواب قسم کی توضیح مقصود ہو میں نے جہاں تک غور کیا تو اقسام قرآن میں یہی صورت معلوم ہوئی کہ مقسم بہ کو جواب قسم کی توضیح میں بڑا دخل ہے اور یہ بہت بڑا علم ہے لیکن ہر مقام پر سیاق و سباق کو دیکھنا اور غور کرنا پڑتا ہے اور غور کرنے سے قسم و جواب قسم میں ارتباط معلوم ہو جاتا ہے۔

اب سورة العصر کی قسم کو سمجھے کہ اس کو جواب قسم سے کیا مناسبت ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان دو چیزوں میں مقید ہے ایک زمان میں ایک مکان میں لیکن مکان مستقر ہے۔ یعنی اس کے لئے انقضاء نہیں اور زمان غیر مستقر ہے یعنی اس کے لئے انقضاء ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ جو زمانہ گزر گیا قبضہ سے باہر ہو گیا تو حق تعالیٰ اس قسم سے انسان کے خسارہ کی دلیل بتلاتے ہیں کہ یہ ایسا عاجز ہے کہ جس طرف میں اس کا عمل مقید ہے وہ اس کے اختیار سے باہر ہے اگر کسی وقت میں کوئی عمل اس سے فوت ہو گیا تو اگر یہ اس کا مدارک بھی کرے گا تو دوسرے وقت میں کرے گا اور جو زمانہ عمل سے خالی گزر گیا وہ بے کار گیا۔ تو واقعی انسان بڑے خسارہ میں ہے البتہ مسلمان اس خسارہ سے بچا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس ایمان کی دولت ایسی ہے کہ وہ ہر وقت میں باقی رہنے والی ہے کہ ایک دفعہ ایمان کو اختیار کر لینے سے جب تک معاذ اللہ اس کی ضد کا اعتقاد نہ ہو ایمان قائم رہے گا اور یہ ہر وقت میں مومن ہوگا۔ سوتے ہوئے بھی چلتے پھرتے بھی اور کھاتے پیتے ہوئے بھی غرض کوئی وقت اور کوئی ساعت مسلمان کی طاعت سے خالی نہیں گزرتی۔ اگر اس سے اور بھی کوئی عمل صادر نہ ہو۔ تب بھی ایمان تو ایسی طاعت ہے جو ہر وقت اس سے صادر ہو رہی ہے۔ اسی سے کافر کا خسارہ عظیمہ میں ہونا بھی معلوم ہو گیا۔ کہ اس کا کوئی وقت معصیت سے خالی نہیں گزرتا۔ اگر وہ اور بھی کچھ گناہ نہ کرے۔ تو کفر ہی اس سے ہر وقت صادر ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ کفر اختیار کرنے کے بعد جب تک ایمان نہ لائے کافر ہر وقت کافر ہے۔ کوئی ساعت اس کی کفر سے خالی نہیں گزرتی۔ بس اس قسم سے انسان کے خسارہ کی بڑی دلیل معلوم ہوئی۔ بدوں ایمان کے اس کے خسارہ کی کچھ انتہا نہیں کہ ہر سیکنڈ اور ہر منٹ میں اس کے سر پر عذاب بڑھتا جا رہا ہے اور ایمان کے بعد اس کے نفع کی کچھ انتہا نہیں۔ کہ ہر ساعت میں اس کی طاعت بڑھتی رہتی ہے خلاصہ یہ کہ تمام دنیا جانتی ہے کہ نفع اور خسارہ زمانہ ہی میں ہوتا ہے پس اس شخص سے بڑھ کر کوئی خسارہ میں نہیں۔ جس کا کوئی وقت سیکنڈ خسارہ سے خالی نہ ہو (اور یہ کافر ہے) اور اس شخص سے بڑھ کر کوئی نفع میں نہیں۔ جس کا کوئی وقت کوئی سیکنڈ کوئی حالت نفع سے خالی نہیں (اور وہ مومن ہے)

اور ہر چند کہ مسلمان کا نفع صرف ایمان ہی سے ہر وقت بڑھ رہا ہے مگر پورا نفع جب بڑھے گا جب کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔ کیونکہ عمل صالح سے ایمان قوی ہوتا اور گناہوں سے کمزور ہوتا ہے پس مومن فاسق کا ہر وقت نفع کا بڑھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو ہر سیکنڈ میں ایک پیسہ کا منافع بڑھتا ہو اور مومن صالح کا ہر وقت نفع بڑھنا ایسا ہے جیسے کسی کا ہر سیکنڈ میں ہزار روپیہ کا منافع بڑھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ پورا نفع اسی کا بڑھ رہا ہے جس کو ہر سیکنڈ میں ہزار روپیہ کا نفع ہوتا ہو۔ پس گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہایت ضروری ہے اور عمل صالح اختیار کرنا لازم ہے۔ تاکہ ہر سیکنڈ میں ہزاروں کی ترقی ہو اور ہزار روپیہ سے کمی ہو کر ایک پیسہ ہی نہ رہ جائے۔ کہ نفع عظیم کے مقابلہ میں

یہ بھی خسارہ ہے گو کافر کے خسارہ کے مقابلہ میں نفس ایمان کا نفع بھی لاکھ درجہ افضل ہے۔

اور اگر معاملہ یہیں تک رہتا تب بھی کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم کو ہزار کا نفع نہ سہی ایک پیسہ ہی کا سہی مگر مصیبت اور خطرہ تو یہ ہے کہ گناہوں کی وجہ سے بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے پھر وہ ایک پیسہ کی بھی ترقی نہیں رہتی بلکہ خسارہ ہی خسارہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عمل صالح اور تو اوصیٰ بالحق اور تو اوصیٰ بالصبر کو کیوں بڑھایا۔ اس کی وجہ یہی ہے جو ہر ایمان کے محافظ ہیں اور گناہ و معاصی اس دولت کے دشمن ہیں جو شخص خود گناہ کرتا یا دوسروں کو گناہ میں مبتلا دیکھ کر نصیحت نہیں کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کے دل سے گناہوں کی نفرت کم ہو جاتی ہے اور پھر زائل ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں کو ہلکی اور معمولی بات سمجھنے لگتا ہے اور یہی کفر ہے۔ غرض اس مقام پر زمانہ کی قسم کو جواب قسم کی توضیح میں بڑا دخل ہے کہ اس سے خسارہ کی دلیل معلوم ہوگی اور یہ دعویٰ مدلل ہو گیا کہ واقعی انسان بڑے خسارے میں ہے۔ اگر ایمان اور عمل صالح سے محروم ہو۔ (التواصیٰ بالحق مابعدہ دعوت و تبلیغ)

مخلوق کی قسم قبیح لغیرہ ہے

اب سمجھئے کہ مخلوق کی قسم قبیح لغیرہ ہے قبیح لعینہ نہیں وہ قباحت عارضی ایسی ہے کہ اگر مخلوق مخلوق کی قسم کھائے تو قباحت ہے اور اگر خالق مخلوق کی قسم کھائے تو قباحت نہیں اور وہ شرک اور ایہام شرک ہے۔ اس طرح سے کہ اس میں شبہ ہوتا ہے تعظیم مخلوق کا کیونکہ عادتاً قسم معظم چیز کی کھائی جاتی ہے اس لئے ممانعت ہوگئی ہے قسم کھانے کی جیسے بعض مشرکین قسم کھاتے ہیں دریاؤں کی پہاڑوں کی مقصود ان کا یہ ہوتا ہے کہ اتنی بڑی چیز کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولیں گے اس میں ایہام شرک ہے اور ایہام شرک کا شبہ اسی میں ہو سکتا ہے جو خود چھوٹا ہو اور اس سے دوسری چیز بڑی ہو اور خداوند جل جلالہ چونکہ سب سے بڑا ہے اس لئے اس میں یہ شبہ نہیں ہو سکتا چونکہ اس میں ایہام شرک نہیں اس لئے وہ عارضی قبح اس میں نہیں ایک سوال اور رہ گیا کہ قباحت تو لازم نہیں آتی مگر اپنی قسم چھوڑ کر چھوٹی شے کی قسم کیوں کھائی۔ بات یہ ہے کہ قسم سے تین غرضیں ہوتی ہیں غالب تو یہ کہ کسی شے کو معظم بتلانا اور یہ گمان کرنا کہ اگر ہم اس کا نام لے کر جھوٹ بولیں گے تو ہم پر اس کا وبال ہوگا۔ دوسری غرض یہ کہ اس مقسم بہ (جس کے ساتھ قسم کھائی گئی ہو) کا اپنے سے خاص تعلق ہے اگر جھوٹ بولیں تو ہمارے منافع اس سے منقطع ہو جائیں مثلاً بیٹے کی قسم تیسری غرض یہ کہ مقسم بہ کا کثیر النفع ہونا فی نفسہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بڑے کام آتی ہے۔ ہر چند کہ مخلوق کی قسم کھانے سے تینوں احتمال ہو سکتے ہیں مگر شریعت میں احتیاط بہت کی گئی ہے کہ شبہ شرک تو ہر جگہ ہوتا ہی ہے رہا خداوند جل جلالہ جو کسی مخلوق کی قسم کھاتے ہیں اس کی حکمت کیا ہے بلطف دیگر آج کل کی مخترع (من گھڑت) اصطلاح کے موافق یوں کہئے کہ اس کی فلاسفی کیا ہے

وہ یہ کہ پہلی اور دوسری غرض تو وہاں ہے نہیں لیکن تیسری غرض یعنی حکمت مذکورہ ہے اور غرض کی تفسیر حکمت سے اس لئے کی کہ حق تعالیٰ کو کسی کی کیا غرض ہوئی غرض تو مخلوق کو ہوا کرتی ہے وہاں حکمت ہوا کرتی ہے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم بلکه تا بر بندگاں جو دے کنم

یعنی ہم نے اس لئے مخلوق کو نہیں پیدا کیا کہ ہم اس سے نفع اٹھائیں یا اس سے ہماری کوئی غرض انکی ہوئی ہے بلکہ محض اس لئے کہ مخلوق پر احسان کریں۔ پس خداوند عزوجل جلالہ جس چیز کی قسم کھاتے ہیں اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اے سننے والو یہ شے کثیر النفع ہے اس کی طرف التفات کرو اور اس سے منتفع ہو۔

مفسدہ کا احتمال تو پہلے ہی دفع ہو چکا تھا۔ اب مصلحت کا سوال بھی ختم ہو چکا خداوند جل جلالہ نے بہت کثرت سے مخلوق کی قسم کھائی ہے۔ مثلاً لا اقسام بیوم القيامة ولا اقسام بالنفس اللوامہ (قسم کھاتا

ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں میں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے ۱۲) فالعصفت عصفا یعنی قسم ہے ان ہواؤں کی جو تندی کے ساتھ چلتی ہیں (۱۲) والفجر (قسم ہے فجر کی ۱۲) والشمس (قسم ہے سورج

کی ۱۲) ہر جگہ یہی مراد ہے کہ یہ اشیاء کثیر النفع ہیں ان کی جانب التفات کرو اور حق تعالیٰ کے مخلوق کی قسم کھانے میں ایک راز خاص اور ہے وہ یہ کہ جس مقام پر قسم کھائی ہے اس کے بعد ایک جواب قسم بھی ہوتا ہے تو غور کرنے

سے معلوم ہوا کہ مقسم بہ جواب قسم کی جو ایک دعویٰ ہے بمنزلہ دلیل کے ہوتا ہے یعنی خداوند جل جلالہ نے جس چیز کی قسم کھائی ہے اس کے آگے جواب قسم سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مقسم بہ اس دعویٰ کی دلیل ہے اسے ایک

مثال سے سمجھئے مثلاً فرماتے ہیں والمرسلت عرفا الخ (قسم ہے ان ہواؤں کی جو نفع پہنچانے کے لئے بھیجی جاتی ہیں ۱۲) اس سے آگے فرماتے ہیں انما توعدون لواقع (یعنی جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا

ہے وہ ضرور ہونے والی ہے) قسم کھا کر فرماتے ہیں قیامت ضرور آنے والی ہے والنزعت عرفا الخ (یعنی قسم ہے ان فرشتوں کی جو کافروں کی جان سختی سے نکالتے ہیں ۱۲) یہاں بھی قسم کھا کر فرماتے ہیں قیامت ضرور

آنے والی ہے اور اسی طور پر جا بجا قسمیں کھائی ہیں خاص خاص اشیاء کی یہاں ایک دعویٰ ہے قیامت ضرور آئے گی اب اس کی دلیل کی ضرورت ہے مثلاً ہوا ہے کہ اس کے اندر تغیر بتلایا ہے اور ہوا ایک ایسی بڑی چیز

ہے جو دم بھر میں بڑے بڑے پہاڑوں کو ہلا دیتی ہے جسے ہوئے درختوں کو اکھاڑ پھینکتی ہے کیا قدرت اور رحمت ہے جل جلالہ کی ہر وقت لاکھوں من ہوا ہمارے سر پر رہتی ہے کیونکہ جو (آسمان وزمین کے درمیان خلاء) میں

تمام ہوا بھری ہوئی ہے جتنی جگہ ہمارے جسم سے رکی ہوئی ہے صرف وہ ہوا سے خالی ہے اور باقی تمام ہوا ہی ہوا ہے اور ہم کو محیط ہے اور ہم کچلنے نہیں دیتے مرتے نہیں تو اس تغیر سے معلوم ہوتا ہے کوئی بڑا قادر ہے جو ہوا جیسی

طاقتور چیزوں کو دم بھر میں الٹ پلٹ کر دیتا ہے اس کو قیامت لانا کیا مشکل ہے یہاں منکرین کے پاس دو

مقام ہیں ایک یہ کہ قیامت محال ہے اور یہ خیال تھا فلاسفہ کا اس کے مقابلے میں امکان ہے دوسرے یہ کہ ضرور ہے کہ ہر ممکن واقع ہی ہوا کرے جائز ہے کہ کسی شے کا امکان تو ہو مگر وقوع اس کا مستبعد ہو اور یہ خیال تھا کہ مشرکین عرب کا فلاسفہ کے مقابلے میں تو امکان کا اثبات درکار ہے اور دفع استبعابثبات امکان کو مستلزم تھا اور فلاسفہ قلیل بھی تھے۔ اس لئے استقلالاً ان کے شبہ سے تعرض نہیں کیا اور عوام الناس زیادہ ہیں اس لئے انہیں کے مذاق کے موافق دلائل بیان کئے گئے پس یہاں گفتگو ان لوگوں کے جواب میں ہے جو قیامت کو مستبعد سمجھتے ہیں چنانچہ کہا کرتے تھے کہ ء اذامتنا و کنا ترابا (یعنی کیا ہم جب مرجائیں گے اور ہو جائیں گے ہم مٹی) کیا ہماری ہڈیاں جب گل سڑ جائیں گی اور ہم بالکل خاک ہو چکیں گے اس وقت ہم پھر زندہ کئے جائیں گے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے قرآن مجید میں اسی استبعاد کو دفع کیا گیا ہے اور جا بجا مذکور ہے کہ خدا نے جب ابتدا اپنی مخلوق کو پیدا کر دیا کہ اس وقت بظاہر زیادہ مشکل تھا گو واقع میں خداوند جل جلالہ کو کچھ بھی مشکل نہیں تو اب دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ پس جہاں کہیں قرآن مجید میں قسمیں وارد ہوئی ہیں ان قسموں سے ان کے جواب کا استبعاد فرمنا ہوتا ہے کہ جو ہوا کو جو ایسی طاقتور ہے دم بھر میں الٹ پلٹ کر دیتا ہے اس کو کیا مشکل اور مستبعد ہے جو سب کو الٹ پلٹ کر دے۔

بہر حال یہ راز تھا خداوند جل جلالہ کی قسموں کا۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جن کی قسمیں کھائی ہیں ان کے احوال نہایت قابل تدبیر و تفکر ہیں۔ گو بظاہر وہ کسی ہی سرسری و معمولی ہوں جب حق تعالیٰ نے ان کی قسم کھائی ہے وہ ضرور قابل اہتمام ہیں۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں کہیں تو ایسی چیزوں کی قسم کھائی ہے جو ظاہر میں با وقعت ہیں مثلاً والسماء (قسم ہے آسمان کی) والارض (قسم ہے زمین) اور کہیں ایسی چیزوں کی قسم کھائی ہے جو بظاہر بے وقعت ہیں مثلاً والتمین یعنی قسم ہے انجیر کی مقصود یہاں بھی یہی ہے کہ انجیر کثیر النفع شے ہے۔ اس کے منافع کی طرف التفات کرو اسی طرح یہاں فرمایا والعصر یعنی قسم ہے زمانہ کی زمانہ کی زمانہ تو انجیر سے بھی نہایت کمتر ہے انجیر جو ہر محسوس تو ہے زمانہ تو عرض غیر محسوس ہی ہے اسی وجہ سے متکلمین اور فلاسفہ میں زمانہ کی تحقیق میں اختلاف ہوا ہے فلاسفہ تو کہتے ہیں کہ زمانہ فلک الافلاک کی حرکت کا نام ہے اور متکلمین اسے امتداد موہوم مانتے ہیں یعنی زمانہ ایک وہمی اور خیالی شے ہے سو گو وہ (زمانہ) محض موجودہ انتزاعی ہی ہو مگر ایک ایسی چیز جو قابل اہتمام ہے اس واسطے کہ اس کا تعلق ہے واقعات سے اور ان کے خاص آثار ہوتے ہیں اور وہ قابل اہتمام ہوا کرتے ہیں۔ مگر چونکہ متلبس بالزمانہ ہیں اس لئے زمانہ بھی قابل نظر ہوا پس حق تعالیٰ اس زمانہ کی یا بلفظ دیگر وقت کی قسم کھاتے ہیں اور اس دوسرے عنوان کے اعتبار سے میرا یہ بیان صرف پرانے ہی خیال والوں کے مذاق پر منطبق نہ ہوگا بلکہ نئے خیال والوں کے مذاق کے بھی موافق ہوگا۔ یعنی وقت کیسی

باوقعت چیز ہے نئے خیال والوں کو میرا ممنون ہونا چاہیے کہ میں نے وقت کے باوقعت ہونے کو قرآن سے ثابت کر دیا۔ لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ اہل یورپ وقت کی بہت قدر کرتے ہیں اور اہل اسلام کے یہاں وقت کی قدر نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بڑی قدر ہے اگر نہ ہوتی تو قرآن مجید میں وقت کی قسم کیوں مذکور ہوتی۔ مگر ہم لوگوں نے بالکل اسلام پر عمل ہی چھوڑ دیا ذرا آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے کہ اس میں کیا خوبیاں ہیں اور کیسی عمدہ تعلیم ہے اور جو خوبیاں اہل یورپ میں کہی جاتی ہیں وہ دراصل انہوں نے اسلام ہی سے لی ہیں اور ہم اپنے یہاں غور نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ انہیں کے ملک ہیں۔ ہاں اس معنی کر انہیں کی ملک ہیں جیسا کاشکار بارہ برس تک اگر زمیندار کی زمین پر قبض رہے تو یہ قانون ہے کہ موروثی ہو کر کاشکار بمنزلہ ملک سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اہل یورپ نے عرصہ سے ان خوبیوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنا دستور العمل بنا لیا تو ہم یہ سمجھنے لگے کہ یہ موروثی ہو کر انہیں کی ملک ہو گئیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ آج کل اہل یورپ کی تقلید کا اس قدر غلبہ ہو گیا کہ ان کے منہ سے کوئی بات نکلے اور قرآن میں اس کے خلاف ہو تو اہل یورپ کے قول کا یقین کر لیا جاتا ہے اور قرآن برخلاف واقع ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ محمد ﷺ تو فرمائیں کہ انسان کی اصل انسان ہے اور ڈارون جو ایک ملحد ہے وہ کہے کہ سب سے پہلے ایک مادہ مطلقہ موجود تھا اور پھر تحرک سے اس میں حرارت پیدا ہوئی اور شمس وغیرہ بنا اور اس کے بعد پھر نباتات بنے پھر حیوانات بنے ان میں بندر بنا۔ یکا یک جست کر کے انسان بن گیا۔ اسی طور پر وہ تمام حیوانات نباتات ہیں اسی کا قائل ہے کہ ایک دوسرے سے نکلتے چلے آئے تو محمد ﷺ کے فرمانے پر تو شبہ کیا جاتا ہے اور ڈارون کے کہنے پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ یہی ایمان ہے۔ ڈارون تو صانع کا قائل نہیں تھا اس لئے ایسی بعید اور بے ہودہ تاویلیں کرتا تھا مگر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ صانع کو مانتے ہیں اور پھر ایسی مہمل تاویلوں سے قرآن پر شبہ کرتے ہیں۔ شاید کوئی یہاں کہے کہ ہم کو تحقیقات جدیدہ سے قرآن پر شبہ اس سے ہو جاتا ہے کہ حکماء کو تو مشاہدہ ہے اور اسی بناء پر ہم کو قرآن پر شبہ ہے کہ مشاہدہ کے خلاف کیوں ہے۔ یہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے میں کہتا ہوں کہ آپ مشاہدہ کی حقیقت ہی کو نہیں جانتے میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ مادہ خود بخود متحرک ہو کر اس سے ایک صورت پیدا ہوگئی پھر شمس و کواکب ہوئے نباتات ہوگئی اور نباتات سے حیوانات میں ایک خاص نوع بندر بنے پھر بندر یکا یک جست کر کے انسان ہو گیا۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ خود ان مقررین بالقروءیت (بندر ہونے کے اقرار کرنے والوں) کو بھی بندر نہ بننے دیں آدمی ہی بناؤں۔ یہی مشاہدات ہیں انہیں ڈھکوسلوں اور مہمل اور وہی باتوں کو مشاہدات قرار دے کر خدا اور رسول ﷺ پر شبہات اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کیا یہ مشاہدہ ہے کہ آفتاب کو سکون ہے۔ زمین کو حرکت ہے خیر ہمیں

اس سے بحث نہیں کہ کس کو سکون ہے اور کس کو حرکت کیونکہ یہ قرآن کے مخالف نہیں مگر یہ سوچ لو کہ اتنا بڑا دعویٰ کس بنا پر ہے دلیل کچھ بھی نہیں مگر ہم کہیں گے الشمس تجری (سورج چلتا رہتا ہے) چونکہ قرآن میں وارد ہوا ہے اس لئے آپ آفتاب کو ساکن محض ماننے سے گنہگار ہوں گے زمین کو چاہے آپ ساکن نہ ماننے متحرک محض ماننے مگر آفتاب کو بھی متحرک ماننا پڑے گا شاید کسی کو یہ شبہ ہو وجعلنا فی الارض رواسی الخ (یعنی اور ہم نے زمین میں اس لئے پہاڑ بنائے کہ زمین اور لوگوں کو لے کر ہلنے نہ لگے) سے تو زمین کا سکون ثابت ہوتا ہے پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ حرکت ارض کا ماننا قرآن کے خلاف نہیں جو اب یہ ہے کہ اس سے نفی حرکت اضطرابیت کی مراد ہے حرکت غیر اضطرابیہ کی نفی مراد نہیں۔ غرض اس کی آپ کو اجازت ہے کہ زمین کو اگر جی چاہے متحرک مانیں کچھ حرج نہیں۔ اسی طرح اس کی خبر دی گئی ہے کہ آسمان موجود ہے یہ کون سے مشاہدہ کے خلاف ہے گو اس نظام طلوع وغروب کے لئے سموات کی ضرورت نہ ہو لیکن نظام خاص کی ضرورت نہ ہونا نفی کی تو دلیل نہیں ہو سکتی آسمان دوسری مستقل دلیل سے ثابت ہے۔ اس کی نفی کرنا جائز نہیں یہ کس مشاہدہ سے ثابت ہوا کہ آسمان نہیں ہے بلکہ ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس نیلگوں صورت کو حد نظر مان کر آسمان کی نفی کا ہمیں جواب سکھا دیا کیونکہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں آیا کہ یہ نیلا نیلا جو نظر آتا ہے یہی آسمان ہے پس اگر آپ کہیں گے کہ اگر آسمان کوئی چیز ہے تو نظر کیوں نہیں آتا۔ ہم یہ کہیں گے کہ نظر اس لئے نہیں آتا کہ آپ نے اس سقف نیلی کو حد نظر مان لیا پس جب یہ حد نظر ہے تو آسمان اس کے آگے ہے اور چونکہ نظر یہاں تک انتہا ہو جاتی ہے اس لئے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اب آپ کو آسمان کے نفی کرنے کی بالکل گنجائش نہیں رہی اب اس شبہ کی بالکل گنجائش نہیں رہی کہ ہم حکماء کے قول پر قرآن کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ مشاہدہ کی بناء پر جس کی مثال میں یہ پیش کیا کرتے ہیں کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ غروب کے وقت آفتاب زمین کے اندر نہیں جاتا اور قرآن مجید میں سکندر ذوالقرنین کے قصہ میں مذکور ہے کہ آفتاب کو کیچڑ اور دلدل میں غروب ہوتے پایا بھلا دیکھو کتنا مشاہدہ کے خلاف ہے آفتاب ایک جرم عظیم ہے۔ زمین سے کتنے ہی حصہ بڑا ہے کہیں زمین کی دلدل اور کیچڑ میں غروب ہو سکتا ہے لیکن اگر عقل ہوگی تو اس میں جواب نظر آئے گا یعنی قرآن مجید میں وجد الخ وارد ہوا ہے۔ یعنی اس کو بادی النظر میں ایسا پایا۔ یعنی اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیچڑ میں دھنس رہا ہے۔ یہاں یہ نہیں فرمایا غربت فی (کیچڑ میں ڈوب گیا) جہاز پر سوار ہو کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سمندر میں سے نکلتا ہے اور اسی میں ڈوب رہا ہے اسی طور پر ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں آفتاب کے طلوع وغروب کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی سے نکلا اور زمین ہی میں گھس گیا۔ پھر مشاہدہ کے خلاف کیا ہوا اب فرمائیے مشاہدہ سے کہاں تعارض ہے کہیں بھی نہیں۔ پھر افسوس ہے کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ

کرتے ہیں اور قرآن اگر فیثا غورس کے قول کے مخالف ہو تو قرآن پر خلاف مشاہدہ کا شبہ کرتے ہیں فیثا غورس کے قول پر خلاف واقع ہونے کا شبہ نہیں ہوتا۔ اسلام کی عظمت قلوب سے جاتی رہی۔ غرض یہ ہے کہ نئے مذاق میں یہ خرابی ہو گئی ہے سائنس والے جو کہہ دیں اس پر آمنوا صدقنا (یعنی اس پر ہم ایمان لائے اور ہم نے اس کو سچ مان لیا) قرآن پر شبہات مگر وقت کے با وقعت ہونے میں تو فلسفہ و قرآن دونوں متفق ہو گئے کہ اس کی قسم کھانے سے خود اس کی وقعت پر دلالت ہو گئی۔ اب اس کو قاعدہ پر بھی منطبق کرنا چاہتا ہوں کہ مقسم دلیل ہوتی ہے جواب قسم کی سو یہاں جواب قسم میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان الانسان لفسى خسر انسان بڑے خسارے میں ہے۔ الا الذين امنوا و عملوا الصلحت و تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر یعنی خسارے سے وہ مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے اور ایک دوسرے کو حق اور استقلال کے لئے کہتے اور سنتے رہے۔ یہاں چار چیزیں ذکر فرمائیں ایمان اعمال صالحہ تو اسی بالحق اعتقاد حق پر ایک دوسرے کو قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہنا) تو اسی بالصبر (ایک دوسرے کو پابندی اعمال کی فہمائش کرتے رہنا) سبحان اللہ کیسی جامع تعلیم ہے اصل یہ کہ انسان جن امور کا مکلف ہوا ہے وہ دو قسم کے ہیں ایک اصول۔ ایک فروع۔ اول عقائد میں دوسرے اعمال اصول و فروع اس لئے کہلاتے ہیں کہ اصل مدار ایمان کا عقائد ہیں۔ پھر اس کا مکمل اعمال مثلاً ایک شخص ہے کہ وہ گورنمنٹ کے شاہانہ اقتدار کو مانتا ہے مگر ہمیشہ قانون کے خلاف عمل کرتا ہے۔ چوری بھی کرتا ہے جو ابھی کھیلتا ہے اور بد تہذیب بھی ہے ایسے شخص کے قلب میں چونکہ گورنمنٹ کا اقتدار ہے اس لئے اسے بغاوت کی سزا نہ ہوگی اور ہمیشہ کے لئے مردود نظر نہ ہوگا بلکہ صرف انتقام سزائے معین اور اس کے بعد پھر وہ گورنمنٹ کی محبوب رعایا میں داخل ہو جائے گا برخلاف اس شخص کے کہ جو نہایت مہذب و متین ہو اور افعال قبیحہ خلاف قانون سے بھی بچتا ہو مگر گورنمنٹ کے اقتدار شاہانہ کو تسلیم نہ کرتا ہو تو اس کو بغاوت کی سزا ہوگی کہ عبور دریائے شور کر دیا جائے گا یا پھانسی دے دیا جائے گا اور ہمیشہ کے لئے معتوب رہے گا۔

اے صاحبو! سمجھ لیجئے کہ اسی طرح اسلامی قانون بھی ہے کہ جس کے عقائد اچھے نہیں وہ باغی ہے اگرچہ نماز و روزہ کرے اور کیسا ہی شائستہ ہو ہمیشہ کے لئے مردود بارگاہ ایزدی ہوگا اگر توبہ نہ کرے۔

وقت کی قدر کرنا چاہیے

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک برف فروش سے مجھ کو بہت عبرت ہوئی وہ جا رہا تھا کہ اے لوگو مجھ پر رحم کرو کہ میرے پاس ایسا سرمایہ ہے کہ ہر لمحہ تھوڑا تھوڑا ختم ہو جاتا ہے اسی طرح کہ ہماری بھی حالت ہے کہ ہر لمحہ برف کی طرح تھوڑی تھوڑی ختم ہو جاتا ہے۔ اسے گھلنے سے پہلے بیچنے کی کرو کس کے ہاتھ؟ جس نے فرمایا ان

اللہ اشتری من المؤمنین انفسهم و اموالهم الخ

یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا کہ ان کو جنت ملے گی) اور اس عمر کو ضائع مت کرو۔

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست
 ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست
 (پیارے عمر ضائع و برباد کرنے کے لائق نہیں اس کو ضائع مت کرو اس کا سلسلہ اتنا دراز نہیں کہ اس کو فضولیات میں برباد کیا جائے)

والعصر ان الانسان لفی خسر

یہ ایک سورت چھوٹی سی ہے۔ گو الفاظ اس کے کم ہیں مگر اس میں مضمون بہت ضروری اور عام ضرورت کا ہے ویسے ہی جامع بھی ہے اور جامع اس معنی کر ہے کہ کوئی عمل اور کوئی حالت انسان کی ایسی نہیں جو فی الوقت نہ ہو اور اس وقت کے متعلق کوئی خاص حکم نہ ہو۔ اس واسطے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا حق جل شانہ نے اپنی سورت کو شروع کیا ہے ایک قسم کے ساتھ آگے اس کے جواب قسم ہے اور قسم کھائی ہے ایک ایسی چیز کی جس کی کوئی وقعت بھی عام قلوب میں نہیں۔ اس کی طرف کوئی خاص التفات بھی نہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو مخلوق کی قسم کھائی ہے وہ ایسی چیزیں ہیں جو نہایت قابل التفات اور مہتمم بالشان ہیں۔

اب رہا یہ کہ حق تعالیٰ نے اپنی سورت کو شروع کیا ہے ایک قسم کے ساتھ آگے اس کے جواب قسم ہے اور قسم کھائی ہے ایک ایسی چیز کی جس کی کوئی وقعت بھی عام قلوب میں نہیں۔ اس کی طرف کوئی خاص التفات بھی نہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو مخلوق کی قسم کھائی ہے وہ ایسی چیزیں ہیں جو نہایت قابل التفات اور مہتمم بالشان ہیں۔

اب رہا یہ کہ حق تعالیٰ نے اپنی قسم چھوڑ کر مخلوق کی قسم کیوں کھائی۔ یہ ایک نہایت عجیب اور حل طلب سوال ہے سو ہم مختصراً یہ کہیں گے کہ خدا کو اختیار ہے جو جی چاہے کرے آپ کون ہوتے ہیں ہاں اگر کوئی اس سوال کو یوں بدل کر کہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں غیر مخلوق کی قسم کھانے سے کیوں ممانعت کی۔ ممانعت تو اس چیز سے ہوا کرتی ہے جو بری ہو اور جو شے بری ہو حق تعالیٰ سے اس کا صدور کیسے ہو سکتا ہے البتہ اس عنوان سے سوال ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض چیزوں کا قبح بعینہ (اپنی ذات کے اعتبار سے) ہوتا ہے اور بعض کا لغیرہ (غیر کے اعتبار سے) ہوتا ہے۔ اور جو چیزیں قبیح بعینہ ہیں مثلاً زنا سرقت وغیرہ ان کی اجازت کسی کو نہیں ہوتی اور ان کا صدور حکیم سے بھی نہیں ہو سکتا اور بعض چیزیں قبیح لغیرہ ہیں۔ یعنی ان میں کوئی خاص مفسدہ ہے اور وہی مانع ہے اجازت سے۔ جب وہ مرتفع ہو جائے گا قبح بھی مرتفع ہو جائے گا۔

اس کی ایک مثال سمجھ لیجئے کہ مثلاً اذان جمعہ کے وقت بیع و شراء (خرید و فروخت) کرنا کہ اگر جمعہ کی طرف

چلتے ہوئے راہ میں بیع و شراء کریں تو جائز ہے۔ مگر افسوس ہمارے قصبہ میں عین جمعہ ہی کے وقت بازار لگتے ہیں شاید یہ کسی بڑے بوڑھے کی اچھی نیت تھی کہ گاؤں والے لوگ بھی آ کر نماز جمعہ میں شریک ہو سکیں گے۔ مگر حفظت شینا و غابت عنک اشیاء (ایک چیز کا تو خیال کیا اور بہت سی چیزوں کو نظر انداز کر دیا)

ایک چیز کا تو خیال کر لیا کہ نماز جمعہ میں شریک ہو سکیں گے مگر اس کا خیال نہ کیا کہ جب تک وہ گاؤں میں ہیں اس وقت تک ان پر جمعہ واجب نہیں۔ اگر جمعہ پڑھنے کے لئے یہاں نہ آئیں تو کچھ حرج نہیں اور جب یہاں آگئے تو ان پر جمعہ واجب ہو گیا۔ اب اگر نہ پڑھیں گے تو گناہگار ہوں گے اور اذان جمعہ کے وقت بیع و شراء کرنا بھی حرام ہے اس حرام میں بھی مبتلا ہوں گے خیر اہل علم اس مسئلہ کو تو خوب جانتے ہیں۔

مگر ایک شخص نے مجھ سے ایک اور مسئلہ اس کے متعلق پوچھا کہ کیا اذان جمعہ کے بعد کھانا پینا بھی حرام ہے۔ سو اس مسئلہ پر کسی کوالفتات بھی نہیں حالانکہ وہ بھی حرام ہے۔ جس کے بعد اہل علم اس پر ناز نہ کریں کہ ہم کو بیع سے سابقہ ہی نہیں پڑتا۔ اس لئے ہم اس آیت کے خلاف سے محفوظ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اذان جمعہ کے بعد جیسا بیع و شراء حرام ہے ویسا ہی کتاب دیکھنا بھی حرام ہے۔ پڑھانا بھی حرام ہے۔

رہا یہ کہ بعض اہل علم کو شاید شبہ ہو کہ قرآن میں تو ذر و البیع (خرید و فروخت ترک کرو) آیا ہے و ذر القراءۃ (پڑھنا ترک کرو) نہیں آیا ہے تو جناب فقہاء نے لکھ دیا ہے کہ تخصیص جریا علی العادۃ (بیع کی تخصیص قرآن پاک میں بیع کی عادت پڑنے کی وجہ سے) ہے۔ ورنہ حکم میں تخصیص نہیں حکم عام ہے۔ بیع صرف اس لئے حرام ہے کہ مخل سعى جمعہ ہے۔ تو جو چیز مخل سعى جمعہ ہو گئی وہ حرام ہے۔ ہاں جب یہ مانع مرتفع ہو جائے گا حرمت بھی مرتفع ہو جائے گی۔ مثلاً تو شخص چلتے چلتے ایک قلمندان کی بیع کریں تو چونکہ یہ بیع مخل سعى نہیں اس لئے حرام بھی نہ ہوگی۔ یہ بیع لغیرہ کہلاتی ہے۔

کمال دین دو باتوں پر موقوف ہے

سو اس سورت میں حق تعالیٰ نے اسی پر ہم کو متوجہ کیا ہے کہ جب تک تم دین کو کامل نہ کرو گے۔ خسارہ میں رہو گے اور دین کا کمال دو باتوں پر موقوف ہے۔ ایک اپنی تکمیل پھر دوسروں کی تکمیل۔ دوسروں کی تکمیل تو اسی اور تبلیغ سے ہوتی ہے اور اس کے دو محل ہیں۔ دونوں کو حق تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمایا ہے ایک کو لفظ حق سے اور دوسرے کو لفظ صبر سے اوپر میں نے ان دونوں کے اندر فرق بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اس کو پورا کرتا ہوں۔ حق کہتے ہیں امر مطابق للواقع کو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی خبر ہے۔ سو سمجھ لیجئے کہ اس سے مراد عقائد ہیں اور عقائد حقہ جس قدر ہیں۔ وہ سب اخبارات ہی ہیں۔

اللہ احد الرسول صادق والقیامۃ آتیۃ لاریب فیہا والجنۃ حق والنار حق والقدر حق وغیرہ وغیرہ اور صبر سے مراد اعمال ہیں۔ کیونکہ صبر کے معنی ہیں مضبوطی اور پختگی اور جس النفس علی من تکرہہ کہ

نفس کو ناگوار باتوں پر جمانا اور اس میں استقلال و پختگی پیدا کرنا اور مشقت و ناگواری اعمال ہی میں ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں کچھ کرنا پڑتا ہے۔ عقائد میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ ان میں تو صرف چند سچی باتوں کو جان لینا اور مان لینا ہے۔ اگر مشقت ہوتی ہے تو اپنے پہلے عقیدہ کے چھوڑنے میں ہوتی ہے۔ عقیدہ حقہ کے اختیار کرنے میں کوئی مشقت نہیں۔ مشکل اور دشواری اعمال میں ہوتی ہے اسی لئے ان کو صبر سے تعبیر کیا گیا۔ حاصل یہ ہوا کہ تو اسی اور تبلیغ عقائد کی بھی کرو اور اعمال کی بھی۔

حق اور صبر کی مراد

دوسری عبارت میں یوں کہئے کہ حق سے مراد اصول ہیں اور صبر سے مراد فروع ہیں۔ اسی کو میں نے پہلے کہا تھا کہ تبلیغ اصول بھی فرض ہے اور فروع بھی۔ یا یوں کہئے حق سے مراد علوم ہیں اور صبر سے مراد اعمال۔ اور اس میں بڑا لطیفہ یہ ہے کہ لفظ حق آمنا کے مناسب ہے اور لفظ صبر عملوا الصلحت کے مناسب ہے۔ جس چیز کو پہلے ایمان و عمل صالح کے عنوان سے بیان فرمایا تھا۔ اسی کو اس جگہ دوسرے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

اب قسم کی توجیہ بتلاتا ہوں جس کا میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا تو سمجھئے کہ قسم کے ساتھ تاکید کلام کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے اس کے نام کی عظمت کی وجہ سے قسم کھانے والا جھوٹ سے رکتا اور ڈرتا ہے۔ کہ اگر اس کا نام لے کر جھوٹ بولوں گا تو وبال میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ یہ صورت تو قرآن میں اللہ تعالیٰ کی کھائی ہوئی قسموں میں نہیں ہو سکتی کیونکہ مخلوق میں کوئی ایسا معظّم نہیں۔ جس کا نام لینا خدا تعالیٰ کو کسی امر سے مانع ہو۔ دوسری صورت تاکید بقسم کی یہ کہ مقسم بہ سے جواب قسم کی توضیح مقصود ہو۔ میں نے جہاں تک غور کیا۔ تو اقسام قرآن میں یہی صورت معلوم ہوئی کہ مقسم بہ کو جواب قسم کی توضیح میں بڑا دخل ہے اور یہ بہت بڑا علم ہے لیکن ہر مقام پر سیاق و سباق کو دیکھنا اور غور کرنا پڑتا ہے اور غور کرنے سے قسم و جواب قسم میں ارتباط معلوم ہو جاتا ہے۔ والذین جاہدوا فینا لنھدینھم سبلا مگر غور کرنے کی اس کو اجازت ہے جس کے پاس آلات اعتبار ہوں۔

چنانچہ اس کی ایک مثال اس وقت ذہن میں آئی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں والضحیٰ واللیل اذا سجی ما ودعک ربک وما قلی یہ سورت ایک بار کی قترۃ وحی کے بعد نازل ہوئی ہے اور قترۃ وحی قبل کی صورت ہے اور نزول وحی ببط ہے تو حق تعالیٰ دن اور رات کی قسم کھا کر فرماتے ہیں۔ کہ آپ کو اے محمد ﷺ خدا تعالیٰ نے نہ چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہے۔ اس قسم کو جواب قسم کی توضیح میں اس طرح دخل ہے کہ بتلا دیا۔ کہ قبض کو علامت غیر مقبولیت نہ سمجھو جیسا کہ بعض سالکین اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کہ نزول و اردات کو علامت رضا اور انسداد احوال و کیفیات کو علامت رد سمجھتے ہیں جیسا کہ دنیا والے قبض و بطن رزق کو بھی علامت رضا و عدم رضا کی سمجھتے ہیں۔ روزی والے کو سب لوگ بھاگوں کہتے ہیں اور تنگ دست کو منجوس اور بتلائے ادبار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ اس کی حکایت فرماتے ہیں۔

فاما الانسان اذا ما بتلاه ربه فاكرمه ونعمه فيقول ربى اكرمن - واما اذا ما بتلاه فقدر عليه رزقه فيقول ربى اهانن

اللہ تعالیٰ نے اس خیال کو سورہ والضحیٰ میں لیل و نہار کی قسم سے رفع فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قبض و بسط کی مثال لیل و نہار جیسی ہے بس جس طرح دن کے بعد رات کا آنا علامت رد نہیں۔ کیونکہ یہ غیر اختیاری بات ہے۔ اسی طرح بسط کے بعد قبض کا آنا علامت رد نہیں۔ اور جس طرح تعاقب لیل و نہار حکمت پر مبنی ہے۔ اسی طرح تعاقب قبض و بسط میں بھی حکمتیں ہیں۔ جیسے لیل و نہار کا تعاقب ناگزیر ہے کہ بدوں اس کے عالم کا انتظام درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح سالک پر قبضہ و بسط کا تعاقب ضروری ہے۔
الھکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر (الحکاثر آیت ص ۲۱) فخر کرنا تم کو غافل کئے رکھتا ہے یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو۔

قبروں کی پختگی پر قابل افسوس ہے

شیخ سعدی نے لکھا ہے نا کہ ایک رئیس زادے اور غریب زادے میں گفتگو ہوئی رئیس زادے نے کہا کہ دیکھو ہمارے باپ کی قبر کیسی عمدہ اور مضبوط ہے جس پر شان و شوکت برستی ہے اور تمہارے باپ کی قبر کچی اور شکستہ ہے جس پر بے کسی برستی ہے غریب زادہ نے کہا بیشک یہ فرق تو ہے لیکن قیامت کے دن میرا باپ تو قبر میں سے آسانی سے نکل آئے گا اور تمہارا باپ پتھر ہی ہٹانے میں رہے گا وہ اتنے چٹانوں اور پتھروں کو ہی ہٹاتا رہے گا میرا باپ جنت میں جا پہنچے گا کچھ ٹھکانا ہے اس تفاخر کا کہ قبروں کی پختگی پر بھی فخر کیا جاتا ہے۔ اسی کو تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے الھکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر (اے لوگوں تم کو تفاخر نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ گئے) زرتم المقابر کے یا تو یہ معنی ہیں کہ تم اس تفاخر ہی کی حالت میں قبروں میں پہنچ گئے یعنی مر گئے یا یہ کہ تم تفاخر کے لئے قبروں کو دیکھنے گئے۔ جاہلیت میں عرب کی عجیب حالت تھی بعض دفعہ جب دو قبیلے باہم فخر کرتے ایک کہتا کہ ہماری قوم زیادہ ہے دوسرا کہتا کہ ہمارا جتنا زیادہ ہے اور اس کے بعد مردم شماری ہوتی اور ان میں سے کوئی ایک قبیلہ شمار میں کم ہو جاتا تو وہ کہتا کہ ہمارے آدمی لڑائی میں زیادہ کام آئے ہیں اس لئے ہم کم ہو گئے ورنہ ہماری شمار زیادہ تھی دوسرا قبیلہ کہتا کہ یہ بھی غلط ہے تمہارے مردے ہمارے مردوں سے زیادہ نہیں ہیں اس کے فیصلے کے لئے قبروں کی شمار کی جاتی تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ تو کفار کی حالت تھی مگر افسوس آج کل مسلمانوں میں بھی یہ مرض پیدا ہو گیا ہے تو وہ قبروں کو شمار تو نہیں کرتے مگر ان کی پختگی اور خوبصورتی پر فخر کرتے ہیں چنانچہ اس لئے بعض لوگ خود اپنی قبر کے پختہ کرنے کی وصیت کر جاتے ہیں اس تفاخر ہی کی وجہ سے یہ تمام تکلفات پیدا ہوئے ہیں کہیں زیادہ روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے کہیں جھاڑ فائوس اور قندیل لٹکائے جاتے ہیں۔

سُورَةُ الْكَافِرُونَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا أَنْتُمْ

عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ۝ وَلَا أَنْتُمْ

عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينٌ ۝

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اے کافرو میں اس شے کی عبادت نہ کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم عبادت کرو گے اس شے کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں اس شے کی جس کی تم نے عبادت کی ہے۔ اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس شے کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے میرے لئے میرا دین۔

آج کل کی ایک بے ہودہ رسم

جیسا آج کل یہ بیہودہ رسم نکلی ہے کہ مسلمان کفار کے میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کو اپنی عید بقرعید کے موقع پر شریک کرتے ہیں یہ تو وہی قصہ ہے جیسا کہ اہل شرک نے حضور سے کہا تھا کہ اے محمد ہم اور آپ صلح کر لیں ایک سال آپ ہمارے دین کو اختیار کر لیں اور دوسرے سال ہم آپ کے دین کو اختیار کر لیں گے اسی وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں یعنی نہ میں تمہارا دین اختیار کروں گا اور نہ تم میرا دین قبول کرو گے۔ یہ بطور اخبار کے فرمایا پس لکم دینکم الخ کو اس تقریر پر منسوخ کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ پس کفار سے تو بالکل علیحدہ ہی رہنا چاہیے۔ یہاں چونکہ ایک جگہ رہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ آپس میں لڑیں نہیں باقی ان کے مذہبی میلے اور مجامع میں جانا بالکل بند کرنا چاہیے۔

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

بعض لوگوں نے ایک غلطی کی ہے کہ لکم دینکم ولی دین کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ تمہارے واسطے تمہارا دین ہے ہمارے واسطے ہمارا دین ہے اور یہ تفسیر کر کے اسی آیت کے حکم کو باقی سہی سمجھا ہے چنانچہ بعض صوفیہ نے اسی کو اپنا معمول بنا لیا اور صلح کل اپنا مذہب بنا لیا کہ موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود کسی سے لڑنے جھگڑے کی ضرورت نہیں مگر یہ استدلال اس لئے غلط ہے کہ اول تو یہاں دین بمعنی مذہب ہونا مسلم نہیں بلکہ بمعنی جزا ہونا محتمل ہے یعنی جیسا تم کرو گے ویسا بھرو گے پس لکم دینکم ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہتے ہیں کما تدين تदान اور اس صورت میں منسوخ ماننے کی بھی ضرورت نہ ہوگی اور اگر یہی تفسیر کی جاوے تو اس صورت میں یہ آیت منسوخ ہوگی۔

احتیاط خطاب

کاندھلہ میں ایک بار مولویوں کے مجمع میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کافر کو کافر کہنا کیسا ہے ایک جماعت یہ کہہ رہی تھی کہ تہذیب کے خلاف ہے اور ایک جماعت کہہ رہی تھی کہ جائز ہے کیونکہ قرآن میں بکثرت کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے پہلی جماعت نے اس کا یہ جواب دیا کہ قرآن میں خطاب کے موقعہ پر کافروں کو کافر نہیں کہا گیا (بلکہ یا ایہا الناس سے خطاب کیا گیا ہے) اور گفتگو اس میں ہے کہ کافر کو کافر کہہ کر خطاب کرنا کیسا ہے پھر ایک مولوی صاحب کو حکم بنایا گیا کہ اس اختلاف کا فیصلہ کریں انہوں نے کہا کہ قرآن میں خطاب کے موقعہ پر بھی کافروں کو کافر کہا گیا ہے قل یا ایہا الکافرون لا اعبدا ما تعبدون مگر میں اس محاکمہ کا بھی محاکمہ کرتا ہوں کہ قرآن میں کفار کو کافر کہہ کر بلا ضرورت خطاب نہیں کیا گیا اور جہاں اس لفظ سے خطاب کیا گیا ہے وہاں ضرورت تھی وہ یہ کہ ان ظالموں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بے ڈھنگی درخواست کی تھی کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کر لیا کریں ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کر لیا کریں گے اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی کہ ان سے فرما دیجئے کہ اے کافرو! میں تمہارے معبودوں کی پرستش نہ کروں گا نہ تم میرے معبودوں کی عبادت کرو گے نہ اب نہ آئندہ تو یہاں ان لوگوں کی امیدیں قطع کرنے کے لئے سختی کے ساتھ کافر کہہ کر ان کو خطاب کیا گیا ہے باقی آیات میں اس لفظ سے خطاب نہیں کیا گیا کیونکہ ضرورت نہ تھی پس فیصلہ یہ ہوا کہ خش خطاب بلا ضرورت نہ کرنا چاہیے ہاں ضرورت سے ہو تو جائز ہے۔ (المراۃ المہتممہ مواضع حقیقت مال و جاہ ص ۶۵)

سُورَةُ النَّصْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۗ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ

اللَّهِ أَفْوَاجًا ۗ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّكَ كَانَ تَوَّابًا ۝

ترجمہ: اے محمد ﷺ جب خدا کی مدد اور مکہ کی فتح (ملے اپنے آثار کے) آ پہنچے (یعنی واقع ہو جائے) اور (آثار جو اس پر متفرع ہونے والے ہیں کہ آپ لوگوں کو اللہ کے دین (یعنی اسلام) میں جوق در جوق داخل ہوا دیکھ لیں تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے استغفار کی درخواست کیجئے۔

تفسیری نکات

رسول اکرم ﷺ کے قرب وصال کی خبر

اس صورت میں حضور ﷺ کی خبر دی گئی ہے آپ کی وفات شریفہ کے قریب ہونے کی جیسا کہ اور نصوص میں بھی بکثرت اس کی خبر دی ہے مثلاً انک میت وانهم میتون اور وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم مگر ان میں مطلق وفات کی خبر ہے اور اس سورت میں اس کے قرب کی بھی خبر ہے جس میں بعض علامات کا ذکر کر کے ان علامات کے ظہور پر اس وقت کو بتلایا گیا ہے وہ علامت یہ ہیں کہ اذا جاء نصر الله والفتح (یعنی جب مدد الہی پہنچ جائے) اور مکہ فتح ہو جائے ورايت الناس يدخلون في دين الله افواجا. (یعنی آپ لوگوں کو جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں) اور ایک تفسیر پر جبکہ اذما مضی کے لئے ہو یعنی ہوں گے (کہ چونکہ نصرت و فتح معهود رویت و دخول افواج ہو چکی) چونکہ احادیث میں ہے کہ اس

سورت میں آپ کو قرب اجل کی خبر دی گئی ہے اور احادیث میں ان علامات کے علاوہ دوسری علامات بھی مذکور ہیں مثلاً اخیر سال میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مادہ رمضان میں قرآن کا دو مرتبہ عرض کرنا (یعنی دور کرنا) وغیرہ وغیرہ ان واقعات کے ظہور پر آگے آپ کو تیاری آخرت کی تاکید کی گئی ہے کہ اس وقت خدا تعالیٰ کی حمد و تسبیح اور استغفار میں مشغول ہو جائیے۔ یہ حاصل ہے بیان کا۔ اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ اس سورۃ کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا ہے اور اس کے نازل ہونے کے بعد حضور ﷺ دو برس اور زندہ رہے نزول سے پہلے تو ایک دو آدمی ہی روزانہ اسلام لاتے تھے اور فتح مکہ کے بعد دیہات کے دیہات اور ایک ایک دن میں ایک ہزار دو دو ہزار اسلام لانے لگے اور جب یہ خبر اچھی طرح پھیل گئی کہ مکہ والے مسلمان ہو گئے ہیں تو پھر قبائل عرب ایک دم سے امد پڑے اور جو لوگ بعد مسافت کی وجہ سے سب کے سب نہ آ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے وفود بھیجے کہ حضور کو جا کر ہمارے اسلام کی اطلاع کر دو اور وہاں سے احکام دریافت کر کے آؤ۔ چنانچہ اس لئے ۹ھ کو سیدہ الوفود کہتے ہیں اور اسی لئے آپ ۹ھ میں حج کو تشریف نہیں لے جاسکے حالانکہ فتح مکہ کے بعد حج فرض ہو گیا تھا کیونکہ اس سال آپ وفود کی تبلیغ و تکمیل میں مشغول تھے۔ پھر ۱۰ھ میں آپ نے حج ادا کیا جس میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ کے بعد ہوا اور ایک روایت یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں اس کا نزول ہوا ہے۔ ان سب روایتوں میں جمع اس طرح ہو سکتا ہے کہ نزول تو فتح مکہ سے پہلے ہوا ہو مگر حضور نے فتح مکہ کے بعد یا حج و داع میں کثرت تسبیح و تحمید کی وجہ بیان فرماتے ہوئے اس سورت کو تلاوت فرمایا ہو۔ راوی نے یہ سمجھا کہ ابھی نزول ہوا ہے مگر جن راویوں نے اس کا نزول فتح مکہ کے بعد متصل یا حج و داع میں مانا ہے۔ ان پر یہ اشکال وارد ہوگا کہ اس میں لفظ اذا ہے جو مستقبل کے لئے آتا ہے اس کا مقتضایہ ہے کہ نزول کے وقت فتح مکہ و دخول الناس افواجا کا وقوع نہ ہوا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اذا کبھی ماضی کے واسطے بھی آتا ہے جیسے قرآن میں بھی دوسری جگہ ہے حتیٰ اذا جعلہ ناراً اور حتیٰ اذا ساوی بین الصدفین تو پہلی تقریر پر تو ترجمہ یہ تھا کہ جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح مکہ ہو جائے اور آپ لوگوں کو جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو تسبیح و تحمید میں مشغول ہو جائیے اور دوسری تقریر پر ترجمہ یوں ہوگا کہ جب اللہ کی مدد آ چکی ہو اور لوگوں کو اسلام میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا آپ نے دیکھ لیا ہو تو اب آخرت کی تیاری کیجئے۔

یہ تو ترجمہ اور توجیہ تھی اقوال مفسرین کی۔ اب میں وہ نعمتیں بتلاتا ہوں جو حضور کو یا تبعاً امت کو سفر آخرت کی وجہ سے عطا ہوئیں اور اس سورت میں ان پر دلالت ہے۔ نزول کے وقت نہ فتح مکہ ہوانہ یدخلون فی دین اللہ

افواجاً کا ظہور ہوا تھا۔ اس سورت میں ان آیات میں پیشین گوئی ہے کہ ایسا ہونے والا ہے اس وقت سمجھ لیجئے۔
فتح مکہ پر اس مقصود کی تکمیل اس لئے موقوف تھی کہ عام لوگ اسلام لانے میں اہل مکہ کے اسلام کے منتظر
تھے کہ دیکھئے نبی کی قوم بھی ان کی اطاعت کرتی ہے یا نہیں کیونکہ عوام کی یہ طبعی بات ہے عقلاء کی تو نہیں کہ وہ
کسی شخص کے معتقد بننے میں یہ دیکھا کرتے ہیں کہ اس شخص کے خاندان اور بستی والے کچا چٹھا جانتے ہیں۔ وہ
ایسے ایسے شخص کے معتقد نہیں ہوا کرتے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ سچے آدمی کے بھی معتقد نہ ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا
کہ جھوٹے آدمی کے معتقد ہو جائیں۔ خصوصاً خاندان والے تو بہت دیر میں معتقد ہوتے ہیں کیونکہ ان میں
کوئی تو اس شخص کا چچا ہے کوئی ماموں ہے کوئی بھائی بھتیجا ہے جن کو مساوات کا یا ناز کا دعویٰ ہوتا ہے یا بزرگی کا وہ
اپنے سے چھوٹے یا برابر کی اطاعت جبری کر سکتے ہیں جبکہ کھلم کھلا کوئی ایسی بات دیکھ لیں جو ان کی اطاعت پر
مجبور کر دے۔ مگر اس پر عوام ہی کی نظر ہوتی ہے کہ خاندان والوں کا کیا خیال ہے باقی عقلاء کو کسی کے اعتقاد اور
عدم اعتقاد پر نظر نہیں ہوتی بلکہ وہ تو کمالات کو دیکھتے ہیں اگر ایک شخص میں کمالات موجود ہوں۔

چاہے خاندان اور بستی ہی کیا ساری دنیا بھی اس کی مخالفت کرتی ہو تب بھی معتقد ہو جاتے ہیں۔
چنانچہ عقلاء صحابہ نے ایسا ہی کیا کہ انہوں نے اہل مکہ یا حضور کے قرابت داروں کی اطاعت کا مطلق
انتظار نہیں کیا۔ بعض تو ایسے وقت اسلام لائے تھے کہ حضور کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا اور بعض نے ایسے وقت
اطاعت اختیار کی کہ آپ کے ساتھ دو چار آدمی تھے البتہ عام لوگ اس کو دیکھتے ہیں کہ خاص بستی والے اور
خاندان والے کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ کیونکہ عوام کی نظر کمالات تک نہیں پہنچتی۔ اس لئے وہ ایسے قرآن کا
انتظار کیا کرتے ہیں اسی قاعدہ کے مطابق عام طور پر اہل عرب کو اہل مکہ کے اسلام کا انتظار تھا کیونکہ وہاں آپ
کی برادری تھی اور اسی لئے کم لوگ مسلمان ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور رسول ﷺ مکہ میں
غالب ہو کر داخل ہوئے تو اس وقت بہت سے اہل مکہ مسلمان ہو گئے اور بعض نے غور و تامل کے لئے مہلت مانگی
تو ان کو چار مہینے یا اس سے زائد کی مہلت دی گئی۔ کہ اس مدت میں یا اسلام لے آئیں یا مکہ سے نکل جائیں
اسی وقت مکہ دارالاسلام ہو گیا اور چند روز میں وہاں ایک بھی کافر نہ رہا۔ اس وقت عام طور پر اہل عرب جو ق در
جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔

بشارت تکمیل دین

سو اس پر تو سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سورۃ کا نزول سفر آخرت کی تیاری کے لئے ہوا ہے اور اس کو
متعلق کیا گیا ہے چند علامات پر جو کہ اس جگہ مذکور ہیں یعنی نصرو فتح مکہ و رویت دخول الناس فی الدین۔ تو
ایک نعمت تو یہ ہوئی کہ آپ کا سفر آخرت سبب ہو گیا شیوع اسلام کا۔ گویا ہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیوع

اسلام آپ کے سفر آخرت کا سبب ہوا کیونکہ سلاطین کی عادت بھی یہی ہے کہ کسی افسر کو کسی کام کی تکمیل کے لئے بھیجتے ہیں کام پورا ہونے کے بعد اس کو اپنے پاس بلا لیتے ہیں اور دلالت لفظ سے بھی یہی متبادر ہے۔ چنانچہ یہاں لفظ اذا یہی بتلا رہا ہے کیونکہ اذا تعلق کے لئے ہے تو محضی نصر فتح مکہ وغیرہ معلق علیہ ہے اور تیاری آخرت معلق اور ظاہر ہے کہ معلق علیہ سبب ہوا کرتا ہے معلق کا لیکن اگر نظر کو گہرا کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ واقع میں یہاں معلق سبب ہے معلق علیہ کا آگے اس کی دلیل آتی ہے۔ سو اس بناء پر یہاں معلق علیہ محض علامات کے درجہ میں ہوگا۔ اس کو معلق کے ساتھ سببیت یا علیت کا تعلق نہیں ہوگا۔

بس اس کی مثال بالکل ایسی ہے (جیسے ہم کسی کو کہیں بھیج کر اس سے کہہ دیں کہ جس وقت ہم جھنڈی ہلا دیں اس وقت واپس چلے آنا تو ظاہر میں تو جھنڈی کے ہلنے کو دخل ہے اس شخص کی واپسی میں مگر حقیقت میں اس کی واپسی کو جو کہ اصل مقصود ہے دخل ہے جھنڈی کے ہلنے میں اور اس کی دوسری مثال یہ ہے)

جیسے کوئی بادشاہ ایک انجینئر کو جو کہ اس کا محبوب و مقرب ہے کسی جگہ بھیجے کہ وہاں جا کر ایک نہر کھدواؤ جس سے تمام ملک کو سیرابی حاصل ہو وہ گیا اور وہاں جا کر اس نے اپنے عملہ کے ساتھ کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ چند روز کے بعد بادشاہ کو اس کا اپنے پاس جلد لانا مقصود ہوا۔ اس لئے ایک بہت بڑا عملہ اس کام کی تکمیل میں اس کی امداد کیلئے اس کی ماتحتی میں بھیج دیا جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں نہر کو کھود کر اور انجینئر کے حکم اور نقشہ کے مطابق بنا سنوار کر درست کر دیا اور اس نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ حضور کا کام پورا ہو گیا وہاں سے حکم ہوا کہ اچھا اب تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ تو ظاہر میں تو تکمیل نہر کی اس کے بلانے کا سبب ہوا مگر حقیقت میں بادشاہ کا اس کو بلانا تکمیل نہر کا سبب ہوا۔ اگر وہ اس کو جلدی بلانا نہ چاہتا تو دوسرا عملہ کیوں بھیجتا۔

اب اس کی تحقیق باقی ہے جب تعلق میں دونوں صورتیں ہوتی ہیں تو یہاں دونوں احتمال ہوئے ایک کی تعین کی کیا دلیل؟

جواب یہ ہے کہ قرآن سے تعین ہو جاتی ہے یہاں آپ کی محبوبیت قرینہ مرتجہ ہے اس احتمال کا۔ چنانچہ اوپر بیہقی کی حدیث میں حضرت جبریل علیہ السلام کا مقولہ یا محمد ان الله قد اشتاق الی لقائک اس پر صریح دال ہے کہ بلانے کا سبب اشتیاق ہے۔ تو بلانا جن اسباب پر موقوف تھا ان کی تکمیل بھی اس اشتیاق کے سبب فرمائی۔ تو سبب ہوا بلانا اذا جاء نصر الله والفتح یہ ایک سورت ہے جو حضور اکرم ﷺ کی آخری عمر میں نازل ہوئی ہے جس کا مدلول ظاہری تو رسول ﷺ کا نعمت فائضہ پر مکہ کے مقابلہ میں مطالبہ شکر ہے کہ ایک بڑی نعمت یعنی فتح مکہ آپ کو عطا ہونے والی ہے یا ہو چکی ہے اس پر شکر کا مطالبہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ نعمت عطا ہو اس وقت شکر کیجئے یا یہ کہ وہ نعمت کاملہ چونکہ فائض ہو چکی ہے اس لئے شکر کیجئے۔ یا کلمہ

تردد میں نے اس واسطے کہا ہے کہ مفسرین کو اس میں گفتگو ہے کہ اس میں اذا مستقبل کے لئے ہے یا ماضی کے لئے جیسے اذا ساوی بین الصدقین اور اذا جعلہ نارا میں اور اس کا منشا یہ ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا ہے یا بعد میں۔ مدلول ظاہری کلی تو سورت شریفہ کا یہ ہے اور مدلول خفی یہ ہے کہ جب آپ کی عمر ختم ہو جائے یعنی قریب ختم ہو جائے تو حمد و تسبیح میں مشغول ہو جائے اور واسطہ اس ولادت کا یہ ہے کہ جب آپ کے فیوض کی تکمیل ہو جائے جس کی طرف اذا جاء نصر اللہ و رایت الناس میں اشارہ ہے تو اس وقت طاعت میں زیادہ مشغول ہو جائے کیونکہ شکر و حمد بھی عنوان طاعت ہی ہے صرف عنوان کا تفاوت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت آخرت کی خاص تیاری کیجئے۔

تبت یدا ابی لہب و تب (ابولہب بربادہ ہو جو) ما اغنی عنہ مالہ و ما کسب (اور اس بربادی سے نہ اس کا مال بچا سکتا ہے نہ اس کی کمائی و امرء تہ حمالة الحطب (اور اس کی بیوی لکڑیاں چننے والی ہے) بعض لوگوں نے تو اس کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ اس سے اس کا اظہار بخل مقصود ہے کہ باوجود مال و دولت کے پھر بھی اتنی کنجوس ہے کہ لکڑیاں خود چن کر لاتی ہے عرب میں بخل کو زنا سے بھی زیادہ قبیح سمجھتے تھے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ یہ جنگل سے خاردار لکڑیاں چن کر لاتی تھی اور حضور کے راستہ میں بچھا دیتی تھی تاکہ آتے جاتے آپ کو تکلیف ہو۔

سُورَةُ الْفَلَقِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝

ترجمہ: آپ کہیے کہ میں ان عورتوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو گرہوں پر پڑھ کر پھونک مارنے والی ہیں۔

تفسیری نکات

حضور علیؑ پر سحر کئے جانے کا واقعہ

یہودیوں میں سحر (جادو) کا بہت چرچا تھا۔ اور وہ اس میں بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر بھی سحر کیا تھا اور وہ لبید کی بیٹیوں نے سحر کیا تھا۔ جس کا اثر بھی حضور ﷺ پر ہو گیا تھا۔ پھر وحی کے ذریعہ آپ کو مطلع کیا گیا کہ آپ پر فلاں شخص نے سحر کیا ہے۔ چنانچہ سورہ فلق میں اس طرف اشارہ ہے: وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ”آپ کہیے کہ میں ان عورتوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، جو گرہوں پر پڑھ کر پھونک مارنے والی ہیں“۔

گرہوں پر پھونک مارنے کی تخصیص اس لئے ہے کہ حضور پر جو سحر ہوا تھا وہ اسی قسم کا تھا کہ ایک تانت کے ٹکڑے میں گیارہ گرہیں دی گئی تھیں اور گرہ پر کلمات سحر کو دم کیا گیا تھا۔ اور عورتوں کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس واقعہ میں عورتوں ہی نے سحر کیا تھا۔ دوسرے کچھ تجربے سے اور نیز علم طبعی کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا سحر بہ نسبت مردوں کے زیادہ موثر ہوتا ہے کیوں کہ سحر میں قوت خیالی کو زیادہ اثر ہے خواہ سحر حلال ہو یا سحر حرام۔ (تیم، نسیم، تبلیغ)

جادو کی دو قسمیں اور ان کا شرعی حکم

سحر (جادو) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سحر حرام۔ اور محاورات (یعنی اصطلاح میں اکثر اسی پر سحر کا اطلاق ہوتا ہے۔ دوسرے سحر حلال جیسے عملیات اور عزائم اور تعویذ وغیرہ کہ لغتاً یہ بھی سحر کی قسم میں داخل ہے۔ اور ان کو سحر حلال کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعویذ و عزائم (عملیات) وغیرہ مطلقاً جائز نہیں بلکہ اس میں بھی تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر اس میں اسماء الہی سے استعانت (مدد حاصل کرنا ہو) اور مقصود بھی جائز ہو تو جائز ہے اور اگر مقصود ناجائز ہو تو حرام ہے۔

اور اگر شیاطین سے استعانت (مدد حاصل کرنا) ہو تو مطلقاً حرام ہے۔ خواہ مقصود اچھا ہو یا برا۔ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ جب مقصود اچھا ہو تو شیاطین کے نام سے بھی استعانت (مدد حاصل کرنا) جائز ہے یہ بالکل غلط ہے۔ خوب سمجھ لو۔ (التبلیغ)

قرآنی سورتوں کے موکلوں کا کوئی ثبوت نہیں

بعض لوگوں نے موکلوں کے نام عجیب عجیب گھڑے ہیں۔ کلکائیل، دردائیل اور اسی طرح اس کے وزن پر بہت سے نام ہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ ان ناموں کو سورہ فیل کے اندر ٹھونسا ہے۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيلِ يَا كَلْكَائِيلِ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ يَا ذُرْدَائِيلِ.

یہ سخت واہیات ہے۔ اول تو یہ نام بے ڈھنگے ہیں نہ معلوم کلکائیل کہاں سے ان لوگوں نے گھڑا ہے۔ بس یہ لوگ رات دن کل کل ہی میں رہتے ہوں گے۔ پھر ان کو قرآن میں ٹھونسا یہ دوسرا بے ڈھنگا پن ہے اور نہ معلوم یہ موکل ان لوگوں نے کہاں سے تجویز کئے ہیں۔ یہ سب محض خیالات ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ اس کا مصداق معلوم ہوتے ہیں۔ اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ. (تیم تمیم)

سحر جادو وغیرہ سے حفاظت کی اہم دُعاء

بعض دعائیں ایسی ہیں کہ سحر (جادو) وغیرہ کے اثر سے محفوظ رکھتی ہیں۔

حضرت کعب الاحبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ چند کلمات کو اگر میں نہ کہتا رہتا تو یہود (سحر و جادو سے) مجھ کو گدھا بنا دیتے۔ کسی نے پوچھا وہ کلمات کیا ہیں انہوں نے یہ بتلائے:

اَعُوْذُ بِوَجْهِ الْعَظِيْمِ الَّذِي لَيْسَ شَيْءٌ اَعْظَمَ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُھُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَّبِاسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰی مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَّمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَّزُرّاً

وَبِرًّا. (روایت کیا ہے اس کو مالک نے جزء الاعمال)

یہ دعاء کم از کم صبح و شام پابندی سے تین تین مرتبہ پڑھ کر دم کر لیا کریں انشاء اللہ مکمل حفاظت رہے گی۔

آسیب لپٹ جانا

ان آیتوں کو پڑھ کر بیمار کے کان میں دم کرے اور پانی پڑھ کر اس کو پلاوے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنْمَّا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّانَكُمْ اِلٰنَا لَا تُرْجَعُونَ فَتَعَالٰى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ وَمَنْ يُّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهِ فَاِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُونَ وَقُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَاَرْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ. اور سورۃ وَالسَّمَاوٰتِ وَالطَّارِقِ سات بار کان میں دم کرنا اور داہنے کان میں اذان اور بائیں میں تکبیر کہنا بھی آسب کو بھگا دیتا ہے۔

آسیب اور جادو

اگر کسی پر آسب کا شبہ ہو تو آیات ذیل لکھ کر مریض کے گلے میں ڈالیں اور پانی پر دم کر کے مریض پر چھڑک دیں اور اگر گھر میں اثر ہو تو ان کو پانی پر پڑھ کر گھر کے چاروں گوشوں میں چھڑک دیں۔ آیات یہ ہیں۔

(۱) بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَا لِكُ يَوْمَ الدِّيْنِ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ

(۲) اَلَمْ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ وَمَا اَنْزَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(۳) وَاللّٰهُمَّ اِلٰهَ وَاَحَدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ

(۴) اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهٗ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا نَقْصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ط اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

أُولَئِنَّهُمْ الطَّاغُوثُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلْمَةِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ
 (۵) لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِنْ تُبَدُّوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفَوُهُ يُحَاسِبُكُمْ بِهِ اللَّهُ
 فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ أَمَّا الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِنْ
 رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَكَيْتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا
 وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا
 مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى
 الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا
 فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ

(۶) شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ
 الْحَكِيمُ

(۷) إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي
 اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِلَّا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ
 تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ

(۸) فَتَعَلَّى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ
 لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ وَقُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ
 الرَّاحِمِينَ

(۹) وَالصَّفَاتِ صَفًا قَالَ الرَّاجِرَاتِ زَجْرًا فَالتَّلِيَتْ ذِكْرًا إِنَّ إِلَهُكُمْ لَوَاحِدٌ رَبُّ السَّمَوَاتِ
 وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ إِنَّا زَيْنَا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِزَيْنَةٍ نِ الْكَوَاكِبِ وَحِفْظًا مِنْ كُلِّ
 شَيْطَانٍ مَارِدٍ لَا يَسْمَعُونَ إِلَى الْمَلَاءِ الْأَعْلَى وَيَقْدِفُونَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُخُورًا وَلَهُمْ عَذَابٌ
 وَأَصِيبٌ إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاتَّبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ فَاسْتَفْتِهِمْ أَهْمُ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ مَنْ خَلَقْنَا إِنَّا
 خَلَقْنَا هُمْ مِنْ طِينٍ لَازِبٍ

(۱۰) هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ هُوَ اللَّهُ
 الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيَّبُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ
 سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِي الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي
 السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

- (۱۱) وَأَنَّهُ تَعَلَىٰ جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا .
- (۱۲) قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ .
- (۱۳) قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ .
- (۱۴) قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلَهِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ .

حرز ابی دجانہ

ایضاً۔ کلمات ذیل کو لکھ کر مریض کے گلے میں ڈال دیا جائے (اس عمل کا نام حرز ابی دجانہ ہے) نہایت مجرب ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ هٰذَا كِتَابٌ مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اِلٰی مَنْ طَرَقَ الدَّارَ مِنْ الْعُمَّارِ وَالزُّوَّارِ وَالسَّائِحِیْنَ اِلَّا طَارِقًا یَطْرُقُ بِخَیْرِ یَا رَحْمٰنُ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ لَنَا وَلَكُمْ فِی الْحَقِّ سَعَةٌ فَاِنْ تَكَّ عَاشِقًا مَوْلَعًا اَوْ فَاجِرًا مُّقْتَحِمًا اَوْ رَاعِیًا حَقًّا مُبْطِلًا هٰذَا كِتَابُ اللّٰهِ یَنْطِقُ عَلَیْنَا وَعَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَسِخُّ مَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَتْرَكُوْا صَاحِبَ كِتَابِیْ هٰذَا وَانْطَلِقُوْا اِلٰی عِبَادَةِ الْاَوْثَانِ وَالْاَصْنَامِ وَاِلٰی مَنْ یَزْعَمُ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ لَهٗ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ تُقَلَّبُوْنَ حَمًّا لَا تَنْصُرُوْنَ حَمْعَسَقَ تَفْرُقْ اَعْدَاءَ اللّٰهِ وَبَلَّغْتَ حُجَّةَ اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فَسَيَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ . اس کو لکھ کر گلے میں ڈال دیا جائے۔

ایضاً۔ اگر آسب کا اثر گھر میں معلوم ہو تو آیات ذیل پچیس بار چار کیلوں پر پڑھ کر گھر میں چاروں کونوں میں گاڑ دیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّهُمْ یَكْفُرُوْنَ كِبْرًا وَّاَكْبَدُ كَبْرًا فَمَهْلِكِ الْكٰفِرِیْنَ اَمْهَلْهُمْ رُوْبَدًا .

برائے دفع سحر

آیات ذیل لکھ کر مریض کے گلے میں ڈال دیں اور پانی پر پڑھ کر اس کو پلاویں، اگر نہہلانا نقصان نہ کرتا ہو تو ان ہی آیات کو پانی پر پڑھ کر اس سے مریض کو نہلا دیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فَلَمَّا الْقَوْا قَالَ مُوسٰی مَا جِئْتُمْ بِهٖ السَّحْرِ اِنَّ اللّٰهَ سَبَّطِلْهُ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِلُّحْ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ وَیُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِہٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ اور قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ اور قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلَهِ النَّاسِ

النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَأَسْوَاسِ الْخَنَاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ .

سحر کے لئے

۱۔ فَلَمَّا أَلْقَا قَالَ مُوسَى مَا حَفِظْتُكُمْ بِهِ ۖ التَّيْحُورُ إِنَّ اللَّهَ سَبَّطَلُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِلُّ عَمَلِ الْمُتَّقِينَ ۗ
وَيُحَقِّقُ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۗ
(پارہ ۱۱، رکوع ۱۳)

ترجمہ: سو جب انہوں نے (اپنا جادو کا سامان) ڈالا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ جو کچھ تم (بنا کر) لائے ہو جادو ہے یعنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (جادو) کو درہم برہم کئے دیتا ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے فساد یوں کا کام بنے نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ دلیل صحیح (یعنی معجزہ) کو اپنے وعدوں کے موافق ثابت کر دیتا ہے جو مجرم (اور کافر) لوگ کیسا ہی ناگوار سمجھیں۔
خاصیت: سحر کیلئے بہت مجرب ہے جس پر کسی نے سحر کیا ہو ان آیتوں کو لکھ کر اس کے گلے میں ڈالے یا پشتری پر لکھ کر پلائے انشاء اللہ تعالیٰ صحت یاب ہو جائے گا۔

۲۔ يٰۤاٰدَمُ خُذْ زِينَتَكَ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۗ
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ ۖ وَالطَّيِّبَاتُ مِنَ الرِّزْقِ ۗ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ كَذٰلِكَ نَفْصَلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ ۗ
قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَفِي الْقَوَاحِش مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ۖ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ وَاَنْ تُكُوْلُوْا اٰلِهٰتِكُمْ مَّا لَمْ يُنَزَّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۗ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلٰى
اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۗ (پارہ ۸، رکوع ۱۱)

ترجمہ: اے آدم کی اولاد تم مسجد کی حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے حد سے نکل جانے والوں کو، آپ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے چیزوں کو جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے۔ آپ یہ کہہ دیجئے کہ یہ اشیاء اس طور پر کہ قیامت کے روز بھی خالص رہیں۔ دنیوی زندگی میں خالص اہل ایمان ہی کیلئے ہیں۔ ہم اسی طرح تمام آیات کو سمجھداروں کے واسطے صاف صاف بیان کیا کرتے ہیں۔ آپ فرمائیے کہ البتہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو ان میں جو پوشیدہ ہیں وہ بھی اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے اور اس بات کو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا دو جس کی تم سند نہ رکھو۔

خاصیت: یہ آیت زہر و چشم و بدو سحر کے دفع کیلئے مفید ہے جو شخص اس کو انگور سبز کے عرق اور زعفران سے لکھ کر اولے کے پانی سے دھو کر غسل کرے چشم بد اور جادو اس سے دفع ہو اور جو کھانے میں ملا کر کھائے تو زہر سے مامون رہے اور سحر اور نظر بد سے بھی۔

۳۔ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُوسَى الْقَوْمَ مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ۖ فَلَمَّا أَلْقَوْا قَالَ مُوسَى مَا جِئْتُمْ بِهِ

السَّحْرَ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِلُّ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۳﴾ (پارہ ۱۱، رکوع ۱۳)

ترجمہ: سو جب وہ آئے (اور موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ ڈالو جو کچھ تم کو (میدان میں) ڈالنا ہے سو جب انہوں نے (اپنا جادو کا سامان) ڈالا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کچھ تم (بنا کر) لائے ہو جادو ہے۔ یعنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (جادو) کو ابھی درہم برہم کئے دیتا ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے فساد یوں کا کام بننے نہیں دیتا۔

خاصیت: سخت جادو کے دفع کرنے کیلئے نافع ہے ایک گھڑا بارش کے پانی کالے کر ایسی جگہ سے جہاں برسنے کے وقت کسی کی نظر نہ پڑی ہو اور ایک گھڑا ایسے کنوئیں کے پانی کالے جس میں سے کوئی پانی نہ بھرتا ہو پھر جمعہ کے روز ایسے درختوں کے سات پتے لے جن کا پھل نہ کھایا جاتا ہو۔ پھر دونوں پانی ملا کر اس میں ساتوں پتے ڈال دے پھر ان آیتوں کو کاغذ پر لکھ کر اس پانی سے دھو کر مسحور کو کنارہ دریا پر لے جا کر پانی میں اس کو کھڑا کر کے رات کے وقت اس پانی سے اس کو غسل دیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ سحر باطل ہو جائے گا۔

وسوسہ شیطانی

۱۔ وَإِنَّمَا يَنْزِعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعًا فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۳﴾ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا

مَنْهُمُ ظَلَمَ مِنْ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ﴿۱۴﴾ (پارہ ۹، رکوع ۱۳)

ترجمہ: اور اگر آپ کو کوئی وسوسہ شیطانی کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے۔ بلاشبہ وہ خوب سننے والا ہے۔ یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطانی کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

خاصیت: جس کو وساوس اور خطرات و خیالات فاسدہ اور لرزہ قلب نے عاجز کر دیا ہو۔ ان آیات کو کلام وزعفران سے جمعہ کے روز طلوع شمس کے وقت سات پرچوں پر لکھ کر ہر روز ایک پرچہ نکل جائے اور اس پر ایک گھونٹ پانی کاپی لے انشاء اللہ تعالیٰ دفع ہو جائے گا۔

فائدہ: احادیث میں آیا ہے کہ وسوسہ کے وقت اَمَنْتُ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ کہے یا اَعُوذُ بِاللَّهِ پڑھ کر بائیں جانب تین مرتبہ تھکا کرنا آیا ہے۔ اَمَنْتُ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ پڑھے اس سے کسی کو نجات نہیں ہوتی اس کا غم نہ چاہیے۔ يَا لَآ اِلَهَ اِلَّا اللَّهُ بکثرت پڑھے۔ ابوسلیمان دارانی نے عجیب تدبیر بتلائی ہے کہ جب وسوسہ آئے خوب خوش ہو۔ شیطان کو مسلمان کا خوش ہونا سخت ناگوار ہے وہ پھر وسوسہ نہ ڈالے گا۔

سُورَةُ النَّاسِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلَهِ النَّاسِ ۝

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي

صُدُورِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

جادو کی کاٹ کے لئے معوذتین کا عمل

۱- قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس تین تین بار پانی پر دم کر کے مریض کو پلاویں اور زیادہ پانی پر دم کر کے اس پانی میں نہلا دیں اور یہ دعا چالیس روز تک روزمرہ چینی کی تشری پر لکھ کر پلایا کریں۔ یا حییٰ حییٰ لا حییٰ فی ذیئومۃ ملکہ وبقائہ یا حییٰ انشاء اللہ تعالیٰ جادو کا اثر جاتا رہے گا اور یہ دعا ہر اس بیمار کے لئے بھی بہت مفید ہے جس کو حکیموں نے جواب دیدیا ہے۔

۲- اکثر عوام اور خصوصاً عورتیں چیچک (اسی طرح بعض اور امراض) کے علاج کرانے کو برا سمجھتی ہیں۔ اور بعض عوام اس مرض کو بھوت پریت کے اثر سے سمجھتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔

۳- بعض عوام سمجھتے ہیں کہ جو کوئی قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ کا وظیفہ پڑھے اس کا ناس ہو جاتا ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس کی برکت سے تو وہ مصیبتوں سے نجات پاتا ہے۔

۴- اور بعض عوام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر جمعرات کی شام کو مُردوں کی روئیں اپنے اپنے گھروں میں آتی ہیں، اور ایک کونے میں کھڑی ہو کر دیکھتی ہیں کہ ہم کو کون ثواب بخشا ہے؟ اگر کچھ ثواب ملے گا تو خیر، ورنہ مایوس ہو کر لوٹ جاتی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ (اغلاط العوام)

بِسْمِ اللَّهِ

رسالة و هبزة و مفيدة في ربط الآيات

سبق الغايات في نسق الآيات

تأليف

حضرت حكيم الأمت مجده الملت جامع الكلمات منبع الحسنات ماهر العلوم القرآنية، واقف الأسرار الفرقانية،
راس المفسرين مقدم الراسخين صامب الشريعة والطريقة، بحر المعرفة والحققة، كاشف الأسرار النفي منها والجلوى اعنى به

مولانا محمد اشرف على التهانوى

نور الله مرقده وجعل الجنة مشواه

سورة الزخرف

قال المسكين افتتح الله هذه السورة باثبات النبوة باثبات كون القرآن منزلا من الله تعالى مع الوعيد للمنكرين ولئن سالتهم الخ قال المسكين اثبات للتوحيد مع الاشارة الى البعث اثرا لاثبات النبوة وجعلوا له من عباده الخ توبيخ على اشراكهم باثبات الجزء له تعات و اثبات البنات له تعات لاسما جعل الملائكة بنات له وقالوا الوشاء الرحمن الخ اعلم انه تعالى حكى اخر من كفرهم وشبهاتهم و اذ قال ابراهيم الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآية انه ليس لاولئك الكفار داع يدعوهم الى تلك الاقاويل الباطلة الاتقليد الأباء والاسلاف ثم بين انه طريق باطل ومنهج فاسد وان الرجوع الى الدليل لولى من الاعتماد على التقليد اردو فبهذه الآية والمقصود منها ذكر وجه اخريدل على فساد القول بالتقليد و تقريره انه تعالى حكى عن ابراهيم عليه السلام انه تبرع عن دين اباءه ه

كان خاتمة السورة التي قبلها في اثبات التوحيد والنبوة فكذا فاتحة هذه السورة في

اثبات الامرين ۱ ۲ منه عفى عنه

بناء على الدليل ثم قال تعالى بل متعت هؤلاء الخ وجه النظم انهم لما عولوا على تقليد الأباء ولم يتفكروا في الحجة اغتروا بطول الامهال وامتاع الله اياهم بنعيم الدنيا فاعرضوا عن الحق وقالوا لولا نزل هذا القرآن الخ اعلم ان هذا من كفر ياتهم التي حكاها الله تعالى عنهم في هذه السورة ثم ابطل الله تعالى هذه الشبهة ولولا ان يكون الخ اعلم انه تعالى اجاب عن الشبهة التي ذكروها بناء على تفضيل الغنى على الفقير وهو انه تعالى بين ان منافع الدنيا و طيباتها حقير خسيمة عند الله. و من يعيش عن ذكر الرحمن الخ المراد منه التنبيه على افات الدنيا و ذلك ان من فاز بالمال والجاه صار كالا عشى عن ذكر الله و من صار كذلك صار من جلساء الشياطين الضالين المضلين افانت تسمع الصم الخ اعلم انه تعالى لما و

صفهم في الآية المتقدمة بالعشى و صفهم في هذه الآية بالصم والعمى فاما نذهبن بك الخ اعلم ان هذا الكلام يفيد كمال التسلية للرسول عليه السلام لانه تعالى بين انهم لا توتر فيهم دعوة والياس احدى الراحيتين ثم بين انه لا بدو ان ينتقم لاحله منهم اما حال حياته او بعد وفاته و ذلك ايضا يوجب التسلية فبعدها امره ان يتمسك بما امره الله تعالى فقال فاستمسك بما اوحى اليك الخ و لما بين تاثير التمسك بهذا الذين في منافع الدين بين ايضا تاثيره في منافع الدنيا فقال وانه لذكر لك الخ و اعلم ان السبب الاقوى في انكار الكفار لرسالة محمد صلى الله عليه وسلم و لبغضهم له انه كان ينكر عبادة الاصنام فبين تعالى ان انكار عبادة الاصنام ليس من خواص دين محمد صلى الله عليه وسلم بل كل الانبياء و الرسل مطبقين على انكاره فقال و اسأل من ارسلنا الخ قوله تعالى و لقد ارسلنا موسى الخ اعلم ان المقصود من اعادة قصة موسى عليه السلام و فرعون في هذا المقام تقرير بر الكلام الذي تقدم و ذلك لان كفار قريش طعنوا في نبوة محمد صلى الله عليه وسلم بسبب كونه فقيرا عديم المال و الجاه فبين الله تعالى ان موسى عليه السلام بعد ان اورد المعجزات القاهرة الباهرة التي لا يشك على صحتها عاقل اورد فرعون عليه هذه الشبهة التي ذكرها كفار قريش و لما ضرب ابن مريم الخ قال المسكين حكاية لقصة عيسى عليه السلام اثر قصة موسى عليه السلام و المقصود تقرير امر التوحيد ببيان كونه عليه السلام عبدا و الجواب عن الشبهة التي تمسك بها النصارى من كون خلقه ابدع ببيان كون الملائكة في خلقهم ابدع و كونهم مع ذلك عباد الله تعالى مقهورين مسخرين قابلين لتصرفه تعالى فيهم مع الاشارة في اثناء الكلام الى صحة البعث بكونه عليه السلام علامة لها اما بنزوله شرط من اشراطها او بحدوثه بغير اب او باحيائه الموتى و التصريح بمجيئه عليه السلام بالبينات و التوحيد و وعيد المنكرين بعذاب اليوم الاليم و وقوع الساعة بهم بغتة الاخلاء يومئذ الخ اعلم انه تعالى لما قال هل ينظرون الخ ذكر عقبه بعض ما يتعلق باحوال القيامة ان المجرمين في عذاب الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الوعد بالوعيد على الترتيب المستمر في القرآن قل ان كان للرحمن ولد الخ قال المسكين عود الى تقرير التوحيد مع الوعيد للمشركين و تسلية عليه السلام الى اخر السورة.

سورة الدخان

حَمَّ وَالْكَبَّ الْمُبِينِ الخ اعلم ان المقصود منها تعظيم القران من ثلاثة اوجه احدها بيان تعظيم القران بحسب ذاته الثاني بيان تعظيمه بسبب شرف الوقت الذي نزل فيه الثالث بيان تعظيمه بحسب شرف منزله ثم انه تعالى اراد ان يكونوا موقنين بقوله بل هم في شك يلعبون وان اقرارهم غير صادر عن علم و يقين فارتقب يوم تأتي السماء الخ قال المسكين بيان لوعيد المصرين على الكفر ولقد فتنا قبلهم الخ اعلم انه تعالى لما بين ان كفار مكة مصرون على كفرهم بين ان كثيرا من المتقدمين كانوا كذلك فبين حصول هذه الصفة في اكثر قوم فرعون ولقد نجينا الخ اعلم انه تعالى لما بين كيفية اهلاك فرعون و قومه بين كيفية احسانه الى موسى و قومه ان هؤلاء ليقولون الخ رجع الى الحديث الاول و هو كون كفار مكة منكرين للبعث ولما حكى الله عنهم ذلك قال اهم خیرام قوم تبع الخ والمعنى ان كفار مكة لم يذكروا في نفى الحشر والنشر شبهة حتى

يحتاج الى الجواب عنها ولكنهم اصرروا على الجهل فهذا السبب اقتصر الله تعالى على الوعيد فقال ان سائر الكفار كما نوا اقوى من هؤلاء ثم ان الله تعالى اهلكهم فكذلك يهلك هؤلاء ثم انه تعالى ذكر الدليل القاطع على صحة القول بالبعث والقيمة فقال و ما خلقنا السموات الخ ولولم يحصل البعث لكان هذا الخلق لعبا و عبثا ان يوم الفصل الخ اعلم ان المقصود من قوله و ما خلقنا السموات الخ اثبات القول بالبعث والقيمة لاجرم ذكر عقبيه قوله ان يوم الفصل الخ ان المتقين في مقام الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الوعيد في الآيات المتقدمة ذكر الوعد في هذه الآيات ولما بين الله تعالى الدلائل و شرح الوعد والوعيد قال فانما يسرناه بلسانك الخ والمعنى انه وصف القران في اول هذه السورة بكونه كتابا مبينا اي كثير البيان والفائدة وذكر في خاتمتها ما يؤكد ذلك فارتقب الخ قال المسكين هو تسليلة له عليه السلام اي ليس عليك الا البلع لما نزل عليك و امر الانتقام الينا فليس لك الا الانتظار

۱ لما ختم السورة السابقة بتقرير التوحيد بدء هذه بتعظيم القران الدال على النبوة ولا يخفى تعانق التوحيد والنبوة ۱۲ منه عفى عنه

سورة الجاثية

قال المسكين افتتح الله هذه السورة بسرد الآيات التكوينية و شرف الآيات التنزيلية الى قوله فباي حديث بعده الخ ويل لكل افاك الخ اعلم انه تعالى لما بين الآيات للكفار وبين انهم باي حديث بعده يؤمنون اذالم يؤمنوا بهامع ظهورها اتبعه بو عيد عظيم لهم الله الذي سخر الخ قال المسكين عود الى ذكر بعض الآيات التكوينية قل للذين امنوا الخ اعلم انه تعالى لما علم دلائل التوحيد والقدرة والحكمة اتبع ذلك بتعليم الاخلاق الفاضلة والافعال الحميدة قال المسكين لما اصر الكفار على الكفر بعد اقامة الدلائل القاطعة غاظ المؤمنون عليهم فامر الله تعالى بالمغفرة وتوكيل امورهم الى الله تعالى ولقد اتينا بنى اسرائيل الخ اعلم انه تعالى بين انه انعم بنعم كثيرة على بنى اسرائيل مع انه حصل بينهم الاختلاف على سبيل الغي والحسد والمقصود ان يبين ان طريقة قومه كطريقة من تقدم ولما بين تعالى انهم اعرضوا عن الحق لاجل

البغي والحسد امر رسوله صلى الله عليه و سلم بان يعدل عن تلك الطريقة و ان يتمسك بالحق و ان لا يكون له غرض سوى اظهار الحق و تقرير الصدق فقال تعالى ثم جعلناك على شريعة الخ و لما بين الله تعالى هذه البيانات الباقية النافعة قال بهذا بصائر للناس و لما بين الله تعالى الفرق بين الظالمين و بين للمتقين من الوجه الذي تقدم بين الفرق بينهما من وجه اخر فقال ام حسب الذين قوله تعالى و خلق الله السموات الخ اعلم انه تعالى لما افتي بان المؤمن لايساوى الكافر في درجات السعادات اتبعه بالدلالة الظاهرة على صحة هذه الفتوى فقال و خلق الله السموات والارض بالحق و لولم يوجد البعث لما كان ذلك بالحق بل كان بالباطل لانه تعالى لما خلق الظالم وسلطه على المظلوم الضعيف ثم لا ينتقم للمظلوم من الظالم كان ظالما ولو كان ظالما لبطل انه خلق السموات والارض بالحق ثم عاد تعالى الى شرح احوال الكفار و قبائح طرائقهم

ا كان المذكور في اخر الاولي امر التبليغ فذكر في اول هذه الاخرى ما يبلغه من الآيات منه عفى عنه

فقال افرأيت من اتخذ الخ واعلم انه تعالى حكي عنهم بعد ذلك سبهتهم في انكار
القيامة في قوله تعالى وقالوا اما هي الاحياتنا الخ واعلم انه تعالى لما احتج بكونه قادرا
على الاحياء في المرة الاولى وعلى كونه قادرا على الاحياء في المرة الثانية في الايات
المتقدمة عم الدليل فقال والله ملك السموات الخ ولما بين تعالى امكان القول بالحشر
والنشر بهذين الطريقتين ذكر تفاصيل احوال القيامة ولما تم الكلام في هذه المباحث
الشريفة الروحانية ختم السورة بتحميد الله تعالى فقال فله الحمد رب السموات الخ

سورة الاحقاف

خم تنزيل الكتاب الخ اعلم ان نظم اول هذه السورة كنظم اول سورة الجاثية وما خلقنا السموات الخ هذا يدل على اثبات الاله لهذا العالم و يدل على ان القيمة حق قل ارايتم ما تدعون الخ قال المسكين ابطال لمذهب عبدة الاصنام اثرا ثبات التوحيد و اذا تلى عليهم الخ اعلم انه تعالى لما تكلم في تقرير التوحيد و نفى الاضداد والانداد تكلم في النبوة قل ما كنت بدعا من الرسل الخ حكى عنهم نوعا اخر من الشبهات وهو انهم كانوا يقترحون منه معجزات عجيبة قاهرة و يطالبونه بان يخبرهن المغيبات فاجاب الله تعالى عنه و قال الذين كفروا الخ هذه شبهة اخرى للقوم في انكار نبوة محمد صلى الله عليه وسلم و من قبله كتاب موسى الخ قال ابو السعود هولرد قولهم هذا افك قديم و ابطاله بان كونه مصدقا لكتاب موسى مقرر لحقية قطعاً ان الذين قالو الخ اعلم انه تعالى لما قرر دلائل التوحيد والنبوة وذكر شبهات المنكرين و اجاب عنها ذكر بعد ذلك طريقة المحققين و المحققين و اعظم انواع هذا النوع الاحسان الى الوالدين لاجرم اردفه بهذا المعنى فقال تعالى و وصينا الانسان الخ قوله والذي قال لوالديه الخ اعلم انه تعالى لما وصف الولد البار بوالديه في الآية المتقدمة وصف الوالد العاق بوالديه في هذه الآية و ذكر من صفات ذلك الولد انه بلغ في العقوق الى حيث لم ادعاه ابواه الى الدين الحق و هو الاقرار بالبعث والقيامة اصر على الانكار و ابى و استكبر و عول في ذلك الانكار على شبهات خسيصة و كلمات و اهية و لكل درجات الخ عائد الى الفريقين والمعنى و لكل واحد من الفريقين درجات في الايمان والكفر والطاعة والمعصية و يوم يعرض الذين كفروا الخ لما بين الله تعالى انه يوصل حق كل احد اليه بين احوال اهل العقاب و اذكر اخاعاد الخ اعلم انه تعالى لما اورد انواع الدلائل في اثبات التوحيد والنبوة و كان اهل مكة بسبب

١ كان خاتمة الجاثية في اثبات المعاد و فاتحة الاحقاف في اثبات التوحيد و هما متقارنان في القرآن ١٢ منه عطف عنه

استغروا في لذات الدنيا والشعاعلهم بطلها اعرضوا عنها و لم يلتفتوا اليها و لهذا السبب قال تعالى في حقهم اذهبتم طياتكم في الحياة الدنيا فلما كان الامر كذلك بين ان قوم عاد كانوا اكثر اموالا و قوة و جاهها منهم ثم ان الله تعالى سلط العذاب عليهم بسبب شوم كفرهم فذكر هذه القصة ههنا ليعتبر بها اهل مكة و لقد اهلكنا ما حو ما لكم قال المسكين اخذ امن الكبير اشارة الى قصة اقوام اخرى من قويع عاد و ثمود باليمن و الشامرو اذ صرفنا اليك الخ اعلم انه تعالى لما بين ان في الانس من امن و فيهم من كفريين ايضا ان الجن فيهم من امن و فيهم من كفروان مؤمنهم معرض للثواب و كافرهم معرض للعقاب اولم يروا الخ الى ههنا قدتم الالكلام في التوحيد و في النبوة ثم ذكر عقيبهما تقرير مسألة المعاد و من تأمل في هذا البيان علم ان المقصود من كل القران تقرير التوحيد و النبوة و المعاد و اما القصص فالمراد من ذكرها ما يجرى مجرى ضرب الامثال في تقرير هذه الاصول فاصبر كما صبر الخ اعلم انه تعالى لما قرر المطالب الثلاثة و هي التوحيد و النبوة و المعاد و اجاب عن الشبهات اردفه بما يجرى مجرى الواعظ و النصيحة للرسول صلى الله عليه وسلم

سورة محمد صلى الله عليه وسلم

الذين كفروا الخ اول هذه السورة مناسب الأخر السورة المتقدمة فان اخرها قوله تعالى فهل يهلك الخ فان قال قائل كيف يهلك الفاسق وله اعمال سالحة كا طعام الطعام وصلة الارحام وغير ذلك قال تعالى الذين كفروا الخ اى لم يبق لهم عمل ولم يوجد فلم يتمتع الاهلاك والذين امنوا الخ لما بين الله تعالى حال الكفار بين حال المؤمنين ذلك بان الذين كفروا الخ قال المسكين تعليلا للحكمين فاذا القيتم الذين كفروا الخ لما بين ان الذين كفروا اضل الله اعمالهم واعتبار الانسان بالعمل و من لم يكن له عمل فهو همج فان صار مع ذلك يوذى حسن اعدامه فاذا القيتم بعد ظهور ان لا حرمة لهم و بعد ابطال عملهم فاضربوا اعناقهم قال المسكين ثم رغب بقوله ان تنصروا الله ينصركم الخ فى القتال ثم علل اباحة القتال بقوله ذلك بانهم كرهوا الخ ثم ذكر للعبارة عقوبة الكفار السابقين بقوله افلم يسيروا فى الارض الخ لدفع استبعاد مشروع عية عقوبتهم بالقتال ثم علل بقوله ذلك بان الله مولى الذين امنوا الخ كون المؤمنين غالبين و كون الكفار مغلوبين ان الله يدخل الخ لما بين الله تعالى حال المؤمنين والكافرين فى الدنيا بين حالهم فى الآخرة و كاين من قرية الخ لما ضرب الله تعالى لهم مثلاً بقوله افلم يسيروا ضرب للنبي صلى الله عليه وسلم مثلاً تسلية له افمن كان على بينة الخ قال ابو السعود تقرير لتبائن حالى فريق المؤمنين والكافرين و كون الاولين فى اعلى عليين والاخرين فى اسفل سافلين و بيان لعلة مالكل منهما من الحال مثل الجنة التى الخ لما بين الفرق بين الفريقين فى الاهتداء والضلال بين الفرق بينهما فى مرجهما و مالهما و منهم من يستمع الخ لما بين الله تعالى حال الكافر ذكر حال المنافق بانه من الكفار والذين اهتدوا الخ لما بين الله تعالى ان المنافق يستمع ولا ينتفع و يستبعد ولا يستفيد بين ان حال المؤمن المهتدى بخلافه فهل ينظرون الخ قال المسكين و عيد للكفار والمنافقين فاعلم انه لا اله الا هو الخ قال

ابو السعود ای اذا علمت ان مدار السعادة هو التوحيد و الاطاعة و مناط الشقاوة هو الاشراك و العصيان فاثبت على ما انت عليه من العلم بالواحدانية و العمل بموجب و يقول الذين امنوا الخ لمابين الله حال المنافق و الكافر و المهتدى المؤمن عند استماع الآيات العلمية من التوحيد و الحشر و غيرهما بقوله و منهم من يستمع اليك و قوله و الذين اهتدوا زادهم هدى بين حالهم فى الآيات العلمية فان المؤمن كان ينتظر ورودها و يطلب تنزيلها و اذا اخرجته التكليف كان يقول هلا امرت بشيء من العبادة خوفا من ان لا يؤهل لها و المنافق اذا نزلت السورة و الآية و فيها تكليف شق عليه فهل عسى ان قال المسكين اخذ من ابى السعود تفريع على اعراضهم و تقاعد هم عن الجهاد ضعفا فى الدين و حرصا على الدنيا و تقريره ان الجهاد احراز كل خير و صلاح و دفع كل شر و فساد فلما اعرضتم عنه و انتم مأمورون و شانكم الطاعة و القول المعروف فالمتوقع منكم اذا اطلقت اعنتكم و صرتم امرين الافساد و قطع الارحام اولئك الذين لعنهم الخ قال المسكين و عيد للمتصفين بالاوصاف المذكورة ثم امتد ذكر هؤلاء المنافقين الى قوله تعالى نبلوا اخباركم ان الذين كفروا الخ قال المسكين ذم لكفار اهل الكتب اترذم المشركين و المنافقين او عود الى ذم المشركين هما قولان يابها الذين امنوا الخ قال المسكين نهى للمؤمنين عن ان يكونوا امثال هؤلاء المذكورين ان الذين كفروا و صدوا الخ قال المسكين من تنمة حال الكفار فلا تهنوا الخ قال ابو السعود الفاء لترتيب النهى على سبق من الامر بالطاعة انما الحيوية الدنيا الخ قال المسكين ترغيب فى بدل الاموال اثر الترغيب فى بذل النفوس فبين حقارة الدنيا و انه تعالى لا يسألكم جميع اموالكم لتبخلوا و انما يقتصر على نذر يسير منها و تدعون الى انفاقه فان بخلتم فانما تضرون انفسكم ثم ختم سورة ببيان استغناءه تعالى عن الاموال و الانفس بقوله و ان تتولو الخ

سورة الفتح

قال المسكين ذكر الله تعالى فى هذه السورة قصة الحديدية و ماروعى فيها من الحكم و المصالح مع البشارات للمؤمنين و التهديدات للكافرين و المنافقين و هذه خلاصة السورة كلها متعانقة بعضها ببعض و لما كان وجه الارتباط جليا غير خفى لم يحتج الى التفصيل فما ذكرنا من الاجمال كاف لمن يتدبر ادنى تدبر ان شاء الله تعالى و كذا اكثر السور من ههنا الى اخر القرآن فافهم و تفكر و لا تهتم و لا تتحير و العون من الله تعالى

سورة الحجرات

قال المسكين هذه السورة فيها ارشاد للمؤمنين الى مكارم الاخلاق و حسن الادب
والمعاشرة مع الرسول صلى الله عليه وسلم و مع اخوانهم المؤمنين فالنصف الاول في
ادب الرسول والنصف الثاني في ادب الاخوان فتفكر

سورة ق

قال المسكين هذه السورة كلها فيها تقرير مسئلة المعاد و اقامة الدلائل عليها و بيان
ما يتعلق بها فتدبر

سورة الذاريات

قال المسكين هذه السورة ايضا فيها تقرير المعاد و ما يعود اليه حال الكافرين
والمؤمنين ولتهديد المكذبين ذكر بعض القصص و ختم السورة لتوحيد و وعيد
المنكرين له وللحشر و غيره.

سورة الطور

هذه السورة مناسبة للسورة المتقدمة من حيث الافتتاح بالقسم و بيان الحشر و اول
هذه السورة مناسب لآخر ما قبلها لان في آخرها قوله تعالى فويل للذين كفروا وهذه السورة
في اولها فويل يومئذ للمكذبين و في آخر تلك السورة قال فان للذين ظلموا اذنوا باشارة
الى العذاب وقال هنا ان عذاب ربك لواقع قال المسكين ان نصف السورة في بيان الحشر
و نصفها في رفع شبهات الكفار في صدق ما جاء به النبي صلى الله عليه وسلم من النبوة
والمعاد لان رفع شبهات يؤيد وقوع الحشر ثم ختم السورة بالاخبار عن يوم الحشر
حيث قال فذرهم حتى يلاقوا النخ

سورة النجم

قال المسكين هذه السورة لها اجزاء في الجزء الاول و هو من اولها الى قوله لقد
راى من آيات ربه الكبرى اثبات النبوة و في الجزء الثاني الى قوله و هو اعلم بمن اهتدى

بيان التوحيد والاعراض عن اهل الشرك و توكيل امر هو الى الله تعالى و في الجزء الثالث اخر السورة بيان جزاء الاعمال و قيام الساعة فاشتملت السورة الاصول الثلاثة التي هي ام مقاصد القران التوحيد والرسالة والحشر فتبصر

سورة القمر

قال المسكين مقصود السورة الاخيار عن وقوع الساعة و علامتها و ذم المكذبين بها و بعض قصص المكذبين للاعتبار فتدبر

سورة رحمن

اعلم اولان مناسبة هذه السورة لما قبلها بوجهين احدهما ان الله تعالى افتتح السورة المتقدمة بذكر معجزة تدل على العزة والجبروت والهيبة وهو انشقاق القمر فان من يقدر على شق القمر يقدر على هدا الجبال وقد الرجال وافتتح هذه السورة بذكر معجزة تدل على الرحمة والرحموت وهو القران الكريم فانه شفاء القلوب بالصفاء عن الذنوب ثانيهما انه تعالى ذكر في السورة المتقدمة فكيف كان عذابي و نذر غير مرة و ذكر في هذه السورة فباى الاء ربكما تكذبان مرة بعد مرة لما بينا ان تلك السورة سورة اظهار الهيبة وهذه السورة سورة اظهار الرحمة ثم ان اول هذه السورة مناسب لآخر ما قبلها حيث قال في اخر تلك السورة عند ملك مقتدر والاقتدار الاشارة الى الهيبة والعظمة و قال ههنا الرحمن اى عزيز شديد منتقم مقتدر بالنسبة الى الكفار والفجار رحمن منعم غافر للابرار. قال المسكين جزء الله تعالى هذه السورة ثلاثة اجزاء الاول في تعداد النعم الدنيوية الى قوله وله الجوار المنشنت في البحر كالا علام الجزء الثاني في النقم الاخروية للكافر و هي نعم باعتبار التنبيه على ما سيلقونه يوم القيامة للتحذير عما يؤدي الى سوء الحساب والجزء الثالث و هو من قوله و لمن خاف مقام ربه الى اخر السورة في بيان النعم الاخر وية للمؤمنين فطرفا السورة في ذكر النعم ووسطها في بيان النقم ولما كان للاكثر حكم الكل سيما اذا كان ذكر النقم فيه لطف و نعمة ببيان عاقبة ما هم عليه كانت السورة كلها مظهر الحضرة الجمال و من ثم سماها رسول الله صلى الله عليه وسلم عروس القران فتامل ولا تتعطل

سورة الواقعة

اما تعلق هذه السورة بما قبلها فذلك من وجوه احدها ان تلك السورة مشتملة على تعديد النعم على الانسان و مطالبة بالشكرو منعه عن التكذيب كما مر وهذه السورة مشتملة على و كر الجزاء بالخير لمن شكرو بالشكر لمن كذب و كفر ثانيها ان تلك والسورة متضمنة للتبقيات بذكر الألاء في حق العباد و هذه السورة كذلك لذكر الجزاء في حقهم يوم التناد ثالثها ان تلك السورة سورة اظهار الرحمة و هذه السورة سورة اظهار الهيبة على عكس تلك السورة مع ما قبلها و اما تعلق الاول بالآخر ففي اخر تلك السورة اشارة الى الصفات من باب النفى

سورة الحديد

قال المسكين اول هذه السورة فى التوحيد الى قوله و هو عليم بذات الصدور و اوسطها فى ترغيب اعمال الخير الاصلية و الفرعية من الايمان و الانفاق و ما للعاملين من كل صنف من البشارات و الانذار و تحقير الدنيا نعمها و نقمها و تعظيم حال الآخرة ليسهل السعى فى الآخرها فى اثبات مسئلة الرسالة و ذكر بعض الرسل المتقدمين و امهم و هو من قوله و لقد رسلنا الى خاتمه السورة و الله اعلم .

سورة المجادلة

قال المسكين كان مقصود السورة بيان احاطة علمه تعالى باحوال المنافقين فان اكثرها يشتمل عليها و ذكر سماع المجادلة تمهيد له اى لا يخفى على الله تعالى نجوى موافق و لا منافق فتدبر و لا تحير

سورة الحشر

قال المسكين خلاصة السورة ذكر قصة بنى النضير و اخوانهم من المنافقين و ختم السورة بارشاد المؤمنين الى ان لا يكونوا امثالهم للتفاوت بين المطيع و المعاصى بل
 ۱ وجه المناسبة بين السورتين مذكور فى المن بوجه ۱۲ منه عفى عنه

ليتقوا الله الذي هو متصف بصفات الجلال و الجمال

سورة الممتحنة

قال المسكين حاصل السورة النهى عن الاحتلاط مع المشركين بالتزوج والتناكح
فتناسب ما قبلها لان فيه التقاطع عن اهل الكتاب

سورة الصف

قال المسكين كان المذكور في السورة السابقة الامر بمخالفة الكفار و في هذه
الامر بمقاتلتهم والوعد بالثواب عليها

سورة الجمعة

قال المسكين اول السورة في اثبات التوحيد والرسالة والالزام على بعض منكرى
الرسالة و اخرها في النهى عن الانهماك في الدنيا لانه الموجب لاختلاط الكفار و هو
المانع عن المخالفة والمقاتلة والاعراض عن الدنيا هو المكمل لاعتقاد التوحيد و النبوة

سورة المنافقون

وجه تعلق اول هذه السورة بما قبلها هو ان تلك السورة مشتمله على ذكر بعثة الرسول
صلى الله عليه وسلم و ذكر من كان يكذبه قلبا ولسانا بضرب المثل كما قال مثل الذين
حملوا التوراة و هذه السورة على ذكر من كان يكذبه قلبا دون اللسان و يصدقه لسانا
دون القلب و اما الاول بالآخرة فذلك ان في اخر تلك السورة تنبيهها لاهل الايمان
على تعظيم الرسول صلى الله عليه وسلم و رعاية حقه بعد النداء لصلوة الجمعة و تقديم
متابعة في الاداء على غيره و ان ترك التعظيم والمتابعة من شيم المنافقين والمنافقون
هم الكاذبون كما قال في اول هذه السورة قال المسكين و ختم السورة بالنهى للمؤمنين
عن ان يكونوا كالمنافقين في الهاء اموالهم و اولادهم عن ذكر الله والاخلاص له

سورة التغابن

قال المسكين خلاصة السورة التوحيد والرسالة والبعث والتوجه الى الله تعالى بالتوكل والاعراض عما يلهي كآخر ما قبلها

سورة الطلاق

قال المسكين لماذا ذكر فيما قبل من عداوة الازواج ذكرهنا حقوقهن لنلايفرط فيها ثم نبه في الركوع الثاني ان الله تعالى في المعاملات الدنيوية ايضا واجب الامثال لا كزعم بعض الجهلة

سورة التحريم

اما التعلق بما قبلها فذلك لا شتر اكهما في الاحكام المخصصة بالنساء قال المسكين امر الازواج المطهرات ان لا يكن للعامة عداوت البعل اى بعل و ليخفن الطلاق ان فعلم ذلك فنا سبت السورة سورة التغابن والطلاق

سورة الملك

قال المسكين فيها بيان التوحيد والجزاء على التصديق والتكذيب

سورة النون

قال المسكين ملخص السورة في اثبات الرسالة والجزاء على التصديق والتكذيب

سورة الحاقة

قال المسكين خلاصة السورة بيان يوم القيمة و حقيقة القران الجاءى به

سورة المعارج

قال المسكين فيها ذكر الحشر و موجبات الثواب والعذاب

سورة نوح عليه السلام

قال المسكين خلاصة السورة بيان جزاء من يكذب الرسل في ضمن قصة نوح عليه السلام

سورة الجن

قال المسكين خلاصة السورة التنبيه على ان الجن النارين المستكبرين قداموا فما بال البشر الترابيين المستصغرين لا يؤمنون وختم السورة باثبات التوحيد الذي هو اصل الايمان

سورة المزمل

قال المسكين خلاصة السورة تعليم تصفية الباطن بعد اصلاح الظاهر والامر بالابتغال الى الله تعالى والاعراض من المنكرين وتوكيل امرهم الى الله تعالى فانه يجازيهم كيف يشاء فان شغل القلب بغير الله تعالى مما يخل بالذكر و صفاء الجوهر الروحاني

سورة المدثر

قال المسكين ملخص السورة الانذار

سورة القيمة

قال المسكين ملخص السورة اثبات البعث و لعله اتفق للرسول صلى الله عليه وسلم عند نزول هذه الآيات الاستعجال بالقراءة فنهى عند و على قول القفال قوله تعالى لا تحرك الخ

خطاب مع الانسان يوم القيمة وقت قراءة كتاب اعماله فيكون من متعلقات البعث

سورة الدهر

قال المسكين ملخصها اثبات جزاء الاعمال فكانه مناسب لقوله ايحسب الانسان ان يترك سدى لايجزى على الاعمال

سورة المرسلات

قال المسكين خلاصتها بيان ما يقع يوم القيامة وه يتبعها

سورة النبأ

قال المسكين فيها ايضا احوال القيمة

سورة النزع

قال المسكين فيها ايضا اثبات البعث اما وجه المناسبة بين قصة موسى عليه السلام وبين ما قبلها فعلى ما فى الكبير من وجهين الاول انه تعالى حكى عن الكفار اصرارهم على انكار البعث حتى انتهوا فى ذلك الانكار الى حد الاستهزاء فى قولهم تلك اذا كرة خاسرة و كان ذلك يشق على محمد صلى الله عليه و سلم فذكر قصة موسى عليه السلام و بين انه تحمل المشقة الكثيرة فى دعوة فرعون ليكون ذلك كالتسلية للرسول صلى الله عليه وسلم الثانى ان فرعون كان اقوى من كفار قريش واكثر جمعا و

اشد شوكة فلما تمرد على موسى عليه السلام اخذه الله نكال الأخرة والاولى فكذلك هؤلاء المشركون في تمردهم عليكم ان اصروا اخذهم الله تعالى و جعلهم نكالا

سورة عبس

قال المسكين فيها بيان احوال القيمة والامر بتذكير من يتذكر

سورة الانفطار

قال المسكين فيها اثبات البعث و بيان جزاء الاعمال والتقريع على الغفلة

سورة التطفيف

قال المسكين كان فيما قبل بيان حقوق الله تعالى و في هذه بيان حقوق الناس من اموالهم واعراضهم و بيان تعظيم يوم مكافاة الحقوق

سورة الانشقاق

قال المسكين فيها بيان الجزاء الاعمال يوم القيمة

سورة البروج

السورة وردت في تثبيت المؤمنين و تصبيرهم على اذى اهل مكة و تذكيرهم بما جرى على من تقدمهم من التعذيب على الايمان حتى يقتلوا بهم و يصبروا على اذى

قومهم و يعلموا ان كفار مكة عند الله بمنزله اولئك

سورة الطارق

قال المسكين فيها بيان حفظ الاعمال والجزاء بعد البعث و كونه حقا غير هزل

سورة الاعلى

قال المسكين فيها بيان فناء الدنيا و بقاء الاخرة والامر بالتذكير به بالقران و بيان
النعم الباعثة على الاطاعة فتأمل

سورة الغاشية

قال المسكين فيها بيان القيمة والجنة والنار و الآيات الدالة على وجود الصانع
المنجى اعتقاده والمردى عناده

سورة الفجر

قال المسكين فيها ذكر جزاء المكذبين و عدم الاغترار بالدنيا الحاملة على
التكذيب و ايتازيوم الجزاء

سورة البلد

قال المسكين فيها ذم صرف القوى الى الدنيا والامر بصرفها في العقبى

سورة الشمس

المقصود من هذه السورة الترغيب في الطاعات والتحذير من المعاصي قال المسكين لان جواب القسم على ما قال ابو السعود قوله تعالى 'قد افلح الخ

سورة الليل

اقسم تعالى ان اعمال عباده لشتى اى مختلفة في الجزاء ثم بين معنى اختلاف الاعمال فيما قلناه من العاقبة المحمودة والمذمومة والثواب والعقاب

سورة الضحى

قال المسكين فيها بيان النعم على نبيه صلى الله عليه وسلم ليذهب حزنه بالكذب والامر باداء الشكر عليها

سورة الانشراح

قال المسكين فيها ايضاً في الاولى مع الامر بالاجتهاد في العبادة اداءً لشكر النعم

سورة التين

قال المسكين فيها بيان النعم على الانسان و شكر بعضهم عليها و كفر بعضهم بها و بيان جزاء الفريقين

اعلم ان الرازي رحمه الله تعالى اورد في تفسير الكوثر تقرير ابوخذ منه الارتباط بين سورة الضحى الى اخر القرآن المجيد فلنورده بعينه وهو هذا. ان هذه السورة كالتمة لما قبلها من السور و كالاصل لما بعدها من السور اما انها كالتمة لما قبلها من السور فلان الله تعالى جعل سورة والضحى في مدح محمد عليه السلام و تفصيل احواله فذكر في اول السورة ثلاثة اشياء تتعلق بنبوة (اولها) قوله ماودعك ربك و ما قلبي (وثانيها) قوله وللآخرة خير لك من الاولى (وثالثها) ولسوف يعطيك ربك فترضى ثم ختم هذه السورة بذكر ثلاثة احوال من احواله عليه السلام فيما يتعلق بالدنيا و هي قوله الم يجدك يتيماً فاوى و وجدك ضالاً فهدى و وجدك عائلاً فاغنى ثم ذكر في سورة الم نشرح انه شرفه بثلاثة اشياء (اولها) الم نشرح لك صدرك (وثانيها)

سورة العلق

قال المسكين فيها حث على الطاعة والذكر شكر النعم و ذم وردع لمن كفر بها

بطغيانه

سورة القدر

قال المسكين فيها تعظيم القرآن بتعظيم زمانه و هو احد وجوه التعظيم

سورة البينة

قال المسكين فيها تعظيم الرسول و جزاء المصدقين والمطيعين له والمكذبين

والعصاة

سورة الزلزال

انه تعالى لما قال جزاء هم عند ربهم فكان المكلف قال و متى يكون ذلك يا رب

فقال اذا زلزلت الارض قال المسكين ففيها بيان الجزاء و وقته

سورة العاديات

قال المسكين فيها بيان سكون الانسان معترف بالقال او بالحال على نفسه

باستحقاقه للجزاء لاعترافه بكونه كنودا كفوراً فلا تحكم فيه

سورة القارعة

اعلم انه تعالى لما ختم السورة المتقدمة بقوله ان ربهم بهم يومئذ لخبير فكانه قيل

و ما ذلك اليوم فقيل هي القارعة قال المسكين في هذه السورة قانون الجزاء

سورة التكاثر

قال المسكين فيها بيان ذم الغفلة عن الآخرة

سورة العصر

قال المسكين فيها بيان اسباب الخسران والربح في الآخرة

سورة الهمزة

قال المسكين فيها بيان خصال العذاب

سورة الفيل

قال المسكين هذه السورة كالدليل على ان الهمزة اللزمة الطاعن في النبي صلى الله عليه وسلم مستحق للعذاب فان الذي عذب من اهان بيته كيف يترك من اهان نبيه وهذا ماخوذ من الكبير

سورة قريش

قال المسكين فيها بيان النعمة العظيمة على قريش حيث جعلهم اهل بيت عظيم اهلك الله تعالى من اهانهم والقى حرمة في قلوب الناس

سورة الماعون

قال المسكين فيها ذم خصال الكفار والمنافقين

سورة الكوثر

قال المسكين فيها تنويه لسان الرسول صلى الله عليه وسلم و تفضيح لعدوه

سورة الكافرون

قال المسكين فيها النبذ على السواء في الدين لقطع الطمع عن التوافق فيه

سورة النصر و ابي لهب

اعلم انه تعالى قال وما خلقت الجن و الانس الا ليعبدون ثم بين في سورة قل يا ايها الكافرون ان محمدا صلى الله عليه وسلم اطاع ربه و صرح بنفى عبادة الشركاء و الاضداد و ان الكافر عصى ربه و اشتغل بعبادة الاضداد و الانداد فكانه قيل ما ثواب المطيع و ما عقاب العاصي فقال ثواب المطيع حصول النصر و الفتح و استعلاء في الدنيا و الثواب الجليل في العقبى كما دل عليه سورة اذا جاء نصر الله و اما عقاب العاصي فهو الخسار في الدنيا و العقاب العظيم في العقبى كما دلت عليه سورة تبت

سورة اخلاص

قال المسكين فيها بيان التوحيد و هو اصل الدين

سورة الفلق

قال المسكين فيها الامر بالتوكل في الحسيات

سورة الناس

قال المسكين فيها الامر بالتوكل في العقليات و التوكل هو اصل الاعمال و مدارها ف سبحانه ما اعظم شأنه كيف ختم كتابه بذكر الاصول العظيمة لان الدين كله هو الاعتقاد و العمل لا غير و الاعمال يتوقف صدورها على سلامة البدن و سلامة النفس فوجب التوكل على الله تعالى في حفظهما عن الشرور و البوائق فجمع الله تعالى العقائد الصحيحة الحققة كلها في سورة الاخلاص و امر بالتوكل في سلامة البدن في سورة الفلق

و فی سلامة النفس فی سورة الناس و بما ذکر تم امر الدین و الحمد لله رب العالمین ربنا
 اتمم لنا نورنا و اغفر لنا انک علی کل شیء قدير و بالآجابه جدير و صلی الله علی سیدنا
 محمد المبعوث بجوامع الکلم و منابع الحکم و علی جمیع الانبیاء و الرسل و الهم و
 صحبهم سراج السبیل ابدالابدین و دهر الداهرین

خاتمه

قدم الكتاب و الحمد لله الوهاب علی یهذا التراب فی نحو مدة شهرین و اسبوعین
 و قد فرغ منه فی یوم الخمیس ثالث عشر من شهر ربیع الآخر ۱۳۱۶ھ من الهجرة فی کورة
 تهانه بهون من مضافات مظفر نگر لازالت مصنونة من الفتن و ما موته من الشر و مقرنة
 بالخير و الظفر بحرمة سید البشر صلی الله علیه و علی آله و صحبه و سلم ما سارت
 الشمس و القمر .

حق تعالیٰ کی توفیق سے اشرف التفاسیر کی چوتھی اور آخری جلد بمطابق جمادی الاول ۱۴۲۰ھ ستمبر ۱۹۹۹ء
 مکمل ہوئی۔

اللهم لك الحمد كما ينبغي لجلال و جہك

عام فہم اردو تفسیر

اولاد الیاس

فی کشف اسرار القرآن

ستلیس اور عام فہم زبان میں اردو کی سب سے پہلی مفصل اور جامع تفسیر، تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالحدیث کا خصوصی اہتمام، دلنشین انداز میں احکام و مسائل اور مواضع و نصائح کی تشریح، اسباب نزول کا مفصل بیان، تفسیر و حدیث اور کتب فقہ کے حوالوں کیساتھ

محقق العصر
حضرت مولانا مفتی محمد عاشق الہی مہاجر مدنی

کامل 9 جلد

ادارۃ الیفا شریفیہ

چوک نوارہ ملتان، پاکستان فون: 540513

علوم قرآن کے شائقین کیلئے خوشخبری بیک وقت چھ تفاسیر کا مطالعہ

مصروفیت کے اس دور میں ضخیم تفاسیر کا مطالعہ بہت مشکل ہو گیا ہے اس لئے اکابر علمائے کرام اور مفتیان عظام کی آراء اور مشوروں کی راہنمائی کے تحت چھ مستند تفاسیر کے مضامین کا انتہائی معنی خیز منتخب عوام الناس اور علمائے کرام کی سہولت کیلئے یہ مجموعہ مدینہ منورہ کی مبارک فضاؤں میں ترتیب دیا گیا ہے

کامل کے جلد

گلدستہ تفاسیر

جدید
کمپیوٹر
کتابت

مع تفسیری افادات

حضرت شیخ احمد مجتہد دالقب ثانی رحمۃ اللہ علیہ
مجتہد المدینہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ
حضرت علامہ لڑماتش الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ
آخر میں 1400 سالہ مفسرین کی تاریخ

مرتب حضرت الحاج عبدالقیوم مہاجر مدنی مدظلہ العالی

اول مکمل تفسیر عثمانی * تفسیر مظہری * تفسیر عزیزی
تفسیر ابن کثیر معارف مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ * معارف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

اس تفسیر کے متعلق علماء کی آراء

- حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب مدظلہ العالی: اس کاوش سے علماء طلباء اور عوام الناس کو بے حد نفع ہوگا
- حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ: فہم قرآن کے شائقین کیلئے قرآنی علوم کا گلدستہ
- حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی: دور حاضر کی چھ شاہکار تفسیروں کا حاصل ”گلدستہ تفاسیر“
- حضرت مولانا محمد موسیٰ کرما ڈی مدظلہ العالی: یہ تفسیر عوام و خواص کیلئے نہایت مفید ہے
- حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہ العالی: یہ تفسیر اکابر کی تفاسیر کا نچوڑ ہے اور اس میں مسلک حق کی پوری پوری ترجمانی ہے

تقریباً 5000 صفحات پر مشتمل، بہترین سفید کاغذ غیر ملکی اشائل کی 7 جلدوں میں قیمت -/1995 روپے
محدود مدت کیلئے رعایتی قیمت صرف -/1100 روپے صرف فون کر کے بھی آپ دی پی منگوا سکتے ہیں ڈاک خرچہ -/100 روپے

ادارۃ تالیفات شرفیہ
چوک فوارہ ملتان
فون: 540513-519240
ہر قسم کے قرآن مجید، تفاسیر اور اسلامی کتب کیلئے

پاکستان میں پہلی بار جدید کمپیوٹر کتابت کے ساتھ بڑے سائز میں

تفسیر بیان القرآن

کامل ۳ جلد

۱۴۳۴ھ

رَفَعُ الشُّكُوكَ لِدُرِّبْرِثِ مَسَائِلِ السُّلُوكِ مِنْ كَلَامِ مَلِكِ الْمُلُوكِ
وَجُوهُ الْمَثَانِي مَعَ تَوْجِيهِ الْكَلِمَاتِ وَالْمَعَانِي (عربی)

حضرت حکیم الامت تہذیب الملّت جامع الکملات مشیح المسنات ماہر العلوم القرآنیۃ واقف الاسرار القرآنیۃ،
راس الفسّرین مقدم الراسخین صاحب الشریعۃ والطریقۃ، بحر العرفۃ والیقین کاشف الاسرار الخفی منہا والہادی الی المعنی بہ

مولانا محمد اشرف علی التھانوی
نور اللہ مرقدہ وجعل الجنة مثواه

تعارف و تقدیم فقہ العصر حضرت مولانا مفتی

عبد الشکور ترمذی

تفسیر بیان القرآن اور اس کے متعلقہ تمام رسائل کی جدید اشاعت کے لئے کمپوزنگ و ترتیب اس
قدیم نسخہ کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ جو خود حضرت حکیم الامت قدس سیرۃ کا نظر فرمودہ ہے اور اس
پر حضرت کی تصدیق اور دستخط ہیں نیز حضرت مولانا بشیر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی دستخط موجود ہیں
یہ نسخہ ۱۳۵۳ھ میں مطبع اشرف المطابع تھانہ بمبوں سے شائع ہوا تھا۔

ادارہ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان 061-540513-519240
E-mail: ishaq90@hotmail.com/Website: www.taleefat-e-ashrafia.co